انار کے سائے

طارق علی

فرنٹیئر پوسٹ پبلیکیشنز لاہور

طارق علی سپین کی تہذیب کے زوال کو بیان کر کے ہمیں یہ دعوت دیتا ہے کہ ہم اس کو سامنے رکھ کر موجودہ حالات کا تجزیہ کریں۔

(دی نیشن' لاہور۔ اسلام آباد)

ناشریہ

اس کتاب کے پیش لفظ میں طارق علی نے سپین میں مسلمانوں کے اقتدار کی آخری گھڑیوں کی منظر کشی کرتے ہوئے لکھا ہے:

"--- سربراہ کلیسا کی کھڑکی کے نیچے جو سپاہی تعینات تھا' ز منس نے اسے گھورتے ہوئے اشارہ کیا' یہ اشارہ مشعل برداروں تک پہنچا اور آگ بھڑک اٹھی' آدھے ثانیہ تک خاموشی رہی' پھر دسمبر کی رات میں زبردست چیخ گونجی اور تب آوازیں ابھریں

لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ

سیزوس سے کچھ فاصلے پر ایک گروہ ورد کر رہا تھا لیکن الفاظ اس تک نہیں پہنچ رہے تھے' بات یہ نہ تھی کہ وہ انہیں سمجھ بھی لیتا کیونکہ یہ عربی میں تھے' شعلے بلند سے بلند تر ہو رہے تھے' آسمان دہکتا ہوا جہنم لگتا تھا' اڑتی ہوئی چنگاریوں کا مرقع جو خوبصورت خطاطی کے جلنے سے پیدا ہو رہا تھا' لگتا تھا ستارے رو رہے ہیں' آہستہ آہستہ مجمع چھٹنا شروع ہوا' ایک کوچہ گرد نے اپنے کپڑے اتارے اور آگ کی جانب بڑھا

'علمی کتابوں کے بغیر زندگی کا کیا مطلب'

آگ میں کودتے ہوئے وہ چلّایا---"

سپین میں اسلامی اقتدار کے خاتمہ کے ساتھ ہی مسلمانوں کی علمی میراث سے عیسائی حکمرانوں نے جو سلوک کیا وہ علم و آگہی کے قتلِ عام کی دل دوز داستان ہے' مسلمانوں کے دورِ آخر میں یہاں بنو نصر کے ساتویں حکمران یوسف ابو الحجاج (۱۳۳۳-۱۳۵۴) نے غرناطہ یونیورسٹی کی بنیاد رکھی' یہ قریۂ علم اپنی ستر لائبریریوں' سترہ اعلیٰ اور دو سو ابتدائی مدارس کیلئے چہار دانگِ عالم میں معروف تھا' جب علوم و فنون کے بے پایاں سمندروں میں مسلمان غوّاصی کر رہے تھے یورپ کے سارے شہروں' گلیوں اور بازاروں میں جہالت اور کم علمی کے گہرے سائے پھیلے ہوئے تھے مگر سپین کے صرف ایک شہر' قرطبہ میں ستر لائبریریاں تھیں' اس اقلیمِ بے مثال میں سایہ دار پختہ گلیاں اور بازار' روشنی سے جگمگ کرتے' شہر زندگی کی ہماہمی سے معمور تھے' اس کے سات سو برس بعد تک لندن کی کسی گلی میں روشنی کا کوئی انتظام نہ تھا اور کئی صدیوں بعد تک پیرس میں کچی گلیاں تعفّن اور سڑاند کا نمونہ بنی ہوئی تھیں۔

صاعد کا کہنا ہے کہ مسلمانوں کی آمد سے پہلے اندلس علم سے تہی تھا اور اس دور کے کسی عالم کا تذکرہ کتابوں میں موجود نہیں مگر مسلمانوں کے زیرِ نگیں آتے ہی علوم و فنون کے فروغ کا وہ سلسلہ شروع ہوا جو بعد ازاں یورپ میں احیائے علوم کی بنیاد ثابت ہوا۔ عبدالرحمٰن الناصر کا جانشین حکم ثانی (۹۶۱-۹۷۶) اندلس ہی نہیں عالم اسلام کے بڑے علما میں سے ایک تھا۔ حکم ثانی اور اس کے

بھائی نے اپنے والد کی زندگی میں ہی اپنی الگ الگ لائبریریاں قائم کی ہوئی تھیں جو بعد میں شاہی لائبریری کا حصہ بنیں اور حکم ثانی نے اس میں ہزاروں نئی کتابیں شامل کیں۔ اس کے کارندے دنیائے اسلام کے اطراف و اکناف میں گھوم پھر کر مخطوطات اور ان کی نقلیں حاصل کرتے' قرطبہ ہی کے ایک اہلِ قلم اور قاموس نگار محمد بن ابی الحسین فہری اور محمد بن معمر نادر کتب کی نقلیں تیار کرنے پر مامور تھے' یوسف البلوطی' ابو الفضل بن ہارون' ظفر بغدادی' عباس بن عمرو اور کئی دوسرے اہل دانش بھی کتابوں کی نقول تیار کرتے تھے' بغداد کے ابن یعقوب الکندی' محمد بن طرحان اور مصر کے ابن سابان حکم ثانی کی شاہی لائبریری کیلئے دور و نزدیک سے کتابیں حاصل کرتے' مقری کا کہنا ہے کہ عراق میں ابو الفرج اصبہانی (۸۹۷-۹۶۷) جن دنوں اپنی کتاب الاغانی تحریر کرنے میں مصروف تھا کہ حکم کو اس کی خبر ہوئی جس پر اس نے کتاب کا پہلا نسخہ حاصل کرنے کی غرض سے اس کے پاس ایک ہزار درہم بھیجے' مصر کے شاہی کتب خانے میں العزیز (متوفی ۹۹۶) کے دور میں اندازاً دو لاکھ کتابیں تھیں' بغداد کا سرکاری کتب خانہ بھی عظیم الشان تھا۔ المستنصر مکتب کی لائبریری میں ۱۲۳۲ء کے لگ بھگ اسی ہزار کتابیں تھیں۔ چار سو سال بعد فرانس کے بادشاہ چارلس نے جو لائبریری بنائی وہ اس میں صرف نو سو کتابیں جمع کر سکا جو زیادہ تر مذہبی تھیں مگر الحکم کی لائبریری میں چار لاکھ سے زیادہ کتابیں پڑی تھیں جن کی فہرست چوالیس جلدوں پر مشتمل تھی جب اس لائبریری میں مزید کتابیں رکھنے کی جگہ نہ رہی تو اسے دوسری جگہ منتقل کرنا پڑا اور اس کام میں چھ ماہ لگ گئے۔

حکم ثانی کے دور میں قرطبہ ان خواتین کے حوالہ سے بھی معروف تھا جو کتابوں کی نقلیں تیار کر کے وراقین کے ہاں فروخت کرتیں' مراکشی کا کہنا ہے کہ شہر کے صرف مشرقی حصوں میں ایسی ایک سو ستر عورتیں رہائش پذیر تھیں جن کے خط کوفی میں لکھے ہوئے قرآن حکیم کے نسخوں کی بڑی مانگ تھی۔ یہاں مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں نے بھی ذاتی لائبریریاں قائم کر رکھی تھیں۔ ابن نطیس کا خاندان جب لائبریری بیچنے پر مجبور ہوا تو اس کے عوض اسے چالیس ہزار درہم حاصل ہوئے' عورتوں کی لائبریریوں میں خدیجہ بن جعفر تمیمی' عائشہ بنت احمد بن تادم اور راضیہ نجم کی ذاتی لائبریریوں کا بڑا شہرہ تھا۔

ابن رشد کا کہنا ہے کہ جب اشبیلیہ میں کوئی عالم انتقال کر جاتا تو اس کی کتابیں فروخت کی غرض سے قرطبہ کی منڈی میں لائی جاتیں اور جب قرطبہ میں کوئی مغنی فوت ہوتا تو اس کے چنگ و رباب اشبیلیہ کے بازاروں میں فروخت کئے جاتے تھے۔

'انار کے سائے' اس قریۂ بے مثال کے زندہ کرداروں کی داستان ہے جسے فرنٹیئر پوسٹ پبلیکیشنز شائع کرتے ہوئے خوشی محسوس کر رہا ہے۔

رحمت شاہ آفریدی

پیش لفظ

پانچ عیسائی نائٹ اس بات پر ناخوش تھے کہ ز یمنس سیزوس نے انہیں آدھی رات کے وقت طلب کیا تھا۔ وجہ یہ نہیں تھی کہ یہ گذشتہ کئی برسوں میں سرد ترین رات تھی۔ وہ نئی فتح کے مردان میدان تھے۔ ان کی کمان میں فوجیں غرناطہ میں فاتحانہ انداز سے داخل ہوئی تھیں اور آج سے سات برس پہلے انہوں نے فرڈ ینڈ اور ازابیلا کے نام پر شہر کو قبضہ میں لیا تھا۔

ان پانچوں میں سے کوئی اس علاقہ کا نہیں تھا۔ ان میں سے معمر ترین شخص ٹولیڈو کے ایک راہب کا حقیقی بیٹا تھا۔ دوسرے کاسٹیل کے رہنے والے تھے اور اپنے گاؤں واپس جانے کیلئے بیقرار تھے۔ وہ سب اچھے کیتھولک تھے۔ لیکن وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کی وفاداری کو ویسے ہی فرض کر لیا جائے۔ ملکہ کے سرکاری محتسب پر وہ اپنی وفاداری کی اہمیت واضح کرنا چاہتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ کس طرح اس نے ٹولیڈو سے مفتوح شہر کے بشپ کی حیثیت سے اپنا تبادلہ کروایا تھا۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی کہ سیزوس ملکہ ازابیلا کا آلہ کار تھا۔ اسے ایسے اختیارات حاصل تھے جو محض روحانی نوعیت کے نہیں تھے۔ نائٹس کو پوری طرح علم تھا کہ اس کی حکم عدولی دربار کی نظر میں پسندیدہ نہیں ہو گی۔

پانچوں منصب داروں کو' جنہوں نے چوغے پہن رکھے تھے لیکن پھر بھی سردی سے کانپ رہے تھے' سیزوس کی خواب گاہ میں پہنچایا گیا۔ اس کے سادہ رہن سہن پر وہ بہت حیران ہوئے۔ انہوں نے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ اس کی کوئی مثال نہیں ملتی کہ چرچ کا ایک شہزادہ کسی تنگ نظر راہب کے حجرہ میں رہائش اختیار کرے۔ انہیں کبھی یہ تجربہ نہیں ہوا تھا کہ ایک سربراہ کلیسا جس طرح کی تبلیغ کرے خود بھی ایسی

ہی زندگی گزارے۔ زمنس نے آنکھ اٹھا کر ان کی طرف دیکھا اور مسکرایا۔ اس نے انہیں جو ہدایات دیں ان کا لہجہ تحکمانہ نہیں تھا۔ نائٹس حیران تھے۔ ٹولیڈو کے باسی نے اپنے ساتھیوں سے ذرا اونچی آواز میں سرگوشی کی۔

"ازابیلا نے کبوتروں کی رکھوالی بلی کے سپرد کر دی ہے۔"

سیزوس نے مناسب جانا کہ اس گستاخی کو نظرانداز کر دے۔ بلکہ اس نے اپنی آواز ذرا بلند کی۔

"میں واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ہم کوئی ذاتی انتقام نہیں چاہتے۔ میں حکومت اور کلیسا دونوں اختیارات کے تحت بات کر رہا ہوں۔"

یہ بات اتنی بھی صحیح نہیں تھی لیکن سپاہی عام طور پر ارباب اختیار کے سامنے زبان نہیں کھولتے۔ جب اسے اطمینان ہو گیا کہ اس کی ہدایت ان تک پہنچ گئی ہے تو آرچ بشپ نے انہیں رخصت کر دیا۔ وہ ان پر یہ واضح کرنا چاہتا تھا کہ اقتدار جبہ و دستار کے طابع ہے۔ ایک ہفتہ بعد دسمبر 1499ء کی پہلی تاریخ کو عیسائی سپاہی ان پانچ کمانڈروں کے ماتحت شہر کی 195 لائبریریوں اور ان درجن بھر محلوں میں داخل ہوئے جو ذاتی کتب خانوں کے لئے مشہور تھے۔ عربی میں لکھی ہوئی ہر چیز ضبط کر لی گئی۔

ایک روز پہلے کلیسا کی ملازمت میں موجود علماء نے سیزوس کو اس بات پر قائل کر لیا تھا کہ وہ تین سو دستاویزات کو اپنے حکم سے مستثنیٰ کر دے۔ وہ مان گیا تھا۔ بشرطیکہ انہیں القلعہ کی اس نئی لائبریری میں رکھ دیا جائے جو وہ قائم کر رہا تھا۔ ان میں اکثریت عربی میں لکھی ہوئی' طب اور فلکیات کی کتابوں کی تھی۔ زمانہ قدیم سے ان علوم میں جو ترقی ہوئی تھی یہ ان کی مظہر تھیں۔ یہ وہ زبردست خزانہ تھا جو اندلس اور سسلی سے ہوتا ہوا تمام یورپ میں پھیلا تھا اور جس نے احیاء علوم کے لئے راہ ہموار کی تھی۔

قرآن مجید کے ہزاروں نسخے' ان کی تفاسیر اور ان کی خوبیوں اور خامیوں پر دینی اور فلسفیانہ نقطۂ نظر سے تنقید ان کتب میں شامل تھی جنہیں نہایت خوبصورت خطاطی میں تحریر کیا گیا تھا۔ فوجی سب کچھ اٹھا کر لے گئے۔ وہ نادر مخطوطے جن پر اندلس کی دینی عمارت تعمیر کی گئی تھی انہیں بے ڈھنگی پوٹلیوں میں باندھ کر فوجیوں کی پیٹھ پر لاد دیا گیا۔

تمام دن سپاہی لاکھوں کتابوں کی فصیلیں کھڑی کرتے رہے۔ پورے جزیرہ نما کی تمامتر علمیت ریشم کے پرانے بازار باب الرملا کے تہ خانہ میں پڑی ہوئی تھی۔

یہ وہ قدیم جگہ تھی جہاں مور سردار شہ سواری کرتے اور اپنی محبوباؤں کی توجہ حاصل

کرنے کیلئے نیزہ بازی اور شمشیر زنی کے مظاہرے کرتے۔ جہاں لوگ بڑی تعداد میں جمع ہوتے۔ بچے اپنے باپوں' چچاؤں اور بھائیوں کے کندھوں پر چڑھے ہوتے اور اپنے اپنے پسندیدہ لوگوں کو داد دیتے اور جہاں سلطان کے سپاہیوں پر فقرے کسے جاتے اور ان کی وردیوں کا مذاق اڑایا جاتا۔ اگر یہ پتہ لگ جاتا کہ کسی سورما نے سلطان کا لحاظ کرتے ہوئے یا پیسوں کی خاطر کسی درباری کو جتوا دیا ہے تو غرناطہ کے لوگ چلا چلا کر اس پر فقرے کستے۔ اس شہر کے سپاہی اپنی آزادی رائے کے اظہار کیلئے مشہور تھے۔ ان کی زبان کی کاٹ بہت تیز تھی اور وہ کسی کی برتری کو مشکل سے ہی تسلیم کرتے تھے۔ یہی وہ شہر تھا اور یہی وہ جگہ تھی جسے اس رات سیزوس نے اس آتشبازی کیلئے منتخب کیا تھا۔

بڑے سلیقہ سے جلد کی ہوئی اور مصور کتابیں جزیرہ نمائے عرب کے فن کا شاہکار تھیں' جس کے مقابلہ میں دنیائے عیسائیت کی خانقاہیں ہیچ تھیں۔ ان میں محفوظ علم کے خزانوں کو یورپ کے علماء رشک کی نظر سے دیکھتے تھے۔ شہر کے لوگوں کے سامنے کیا شاندار انبار لگا ہوا تھا۔

وہ سپاہی جو سویرے سے ہی کتابوں کی دیواریں اٹھا رہے تھے۔ اہل غرناطہ سے آنکھیں چراتے تھے۔ دیکھنے والوں میں کچھ افسردہ تھے۔ کچھ غصہ سے بھرے ہوئے تھے۔ ان کی آنکھوں سے انگارے نکل رہے تھے اور چہروں پر بغاوت کے آثار تھے اور کچھ ایسے بھی تھے جن کے جسموں میں ہلکی سی جنبش تھی۔ ان کے چہروں پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ ان میں سے ایک بوڑھا شخص اس مصیبت کے وقت صرف ایک فقرہ بار بار دہرا رہا تھا۔

"ہم بیچارگی کے سمندر میں ڈوب رہے ہیں۔"

کچھ سپاہی' جو غالباً پڑھے لکھے نہیں تھے اس ظلم کی شدت کو سمجھ رہے تھے جسے وہ ڈھا رہے تھے۔ وہ اپنے عمل سے پشیمان تھے۔ کسانوں کی اولاد (یہ سپاہی) ان کہانیوں کو یاد کر رہے تھے جو انہوں نے اپنی نانیوں' دادیوں سے سنی تھیں' جن میں وہ اپنی تہذیب اور علمیت کا مقابلہ عربوں کے مظالم سے کرتے تھے۔

ایسے سپاہی زیادہ نہیں تھے پھر بھی کافی تعداد میں تھے۔ تنگ گلیوں میں سے گزرتے ہوئے وہ جان بوجھ کر کچھ کتابیں مقفل دروازوں کے آگے ڈال دیتے تھے۔ انہیں کتابوں کی اہمیت کا کوئی اندازہ تو نہیں تھا لیکن ان کا خیال تھا کہ کتاب جتنی وزنی ہو گی اتنی ہی اہم ہو گی۔ یہ مفروضہ غلط تھا لیکن ان کی نیت صاف تھی اور ان کا عمل لائق تحسین تھا۔ جیسے ہی سپاہی نظروں سے اوجھل ہوتے ایک دروازہ کھلتا اور عبا میں ملبوس ایک جسم اچھل کر

سامنے آتا۔ کتابیں اٹھاتا اور فوراً ہی قفل اور دروازوں کی نسبتاً محفوظ دنیا میں لوٹ جاتا۔ اس طرح' چند سپاہیوں کی فطری شرافت کے سبب کئی سو اہم نسخے تباہ ہونے سے بچ گئے۔ بعد میں انہیں فیض کی نجی لائبریریوں میں پہنچا دیا گیا اور یوں وہ محفوظ ہو گئے۔

چوک میں اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ گھبرائے ہوئے شہریوں کا ایک ہجوم' جن میں زیادہ تر مرد تھے سپاہیوں کے قریب جمع ہو گیا۔ مسلمان زعماء اور عمامہ پوش واعظ دکانداروں' تاجروں' کسانوں' کاریگروں' تھڑے والوں اور دلالوں' طوائفوں اور مجنونوں میں گھل مل گئے۔ ایک طرح سے پوری انسانیت یہاں جمع تھی۔

ایک رہائشی گھر کی کھڑکی کے پیچھے روم کے کلیسا کا سب سے ممتاز سنتری کتابوں کے بڑھتے ہوئے انبار کو بہت مطمئن ہو کر دیکھ رہا تھا۔ زیمنس سیزوس کا ہمیشہ سے یہ یقین تھا کہ کافروں کی قوت کو صرف اس طرح ختم کیا جا سکتا ہے کہ ان کی تہذیب کو یکسر مٹا دیا جائے۔ اس کا مطلب تھا کہ باقاعدہ منصوبہ بندی سے ان کی کتب کو نذر آتش کر دیا جائے۔ حافظہ کچھ عرصہ تک فعال رہے گا اس وقت تک جب تک کلیسائی عدالتیں مجرموں کی زبانیں کاٹ نہ دیں گی۔ اگر وہ نہیں تو کسی اور کو یہ الاؤ روشن کرنا تھا۔ کسی ایسے شخص کو جو یہ بات سمجھتا ہو کہ مستقبل کو صرف سخت گیری اور انتظامی منصوبہ بندیوں سے محفوظ کیا جا سکتا ہے' محبت اور تعلیم سے نہیں جیسا کہ احمق ڈومینیکن چلاتے رہتے تھے انہیں کبھی کچھ حاصل بھی ہوا تھا؟

زیمنس بہت خوش تھا۔ اسے خدا کے اس کام کیلئے آلہ کار چنا گیا تھا۔ دوسرے بھی یہ کام کر سکتے تھے لیکن اس عمدگی کے ساتھ نہیں۔ اس کے ہونٹوں پر ایک حقارت آمیز مسکراہٹ ابھری۔ ایسے پادریوں سے کیا توقع کی جا سکتی تھی جن کے چند صدیوں پہلے تک محمدؐ' عمرؓ' عثمانؓ وغیرہ نام ہوتے تھے۔ زیمنس کو فخر تھا کہ وہ ان چیزوں سے پاک تھا۔ بچپن میں جو اسے طعنے سننے پڑے تھے وہ سب غلط تھے۔ اس کے اسلاف میں کوئی یہودی نہیں تھا۔ اس کے خون میں کوئی ملاوٹ نہیں تھی۔

سربراہ کلیسا کی کھڑکی کے نیچے ایک سپاہی تعینات کیا گیا تھا۔ زیمنس نے اس کو گھورا اور کچھ اشارہ کیا۔ یہ اشارہ مشعل برداروں تک پہنچا اور آگ بھڑک اٹھی۔ آدھے ثانیہ تک خاموشی رہی۔ پھر دسمبر کی رات میں ایک زبردست چیخ گونجی اور پھر یہ آوازیں آئیں۔

لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ

سیزوس سے کچھ فاصلہ پر ایک گروہ ورد کر رہا تھا لیکن الفاظ اس تک نہیں پہنچ رہے

تھے۔ یہ بات نہیں تھی کہ وہ انہیں سمجھ بھی لیتا اس لئے کہ یہ عربی میں تھے۔ شعلے بلند سے بلند تر ہوتے جا رہے تھے۔ آسمان دہکتا ہوا جہنم نظر آ رہا تھا۔ اڑتی ہوئی چنگاریوں کا مرقع جو خوبصورت خطاطی کے جلنے سے پیدا ہو رہا تھا' لگتا تھا کہ ستارے آنسو بہا رہے ہیں۔

آہستہ آہستہ' بدحواس مجمع چھٹنا شروع ہو گیا۔ ایک فقیر نے اپنے کپڑے اتار دیئے اور آگ کی طرف بڑھنے لگا۔ "علمی کتابوں کے بغیر زندگی کا کیا مطلب؟" آگ میں چلتے ہوئے وہ چلایا۔ "انہیں خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ جو آج کیا ہے۔ اس کی انہیں سزا ملے گی۔"

وہ بے ہوش ہو گیا۔ شعلوں نے اسے گھیر لیا۔ آنسو آہستہ آہستہ خاموشی سے نفرت سے بہتے رہے لیکن اس روز کی بھڑکتی ہوئی آگ کو آنسو ٹھنڈا نہ کر سکے۔ لوگ منتشر ہو گئے۔

چوک خاموش ہے۔ ادھر ادھر بجھتی آگ ابھی سسک رہی ہے۔ زیمنس راکھ میں گھوم رہا ہے کسی دوسرے منصوبہ کے خیال سے اس کے ہونٹوں پر ایک مکروہ مسکراہٹ ہے۔ وہ اونچی آواز میں سوچ رہا ہے۔

"اپنے دکھ میں وہ جس طرح کے انتقام کا منصوبہ بنا رہے ہوں وہ سب بیکار ہے۔
ہماری جیت ہو چکی ہے۔ آج ہماری اصل فتح کا دن ہے۔"

جزیرہ نما میں ہر شخص سے زیادہ ازابیلا کی قہر آلود صورت سے بھی زیادہ' زیمنس سمجھتا ہے کہ عقائد میں کتنی طاقت ہوتی ہے وہ جلے ہوئے مسودوں پر ایک لات مارتا ہے۔ ایک المیہ کی چنگاریوں پر دوسرے المیہ کا سایہ لہراتا ہے۔

بنو حزیل 1499ء میں

حسن الحزیل کے قبیلہ نے 932ء / 237 ہجری میں دمشق کو چھوڑا اور اسی برس اسلام کی آخری مغربی چوکی پر پہنچ گئے۔ انہوں نے غرناطہ میں سکونت اختیار کی اور اگلے برس اس گاؤں کی تعمیر شروع کر دی جس کا نام انہوں نے اپنے قبیلہ پر رکھا۔ تین سال بعد ان ہی سنگتراشوں نے ان کے محل کو تعمیر کیا جنہوں نے قرطبہ کے نزدیک مدینتہ الزہرہ کی تعمیر کی تھی۔

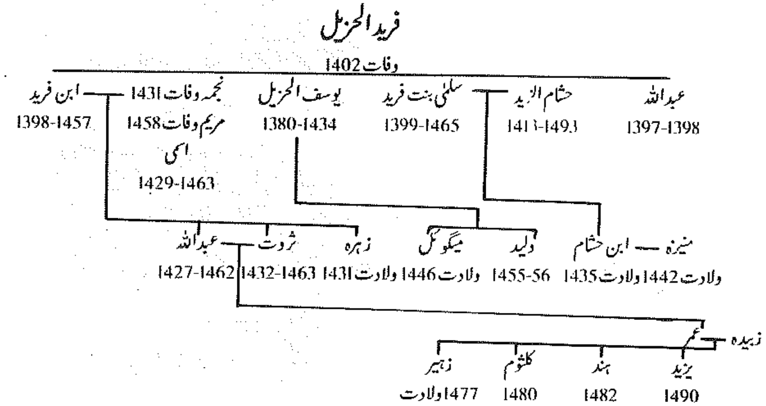

مصنف کے قلم سے

عرب ہسپانیہ میں، جیسے کہ آج بھی دنیائے عرب میں، بچوں کا ایک اپنا نام رکھا جاتا تھا اور پھر ان کے باپ یا ماں کے نام سے اس کو منسلک کر دیا جاتا تھا۔ اس کہانی میں زہیر بن عمر، عمر کا بیٹا زہیر ہے۔ اسمی بنت ڈورو تھیا، ڈورو تھیا کی بیٹی اسمی ہے۔ ایک شخص کا معروف نام محض باپ کی نسبت سے بھی جانا جاتا تھا۔ جیسے ابن فرید، ابن خلدون یعنی فرید کا بیٹا، خلدون کا بیٹا، اس کہانی میں عرب اپنے شہروں کے وہی نام استعمال کرتے ہیں جو انہوں نے خود انہیں بساتے ہوئے انہیں دیئے تھے۔

باب 1

"اگر حالات اسی طرح سے رہے" اماں اپنے پوپلے منہ سے کہہ رہی تھی۔ "تو ایک خوشگوار سی یاد کے علاوہ ہمارا کچھ بھی باقی نہیں رہے گا۔"

یزید کے انہماک میں خلل پڑا۔ اس نے تیوری چڑھائی اور شطرنج کی بساط سے نظریں اٹھا کر اوپر دیکھا۔ وہ صحن کے دوسرے سرے پر شطرنج کی چالوں کو سمجھنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ اس کی بہنیں۔ ہند اور کلثوم۔ دونوں زبردست شطرنج باز تھیں۔ وہ غرناطہ میں دوسرے عزیزوں کے ساتھ رہتی تھیں۔ یزید چاہتا تھا کہ جب وہ واپس آئیں تو انہیں بالکل انوکھی چالوں سے چونکا دے۔

اس نے اماں کو بھی کھیل میں گھسیٹنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن بڑھیا نے ہنس کے ٹال دیا۔ اس کا انکار یزید کی سمجھ میں نہیں آیا۔ کیا شطرنج اس تسبیح سے کہیں زیادہ بہتر نہیں تھی جسے وہ ہر وقت گھماتی رہتی تھی؟ پھر یہ عام سی بات اس کی سمجھ میں کیوں نہیں آتی تھی؟

اس نے بددلی سے مہروں کو اٹھانا شروع کیا۔ یہ کتنے عجیب و غریب ہیں۔ مہروں کو ان کے ڈبے میں رکھتے ہوئے اس نے سوچا۔ اس کے باپ نے یہ خاص طور سے اس کے لئے بنوائے تھے۔ بڑھئی یو آن کو تاکید کی گئی تھی کہ وہ انہیں اس کی دسویں سالگرہ سے پہلے پہلے تیار کر دے جو کہ 905 سن ہجری بمطابق 1500 سن عیسوی، ہجری سال کے آخری مہینہ میں پڑتی تھی۔

یو آن کا خاندان صدیوں سے بنو حزیل کی خدمت کرتا چلا آرہا تھا 932ء میں قبیلہ حزیل کا سربراہ۔ حمزہ بن حزیل۔ دمشق سے بھاگ کر اپنے اہل خانہ اور حواریوں کے ساتھ

اسلام کی اس مغربی چوکی میں آ گیا تھا۔ غرناطہ سے کوئی بیس میل کے فاصلہ پر ایک پہاڑی ڈھلوان پر اس نے سکونت اختیار کی۔ یہاں اس نے ایک قریہ قائم کیا جو الحزیل کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ بلندی پر واقع تھا اور دور سے نظر آتا تھا۔ یہ پہاڑی ندیوں سے گھرا ہوا تھا جو بہار کے دنوں میں برفانی طوفانوں سے بھر جاتیں۔ اس گاؤں کے اطراف میں حمزہ کی اولاد نے زمین کاشت کی اور باغ لگائے۔ جب حمزہ کو مرے ہوئے پچاس برس ہو چکے تھے تو اس کے خاندان نے ایک محل تعمیر کیا۔ اس کے گرد کھیت تھے اور انگور' بادام' سنگتروں' اناروں اور ملبری کے باغات تھے جو دور سے ایسے لگتے تھے جیسے بچے اپنی ماؤں کو گھیرے ہوئے بیٹھے ہوں۔

تقریباً تمام کا تمام فرنیچر سوائے اس کے جو مال غنیمت کے طور پر ابن فرید کو جنگوں سے ہاتھ لگا تھا۔ یو آن کے آباؤاجداد کی محنت اور کاری گری کا مظہر تھا۔ تمام گاؤں والوں کی طرح بڑھئی کو بھی خاندان میں یزید کی اہمیت کا علم تھا۔ یہ لڑکا سب کا چہیتا تھا۔ چنانچہ اس نے طے کیا کہ وہ ایسے مہرے بنائے گا جو ان سب کے بعد بھی باقی رہیں۔ اس موقع پر تو یو آن اپنے خوابوں اور خیالوں سے بھی آگے نکل گیا۔

مور عربوں کو سفید رنگ میں بنایا گیا ان کی ملکہ پر وقار اور حسین تھی جس کے سر پر ایک اوڑھنی تھی اور اس کا شوہر سرخ داڑھی اور نیلی آنکھوں والا بادشاہ تھا جس نے عربی قبا اوڑھی ہوئی تھی اور اس پر نایاب جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ رخ ان میناروں کا نمونہ تھے جو بنو حزیل کے عظیم الشان محل کے دروازے کی شان تھے۔ شہ سوار یزید کے پردادا ابن فرید کی تصویر تھے جو بڑا جنگجو تھا اور جس کی محبت اور جنگوں کے افسانے اس خاندان کی ثقافتی روایات کا اہم جزو تھے۔ فیل سفید رنگ کے تھے اور انہیں گاؤں کی مسجد کے عمامہ پوش اماموں کی طرز پر بنایا گیا تھا۔ پیادے یزید سے ملتی جلتی سیدھی سادھی شکلوں کے تھے۔

عیسائی نہ صرف کالے رنگ کے تھے بلکہ بھوت لگتے تھے۔ کالی ملکہ کی آنکھوں میں شرارت کی چمک تھی اور اس کے بالکل برعکس حضرت مریم کا ایک چھوٹا سا مجسمہ اس کی گردن میں پڑا ہوا تھا۔ اس کے ہونٹ خون کی طرح سرخ تھے۔ اس کے ہاتھ میں ایک انگوٹھی تھی جس پر ایک کھوپڑی بنی ہوئی تھی۔ بادشاہ کے سر پر ایک تاج تھا جسے اتارا اور پہنا جا سکتا تھا۔ شاید یہ اشارہ کافی نہیں تھا اس لئے اس کافر شکن بڑھئی نے بادشاہ کے سر پر دو چھوٹے چھوٹے سینگ بھی لگا دیئے تھے۔ فرڈ ینڈ اور ازابیلا کی تصویروں کے گرد

دوسری شکلیں بھی بہت بگڑی ہوئی تھیں۔ گھوڑ سواروں نے ہاتھ اٹھائے ہوئے تھے جو خون آلود تھے۔ دونوں فیل شیطان کی شکل کے تھے ان کے ہاتھوں میں خنجر تھے اور ان کے پیچھے کوڑوں کی شکل کی دمیں نکلی ہوئی تھیں۔ یو آن نے زمنس دی سیزدس کو نہیں دیکھا تھا ورنہ اسمیں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ آرچ بشپ کی دہکتی ہوئی آنکھیں اور طوطے کی چونچ جیسی ناک کا بھی چربہ کھینچ ڈالتا۔ پیادوں کو پادریوں کی شکل میں ڈھالا گیا تھا۔ ان کے سروں پر ان کی مخصوص ٹوپیاں تھیں۔ آنکھوں سے بھوک ٹپکتی تھی۔ پیٹ پھولے ہوئے تھے اور لگتا تھا جیسے وہ کلیسائی عدالت کے گماشتے ہیں جو اپنے شکار کی تلاش میں ہیں۔

جس نے بھی یو آن کی یہ کاریگری دیکھی اس کے کمال کا اعتراف کیا۔ یزید کا باپ۔ عمر پریشان تھا۔ اسے ڈر تھا کہ اگر کلیسائی عدالت کے کسی سپاہی نے اس شطرنج کو دیکھ لیا تو بڑھئی کو سخت ایذا دے کر مار دیا جائے گا۔ لیکن یو آن اپنی بات کا پکا تھا۔ یہ تحفہ بچے کو ضرور ملے گا۔ چھ برس پہلے جب بڑھئی کا باپ اپنے عزیزوں سے ملنے طلیطلہ گیا ہوا تھا تو وہاں کلیسائی عدالت نے اس پر کفر کا فتویٰ لگایا تھا۔ پادریوں نے اس کو سخت اذیتیں پہنچائیں اور زخموں کی تاب نہ لا کر وہ قید میں ہی مر گیا آخر میں اس کے ہاتھوں کی انگلیاں بھی کاٹ دی گئیں۔ عمر رسیدہ بڑھئی کے اندر زندہ رہنے کی خواہش ختم ہو گئی تھی۔ نوجوان یو آن انتقام لینے پر تلا ہوا تھا۔ شطرنج کے مہرے تو صرف ابتدا تھی۔

ہر مہرے کے نیچے یزید کا نام کندہ کیا ہوا تھا۔ اور اسے ان مہروں سے اتنا لگاؤ ہو گیا تھا کہ وہ اسے جیتے جاگتے انسان لگتے تھے البتہ ازابیلا اسے بہت پسند تھی۔ وہ کالی ملکہ۔ وہ اس سے مسحور بھی تھا اور خوفزدہ بھی' آہستہ آہستہ وہ اس کی ہمراز بن گئی جسے وہ اپنے دکھ بتاتا۔ لیکن صرف تنہائی میں۔ ایک دفعہ جب وہ اپنی بساط سمیٹ چکا تھا تو اس نے اس بڑھیا کی طرف دیکھا اور ایک ٹھنڈی سانس لی۔

آج کل اماں اپنے آپ سے اتنی باتیں کیوں کرتی ہے؟ کیا اس کا دماغ خراب ہو رہا ہے؟ ہند نے تو یہی کہا تھا لیکن اسے یقین نہیں تھا۔ یزید کی بہن اکثر غصہ میں ایسی باتیں کہہ دیتی تھی لیکن واقعی اگر اماں کا سر پھر گیا تھا تو اس کے باپ نے اسے غرناطہ میں میروادی زہرہ کے قریب میرستان میں بھیج دیا ہوتا۔ ہند کو صرف اس پر غصہ آتا تھا کہ وہ کہتی رہتی کہ اس کے والدین کو اب اس کی شادی کر دینی چاہیے۔

یزید صحن سے ہوتا ہوا اماں کی گود میں جا کر بیٹھ گیا۔ بڑھیا کا چہرہ۔ جو پہلے ہی جھریوں سے بھرا ہوا تھا مسکرانے سے اور بھی جھریا گیا۔ اس نے بغیر کسی تکلف کے تسبیح کو رکھا'

بچے کے چہرے کو تھپتھپایا اور پیار سے اس کے ماتھے کو چوما۔

"اللہ خوش رکھے' کیا تمہیں بھوک لگی ہے؟"

"نہیں اماں! ابھی آپ کس سے باتیں کر رہی تھیں؟"

"آجکل بڑھیا کی بات کون سنتا ہے۔ ابن عمر؟ اس سے تو اچھا تھا میں مر ہی جاتی" اماں نے کبھی یزید کو اس کے نام سے نہیں بلایا تھا۔ کبھی بھی نہیں۔ کیا یہ حقیقت نہیں تھی کہ یزید اس خلیفہ کا نام تھا جس نے نبیؐ کے نواسوں کو کربلا میں شہید کیا تھا؟ یزید نے اپنے سپاہیوں کو ہدایت دی تھی کہ وہ مدینہ کی اس مسجد میں اپنے گھوڑے باندھیں جہاں خود نبیؐ نماز پڑھتے تھے۔ یہی یزید اصحاب رسولؐ کے ساتھ حقارت سے پیش آیا تھا۔ اس کا نام لینا خاندان رسولؐ کی شان میں گستاخی تھی۔ اس نے بچے کو یہ سب کچھ نہیں بتلایا لیکن اتنا ہی کافی تھا کہ وہ اسے ہمیشہ ابن عمر کہتی تھی۔ یعنی اپنے باپ کا بیٹا۔ ایک مرتبہ یزید نے سب گھر والوں کے سامنے اس سے اس کی وجہ پوچھی تھی اور اماں نے غصہ سے اس کی ماں زبیدہ کی طرف دیکھا تھا گویا کہہ رہی ہو کہ سب اس کا قصور ہے۔ تم اس سے کیوں نہیں پوچھتے؟ لیکن سب ہنسنے لگے اور اماں غصہ سے اٹھ کر باہر چلی گئی۔

"میں سن رہا تھا۔ تم باتیں کر رہی تھیں۔ میں بتا سکتا ہوں کہ تم کیا کہہ رہی تھیں۔ بتاؤں"

"میرے بچے" اماں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "میں اناروں کے درختوں کے سایوں سے باتیں کر رہی تھی۔ جب ہم نہیں رہیں گے تو کم از کم وہ یہاں موجود ہوں گے"

"ہم سب کہاں جائیں گے۔ اماں؟"

"جنت میں۔ میرے بچے"

"کیا ہم سب جنت میں جائیں گے؟"

"اللہ خوش رکھے۔ میرے پیارے سے چاند کے ٹکڑے تم ساتویں آسمان پر جاؤ گے۔ دوسروں کے متعلق مجھے یقین نہیں اور جہاں تک تمہاری بہن ہند بنت عمر کا تعلق ہے اگر انہوں نے اس کی شادی نہ کی تو وہ پہلے آسمان تک بھی نہیں جا سکے گی۔ نہیں' بالکل نہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ کسی مصیبت میں نہ پڑ جائے۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ برے خیالات میں نہ پھنس جائے اور اس کے باپ کو شرمسار نہ ہونا پڑے۔ اللہ اسے اپنی امان میں رکھے"۔

یزید کو اس خیال سے گدگدی سی ہوئی کہ ہند پہلے آسمان تک بھی نہیں جا سکے گی اور اس کے ساتھ ساتھ اماں بھی ہنسنے لگی اور اس کے کل بقایا آٹھ دانت نظر آنے لگے۔

اپنے تمام بہن بھائیوں میں یزید کو ہند سے سب سے زیادہ لگاؤ تھا۔ باقی سب اسے بچہ سمجھتے تھے اور حیران ہوتے تھے کہ یہ کتنا ذہین اور باتونی ہے وہ اسے گود میں لیتے پیار کرتے' جیسے وہ کوئی پالتو جانور تھا اسے معلوم تھا کہ وہ ان کا چہیتا تھا لیکن جب وہ اس کی باتوں کا جواب نہیں دیتے تھے تو اسے بہت برے لگتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ سب سے متنفر تھا۔ سب سوائے ہند کے جو اس سے چھ سال بڑی تھی لیکن برابری کا برتاؤ کرتی تھی' اس سے جھگڑتے تھے' لڑائی کرتے تھے لیکن ایک دوسرے پر فریفتہ تھے بہن کے لئے اس کی محبت اتنی گہری تھی کہ اماں کی ناقابل فہم ملامتوں سے پریشان نہ ہوتا اور نہ ہند کے متعلق اس کے جذبات میں فرق پڑتا۔ یہ ہند ہی تھی جس نے اسے بڑے چچا میگوئل کی آمد کے متعلق بتایا تھا۔ اور جس کی وجہ سے پچھلے ہفتے اس کے والدین بہت پریشان تھے۔ وہ بھی یہ سن کر بہت پریشان ہوا تھا کہ میگوئل ان سب کو قرطبہ آنے کی دعوت دے رہا تھا جہاں وہ بشپ تھا۔ تاکہ وہ خود انہیں رومن کیتھولک بنا سکے۔ میگوئل ہی تین روز قبل سب کو ہند سمیت کھینچ کر غرناطہ لے گیا تھا۔ یزید نے ایک بار پھر بڑھیا کی طرف رخ کیا۔

"بڑے چچا میگوئل ہم ہی سے عربی میں کیوں نہیں بولتے؟"

اماں اس سوال سے گھبرا گئی۔ پرانی عادتیں کبھی نہیں جاتیں۔ چنانچہ بالکل میکانکی انداز میں اس نے میگوئل کے نام پر تھوکا اور کسی قدر بےقراری سے اپنی تسبیح ڈھونڈنے لگی اور ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ دہراتی رہی۔

"لاالہ الااللہ محمد الرسول اللہ۔"

"مجھے بتاؤ اماں! مجھے جواب دو"

اماں نے بچے کے دمکتے ہوئے چہرہ کو دیکھا۔ اس کی بادامی آنکھیں غصہ سے دہک رہی تھیں۔ اسے دیکھ کر اسے اس کا پردادا یاد آ گیا۔ اس یاد سے اس کا دل پگھل گیا اور اس نے جواب دیا۔

"تمہارا بڑا چچا میگوئل عربی بولتا ہے۔ عربی پڑھتا ہے اور عربی لکھتا ہے لیکن ۔۔۔ لیکن ۔۔۔" اماں کی آواز غصہ سے رندھ گئی "اس نے ہم سے منہ پھیر لیا ہے ہر چیز سے منہ پھیر لیا ہے تم نے غور نہیں کیا کہ اس دفعہ اس میں سے بو آ رہی تھی بالکل ان جیسی"

یزید پھر ہنسنے لگا اسے معلوم تھا کہ بڑے چچا میگوئل کو خاندان میں لوگ پسند نہیں کرتے تھے لیکن کبھی کسی نے اس کے متعلق یوں ہتک آمیز باتیں نہیں کہی تھیں۔ اماں بالکل ٹھیک کہتی تھی۔ جب ام زبیدہ نے اس کے اندر سے اٹھنے والی بو کا ذکر کیا تو خود اس

کا باپ بھی ہنسی میں شامل ہو گیا۔ بشپ میں سے ایسی بو آ رہی تھی جیسی اس اونٹ میں سے آتی ہے جس نے بہت ساری کھجوریں کھائی ہوئی ہوں۔

"کیا اس میں سے ہمیشہ بو آتی تھی؟"

"قطعی نہیں" اماں اس سوال سے گھبرا گئی۔ "ان دنوں میں جب اس نے ابھی اپنی روح کو بیچا نہیں تھا اور صلیبوں پر لٹکے ہوئے خون آلود بتوں کو پوجنا شروع نہیں کیا تھا وہ بہت پاک صاف انسان تھا۔ گرمیوں میں روزانہ پانچ وقت غسل کرتا' پانچ دفعہ کپڑے بدلتا' مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہیں اب اس میں اصطبل کی سی بو آتی ہے۔ تمہیں پتہ ہے کیوں؟ "

یزید نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔

"اس لئے کہ کوئی اسے چوغہ میں چھپا ہوا مسلمان ہونے کا الزام نہ دے۔ بدبودار کیتھولک! ارض مقدس کے عیسائی صاف ستھرے تھے لیکن یہ کیتھولک پادری پانی سے ڈرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اگر نہائیں گے تو وہ اس سینٹ کی تکفیر کریں گے جسے وہ خدا کا بیٹا کہتے ہیں۔"

"اٹھو۔ میرے ساتھ آؤ۔ کھانے کا وقت ہو گیا ہے۔ سورج غروب ہو رہا ہے اور اب ہم زیادہ دیر ان کے غرناطہ سے واپس آنے کا انتظار نہیں کر سکتے۔ مجھے کچھ یاد آیا۔ کیا آج تم نے شہد لیا؟"

یزید نے گھبرا کر سر ہلایا۔ جب سے وہ پیدا ہوا تھا اور اس سے پہلے اس کے بہن بھائی پیدا ہوئے تھے۔ اماں ہر صبح مصفا جنگلی شہد کا ایک چمچہ ان کے منہ میں ٹھونس دیتی تھی۔

"جب تک آپ مغرب کی نماز نہ پڑھیں ہم کھانا کیسے کھا سکتے ہیں؟" اس نے ناراضگی سے اس کی طرف دیکھا یہ خیال کہ کیا کبھی وہ اپنی نماز کو بھول سکتی ہے۔ ایسا گناہ! یزید نے دانت نکالے اور وہ بھی اپنی مسکراہٹ نہ دبا سکی۔ اسے گود میں اٹھا کر وہ آہستہ آہستہ غسل خانہ کی طرف وضو کرنے کے لئے چل پڑی۔

یزید انار کے درخت کے نیچے بیٹھا رہا اسے دن کا یہ وقت اچھا لگتا تھا جب پرندے شور کرتے ہوئے اپنے بسیروں میں واپس آ رہے ہوتے۔ کوئلیں اپنے آخری پیغام پہنچاتیں۔ برج سے پرے ایک کنج میں جو بیرونی احاطہ کے باہر تھا اور دور دور تک فاختائیں کو کو کرتی ہوتیں۔

ایک دم سے فضا کا رنگ بدلا اور مکمل خاموشی چھا گئی۔ گہرا نیلا آسمان کچھ کچھ سنہری

سا ہو گیا۔ پہاڑوں کی چوٹیوں پر جہاں برف جمی ہوئی تھی ایک عجیب سا سماں تھا۔ حویلی کے صحن میں یزید نے پہلے ستارے کو ڈھونڈنے کے لئے اپنی آنکھیں اوپر لگائیں لیکن وہاں ابھی کوئی تارہ نہیں تھا۔ اس نے سوچا کہ مینار پر چڑھے اور دوربین سے دیکھے لیکن اگر اس کے سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے ہی پہلا ستارہ نمودار ہو گیا تو؟ اس نے آنکھیں بند کر لیں لگتا تھا چنبیلی کی تیز خوشبو نے اس پر حشیش کا سا نشہ طاری کر دیا تھا اور اس پر غنودگی چھا گئی تھی لیکن حقیقت میں وہ پانچ سو تک گن رہا تھا۔ شمالی ستارے کے نمودار ہونے تک وہ اسی طرح وقت گزارا کرتا تھا۔ موذن کی آواز نے بچے کے خیالات کے سلسلہ کو توڑ دیا۔ اماں گھسٹتی ہوئی اپنی جانماز کے ساتھ باہر آئی اور مشرق کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے لگی۔ جونہی وہ کعبہ کی طرف رخ کر کے سجدے میں گئی باورچی الحسایا نے صحن کے دوسرے کنارے کی پٹڑی پر کھڑے ہو کر زور زور سے ہاتھ چلانے شروع کر دیئے اور باورچی خانہ کی طرف اشارہ کیا۔ بچہ تیزی سے اس کی طرف دوڑا۔

"کیا ہے؟ بونے؟"

باورچی نے منہ پر انگلی رکھی اور اسے خاموش ہونے کو کہا۔ بچے نے اس کی بات مان لی۔ ایک لمحہ بونا اور بچہ دونوں بت بنے کھڑے رہے۔ پھر باورچی بولا "سنو۔ ذرا سنو۔ تمہیں کچھ سنائی دے رہا ہے؟" یزید کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ دور سے گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز صاف آ رہی تھی۔ اور ان کے پیچھے چوں چوں کرتی ہوئی گاڑی کی جیسے ہی آواز اونچی ہوئی بچہ باہر کی طرف دوڑا۔ اب آسمان ستاروں سے بھر گیا تھا اور یزید نے دیکھا کہ ملازم گھر والوں کے استقبال کیلئے اپنی مشعلیں روشن کر رہے تھے۔ دور ایک آواز گونجی:

"عمر بن عبداللہ واپس آ گئے، عمر بن عبداللہ واپس آ گئے۔"

مزید شمعیں جلائی گئیں اور یزید اور زیادہ بیقرار ہو گیا پھر اس نے تین گھڑ سواروں کو دیکھا اور چلانے لگا:

"ابو! ابو! زہیر! ہند! ہند! جلدی کرو مجھے بھوک لگ رہی ہے" وہاں وہ سب تھے۔ یزید کو اپنی غلطی ماننی پڑی۔ تین گھڑ سواروں میں ایک اس کی بہن ہند تھی۔ زہیر گاڑی میں اپنی ماں اور کلثوم کے ساتھ تھا اور ایک کمبل میں لپٹا ہوا تھا۔

عمر بن عبداللہ نے لڑکے کو اٹھا لیا اور گلے لگایا۔

"میرا شہزادہ ٹھیک رہا ہے؟"

یزید نے ہاں میں سر ہلایا اس کی ماں اس کے چہرے کو چومتی رہی پیشتر اس کے کہ

دوسرے بھی اس شغل میں شامل ہوتے ہند نے اسے پکڑا اور دونوں گھر کے اندر بھاگ گئے

"آپ زہیر کے گھوڑے پر کیوں سوار تھیں؟"

ہند کے چہرہ پر تشویش کے آثار ظاہر ہوئے۔ کچھ دیر اس نے سوچا کہ وہ سچ بتائے یا نہیں۔ اس نے فیصلہ کیا کہ نہیں اس لئے کہ کہیں یزید پریشان نہ ہو۔ سب گھروالوں سے زیادہ اسے معلوم تھا کہ کیسے اس کا بھائی خیالوں کی دنیا میں گم ہو جاتا تھا۔

"ہند۔ زہیر کو کیا ہوا ہے؟"

"اسے بخار ہو گیا ہے"

"کہیں یہ طاعون تو نہیں؟"

ہند زور سے ہنسی

"تم پھر اماں سے کہانیاں سنتے رہے ہو۔ کیوں؟ پاگل! جب وہ طاعون کی بات کرتی ہے تو اس سے مراد عیسائیت ہوتی ہے۔ اور زہیر کو یہ بیماری نہیں ہے۔ کوئی تشویش کی بات نہیں ہے۔ امی کہتی ہیں وہ چند روز میں ٹھیک ہو جائے گا۔ اسے تبدیلی آب وہوا راس نہیں آتی۔ یہ خزاں کا بخار ہے۔ آؤ نہاتے ہیں۔ آج پہلے ہماری باری ہے۔"

یزید نے غصے کا سا منہ بنایا۔

"میں نہا چکا ہوں۔ اور اماں کہتی ہے کہ میں اب بڑا ہو گیا ہوں اور عورتوں کے ساتھ نہیں نہا سکتا۔ وہ کہتی ہے۔"

"میرا خیال ہے اماں پر بڑھاپا کچھ زیادہ چڑھتا آ رہا ہے۔ وہ کتنی اوٹ پٹانگ باتیں کرتی ہے۔"

"وہ بڑی عقل کی باتیں بھی کرتی ہے۔ اور وہ تم سے بہت زیادہ جانتی ہے۔ ہند!" یزید رکا کہ دیکھ سکے کہ اس کی بہن کے چہرہ پر اس ڈانٹ کا کچھ اثر ہوا لیکن وہ بالکل متاثر نہیں ہوئی تھی۔ پھر اس نے ہند کی آنکھوں میں مسکراہٹ دیکھی۔ اس نے اپنا بایاں ہاتھ یزید کو پکڑایا اور دونوں تیزی سے گھر کی طرف چلنے لگے۔ یزید نے اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو نظر انداز کر دیا لیکن اسکے ساتھ ساتھ صحن سے گزر گیا اور اس کے ساتھ غسل خانہ میں داخل ہو گیا۔

"میں نہاؤں گا نہیں۔ لیکن تم سب سے باتیں کرنے کے لئے آؤں گا۔"

کمرہ خادماؤں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ یزید کی ماں اور کلثوم کے کپڑے اتار رہی تھیں یزید حیران تھا کہ اس کی ماں پریشان کیوں نظر آ رہی تھی۔ شاید وہ سفر سے تھک گئی تھی۔ شاید

اس کی وجہ زہیر کا بخار تھا۔ جب ہند کپڑے اتارنے لگی تو اس نے سوچنا چھوڑ دیا۔ اس کی خادمائیں اترے ہوئے کپڑے اٹھانے کیلئے دوڑیں۔ تینوں عورتوں کو نہایت نرم سپنج سے صابن ملا گیا پھر ان پر پانی لنڈھایا گیا۔ اس کے بعد وہ بڑے حمام میں داخل ہوئیں جو تالاب جتنا تھا۔ گھر کے اندر سے گزرتی ہوئی نہر کو موڑ کر حمام میں تازہ پانی لایا گیا تھا

"کیا تم نے یزید کو بتا دیا ہے؟" ماں نے پوچھا

ہند نے سر کو انکار میں ہلایا۔

"مجھے کیا بتایا ہے؟"

کلثوم کھلکھلائی

" بڑے چچا میگوئل کی خواہش ہے کہ ہند یوآن سے شادی کر لے"

یزید ہنسا۔ "لیکن وہ تو اتنا بے ہنگم اور موٹا ہے"

ہند خوش ہو کر چلائی۔ "دیکھا امی! یزید بھی مانتا ہے۔ یوآن کا سر نہیں۔ کدو ہے۔ امی وہ اس قدر بیوقوف کیسے ہو سکتا ہے؟ بڑے چچا میگوئل غلیظ ہو سکتے ہیں لیکن احمق نہیں ہیں۔ انہوں نے سور اور بھیڑ کے درمیان میل کے متعلق کیسے سوچا؟"

"بیٹا۔ ان معاملات میں کوئی قانون نہیں چلتا"

"مجھے پتہ نہیں" کلثوم بولی۔ "ہو سکتا ہے عیسائی ہونے پر خدا کی طرف سے یہ کوئی عذاب ہو"

ہند نے ڈبکی لی اور کلثوم کا سر پانی میں ڈبو دیا۔ کلثوم ہنستی ہوئی باہر آئی۔ کچھ ہی مہینے پہلے اس کی منگنی ہوئی تھی اور اگلے سال کے پہلے مہینہ میں اس کی شادی اور رخصتی کی تاریخ مقرر ہو گئی تھی۔ وہ ابھی انتظار کر سکتی تھی۔ اس کا منگیتر ابن حارث تھا جسے وہ بچپن سے جانتی تھی وہ اس کی ماں کے رشتہ کے ایک بھائی کا بیٹا تھا۔ جب وہ سولہ برس کا تھا تب سے اس سے محبت کرتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ اشبیلہ کے بجائے غرناطہ میں ہوتے۔ مگر یہ ممکن نہیں تھا۔ شادی کے بعد وہ کوشش کرے گی اور اسے گھر کے قریب کھینچ لائے گی۔

"کیا یوآن میں سے بھی ایسی ہی بو آتی ہے جیسی میگوئل میں سے؟"

یزید کے سوال کا کسی نے جواب نہیں دیا۔ اسکی ماں نے تالی بجائی اور خادمائیں جو باہر منتظر تھیں تولئے اور خوشبو دار تیل لے کر داخل ہوئیں۔ یزید غور سے سب کچھ دیکھتا رہا تینوں عورتوں کے جسم خشک کئے گئے اور ان پر تیل کی مالش کی گئی۔ باہر سے عمر کی آواز آ

رہی تھی جو بڑی بے چینی سے کچھ بول رہا تھا۔ عورتیں جلدی سے حمام میں سے نکل کر برابر والے کمرے میں چلی گئیں جہاں ان کے لباس رکھے ہوئے تھے۔ یزید بھی ان کے پیچھے پیچھے گیا لیکن فوراً ہی ماں نے اسے باورچی خانہ میں بھجوا دیا اور بونے کو ہدایت بھیجی کہ کھانا تیار کرے اور آدھے گھنٹہ کے اندر اندر لگا دے۔ جب وہ جانے لگا تو ہند نے اس کے کان میں کہا۔ "بو آن میں سے اس لٹھ بڈھے سے زیادہ بو آتی ہے"

"اب تم سمجھیں۔ اماں ہمیشہ غلط بات نہیں کرتی۔" کمرے سے بھاگتے ہوئے لڑکے نے بڑے احساس فتح مندی کے ساتھ کہا۔

باورچی خانہ میں بونے نے کھانا تیار کر لیا تھا۔ اتنی بے ہنگم خوشبوئیں آ رہی تھیں کہ یزید بھی جو بونے کا بڑا دوست تھا اندازہ نہ لگا سکا کہ بونے نے گھروالوں کی غرناطہ سے واپسی کی خوشی میں کس قسم کے کھانے تیار کئے ہیں۔ سارا باورچی خانہ نوکروں اور کام کرنے والوں سے بھرا ہوا تھا جن میں کچھ عمر کے ساتھ بڑے شہر سے آئے تھے۔ وہ اتنے جوش میں باتیں کر رہے تھے کہ کسی نے یزید کو اندر آتے ہوئے نہیں دیکھا سوائے بونے کے جو تقریباً اسی کے قد کا تھا۔ وہ لڑکے کی طرف دوڑا۔ "پتہ ہے میں نے کیا پکایا ہے؟"

نہیں، لیکن تم اتنے اچھل کیوں رہے ہو؟"

"یعنی تمہیں کچھ پتہ نہیں"

"کیا ہے۔ جلدی بتاؤ بونے! چلو"

یزید کی آواز بے دھیانی میں اونچی ہو گئی اور دوسرے اس کی طرف متوجہ ہوئے اور باورچی خانہ میں خاموشی چھا گئی۔ صرف بڑی پتیلی میں سے کبابوں کے بھننے کی سر سر آتی رہی۔ بونے نے اداس سی مسکراہٹ کے ساتھ لڑکے کی طرف دیکھا۔

"تمہارا بھائی زہیر بن عمر...."

"اسے کچھ بخار ہے یا کوئی اور بات ہے؟ ہند نے مجھے کیوں نہیں بتایا۔ کیا بات ہے بونے! تم مجھے بتاؤ"

"چھوٹے آقا! مجھے سب باتوں کا پتہ نہیں ہے لیکن تمہارے بھائی کو بخار نہیں ہے۔ شہر میں ایک عیسائی سے جھگڑا ہوا اور اس نے اسے چاقو مار دیا۔ وہ خطرے سے باہر ہے۔ زخم صرف گوشت تک ہے لیکن اسے اچھا ہونے میں کئی ہفتے لگیں گے۔"

یزید بھول گیا کہ کس کام کے لئے آیا تھا اور باورچی خانہ سے نکل کر صحن میں سے

دوڑتے ہوئے اپنے بھائی کے کمرے میں داخل ہی ہونا چاہتا تھا کہ اس کے باپ نے اسے اٹھا لیا۔

"زہیر گہری نیند میں ہے۔ صبح جتنی چاہو اس سے باتیں کرنا"

"اسے کس نے چھری ماری؟ ابو! کون، کون تھا وہ؟"

یزید کو بہت دکھ ہوا۔ زہیر سے اسے بڑا لگاؤ تھا اور اسے بڑی شرمندگی ہو رہی تھی کہ بڑے بھائی سے بے پرواہ ہو کر وہ ہند اور عورتوں میں وقت ضائع کرتا رہا اس کے باپ نے اسے دلاسہ دینے کی کوشش کی۔

"بالکل معمولی سی بات تھی۔ بس ایک حادثہ تھا۔ کسی احمق نے اس وقت میرے ساتھ گستاخی کی جب ہم چچا کے گھر میں داخل ہو رہے تھے۔"

"کیسے؟"

"فکر کی کوئی بات نہیں۔ اس نے کچھ ایسی گالی دی تھی کہ ہمیں سور کا گوشت کھلایا جائے گا۔ میں نے اسے نظرانداز کر دیا۔ لیکن زہیر جو بہت تیز مزاج ہے اس نے اس آدمی کو تھپڑ لگایا جس پر اس نے چھرا نکالا جو اس کے چوغہ میں چھپا ہوا تھا اور تمہارے بھائی کے کندھے کے نیچے مارا۔"

"اور۔ آپ نے اس بدمعاش کو سزا دی؟"

"نہیں۔ بیٹے! ہم تمہارے بھائی کو اندر لے گئے اور اس کی تیمارداری کی۔"

"تمہارے ملازم کہاں تھے؟"

"ہمارے ساتھ ہی تھے لیکن میں نے انہیں سختی سے منع کر دیا تھا کہ بدلہ نہ لیں"

"لیکن کیوں؟ ابو! کیوں؟ شاید اماں ٹھیک ہی کہتی ہے۔ سوائے کچھ خوشگوار یادوں کے ہمارا کچھ بھی باقی نہیں رہے گا۔"

"واللہ! کیا اس نے یہ کہا؟"

یزید نے روتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ عمر نے اپنے بیٹے کے چہرے کی نمی کو محسوس کیا اور گلے لگا لیا "یزید بن عمر! اب ہمارے لئے کوئی فیصلہ کرنا آسان نہیں ہے۔ ہم اپنی تاریخ کے سخت ترین دور سے گزر رہے ہیں۔ جب سے طارق اور موسیٰ نے اس سرزمین پر قدم رکھے ہم پر ایسا سخت وقت کبھی نہیں پڑا اور تمہیں پتہ ہے یہ کب کی بات ہے تمہیں نہیں معلوم؟"

یزید نے سر ہلایا۔ "ہماری پہلی اور ان کی آٹھویں صدی میں"

بالکل صحیح بیٹے! دیر ہو رہی ہے۔ چلو ہاتھ دھوئیں اور کھانا کھائیں۔ تمہاری امی انتظار کر رہی ہیں۔" اماں جس نے خاموشی سے سارا قصہ باورچی خانہ کے باہر صحن کے سرے پر کھڑے کھڑے سنا تھا اس نے اندر جاتے ہوئے باپ بیٹے کو دم سادھے دعائیں دیں۔ پھر ادھر ادھر ہلتے ہوئے اس نے حلق سے ایک عجیب سی آواز نکالی اور ایک زبردست بددعا دی:

"یااللہ! ہمیں ان پاگل کتوں سے بچا۔ ان سور خوروں سے بچا۔ ہمیں حق کے ان دشمنوں سے بچا جنہیں تعصب نے اتنا اندھا کردیا ہے کہ وہ اپنے خدا کو کیلوں سے لکڑی میں ٹھوکتے ہیں اور اسے باپ' ماں اور بیٹا کہتے ہیں اور اس کے نہ ماننے والوں کو باطل کے سمندر میں غرق کرتے ہیں۔ انہوں نے ظلم سے ہمیں دبا دیا ہے۔ ختم کر دیا ہے۔ لاکھ بار حمد وثنا تجھ پر اے اللہ! میرا ایمان ہے کہ تو ہمیں ان کتوں سے نجات دے گا جو روزانہ شہر شہر ہمیں اپنے گھروں سے نکالنے آتے ہیں" اگر ایک نوجوان خادمہ مخل نہ ہوتی تو نہ جانے کتنی دیر تک وہ اسی طرح بڑبڑاتی رہتی۔

"تمہارا کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے اماں!"

بوڑھی عورت آہستہ آہستہ اٹھی اور اپنی جھکی ہوئی کمر کے ساتھ خادمہ کے پیچھے پیچھے باورچی خانہ میں چلی گئی۔

ملازموں کے سامنے اماں کی حیثیت بالکل واضح تھی۔ آقا کی انا ہونے کی حیثیت میں اور اس وجہ سے کہ وہ بچپن سے ہی وہاں رہ رہی تھی ملازموں پر اس کا مکمل حکم چلتا تھا لیکن اس سے حفظ مراتب کا مسئلہ طے نہیں ہوتا علاوہ ہونے کے کہ جس کا دعویٰ تھا کہ تمام اندلس میں کوئی اس سے اچھے کھانے نہیں پکا سکتا تھا' باقی تمام ملازم اماں کے سامنے گھر کے نازک معاملات پر بات کرنے سے گھبراتے تھے صرف بونا ہی کسی حد تک یہ جسارت کر سکتا تھا۔ بات یہ نہیں تھی کہ اماں جاسوسی کرتی تھی۔ کبھی کبھی وہ خود غیر ذمہ دارانہ باتیں کرتی تھی اور ملازم اس کی جرات پر تعجب کرتے تھے لیکن اس کے باوجود آقا اور اس کے بیٹوں سے وہ اتنی قریب تھی کہ سب ملازم اس سے گھبراتے تھے۔

دراصل سچ بات تو یہ ہے کہ اماں یزید کی ماں کو بہت برا بھلا کہتی تھی اور اسے اس بات پر اعتراض تھا کہ اس نے اپنے بچوں کی تربیت صحیح طور پر نہیں کی تھی اگر وہ کھل کر اس موضوع پر سوچتی تو تان اسی دعا پر ٹوٹتی کہ آقا دوسری شادی کر لے۔ اس کا خیال تھا کہ گھر کی مالکہ بچوں کی کچھ زیادہ ہی نازبرداری کرتی تھی۔ جاگیر پر کام کرنے والے

مزدوروں پر کچھ زیادہ ہی مہربان تھی اور اس نے ملازموں کو بالکل ہی چھوٹ دی ہوئی تھی اور ان کے مذہبی فرائض کی ادائیگی پر کوئی توجہ نہیں دیتی تھی۔

کبھی کبھی اماں اس حد تک بھی چلی جاتی کہ کسی قدر نرمی سے ایسے خیالات کا اظہار عمر بن عبداللہ سے بھی کرتی اور مصر ہوتی کہ اسی قسم کی کمزوریوں کی وجہ سے اندلس میں اسلام اتنی بری حالت کو پہنچا ہے۔ عمر صرف ہنس دیتا اور پھر حرف بحرف سب کچھ اپنی بیوی کو بتاتا وہ بھی اس خیال سے محظوظ ہوتی کہ وہی اندلس میں اسلام کی ان کمزوریوں کی ذمہ دار ہے جو کہ اس کی ذات میں سمٹ آئی تھیں۔

آج جو کھانے کے کمرے سے قہقہوں کی آوازیں آ رہی تھیں ان کا تعلق اماں یا اس کی احمقانہ باتوں سے نہیں تھا۔ ان خوش گپیوں کی وجہ یہ تھی کہ بونے کے بنائے ہوئے کھانے آقاؤں کو بہت پسند آئے تھے۔ عام دنوں میں سب معمولی کھانے کھاتے جو چار مختلف کھانوں سے زیادہ نہیں ہوتے تھے اور جن میں میٹھے کی ایک پلیٹ اور تازہ پھل شامل ہوتے۔ آج رات انہیں بڑا چٹپٹا بھنا ہوا دنبہ پیش کیا گیا تھا اور گریپ فروٹ کے کشید کردہ رس میں پکایا ہوا خرگوش کا گوشت جس پر سرخ مرچ اور ثابت لہسن ڈالا ہوا تھا اور سبزی بھرے کوفتے جو منہ میں ڈالتے ہی گھل جاتے پھر تیل میں پکے ہوئے سخت قسم کے کوفتے جنہیں بھنی ہوئی چٹنی کے ساتھ کھایا جاتا اور زعفرانی رنگ کی چٹنی میں تیرتا ہوا ہڈیوں سے بھرا ایک پیالہ' گھی میں بنے ہوئے چاول اور مزے دار فرانسیسی حلوہ' تین قسم کے سلاد' اسپریگس' باریک کٹی ہوئی پیاز' ٹماٹر' کھیرے جن پر مصالحہ اور لیموں چھڑکا ہوا تھا' دہی میں ڈلے ہوئے مٹر تھے جن پر کالی مرچ چھڑکی ہوئی تھی۔ قہقہے اس لئے بلند ہوئے تھے کہ یزید نے ہڈی میں سے گودا نکالنے کے لئے پھونک ماری تو وہ اس کے باپ کی داڑھی پر جا گرا۔ ہند نے تالی بجائی اور دو خادمائیں داخل ہوئیں۔ اس کی ماں نے انہیں میز صاف کرنے اور بچا ہوا کھانا آپس میں بانٹ لینے کے لئے کہا۔

"اور سنو! بونے سے کہنا کہ اس کا بنا ہوا حلوہ اور پنیر کا کیک ہم آج رات نہیں کھائیں گے۔ صرف گنے لے آئے۔ کیا انہیں گلاب کے عرق میں تر کیا گیا ہے؟ جلدی کرو۔ کافی دیر ہو گئی ہے"

یزید کے لئے واقعی کافی دیر ہو گئی تھی اور وہ تکیہ کے سہارے سو گیا تھا۔ اماں کو پہلے ہی اسکا اندازہ تھا۔ وہ کمرے میں داخل ہوئی۔ منہ پر انگلی رکھ کر خاموشی کا اشارہ کیا اور سب کو بتایا کہ یزید گہری نیند میں ہے۔ لیکن وہ اتنی بوڑھی ہو گئی تھی کہ اسے اٹھا نہیں

سکتی تھی۔ یہ سوچ کر اسے دکھ ہوا۔ عمر نے اندازہ لگا لیا کہ اس کی بوڑھی انا کے دل پر کیا گزر رہی ہے اسے اپنا بچپنا یاد آگیا جب وہ اس کے پاؤں زمین پر نہیں لگنے دیتی تھی اور اس کی ماں کو فکر تھی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اسے چلنا ہی نہ آئے۔ عمر اٹھا۔ آہستہ سے بیٹے کو اٹھایا اور اپنی خوابگاہ میں لے گیا۔ اماں خوشی سے مسکراتی ہوئی پیچھے پیچھے چلی۔ اس نے بچے کے کپڑے اتارے اور اسے بستر پر لٹا دیا اور بستر کو اچھی طرح ٹھیک سے کر دیا۔

اپنی بیوی اور بیٹیوں کے ساتھ گنڈیریاں چوستے ہوئے عمر کچھ فکر میں ڈوبا ہوا تھا۔ عجیب بات تھی کہ جب برسوں پہلے اسے اماں کا گود میں اٹھانا اور بستر پر لٹانا یاد آیا تو نہ جانے کیوں اسے خیال ہوا کہ جو سال اب شروع ہوا ہے وہ ختم ہو جائے گا۔ یعنی یہ بنو حزیل اور ان کے گھر کے رسم و رواج کا اختتام ہو گا۔ اور اگر سچ کہا جائے تو اندلس میں اسلام کا خاتمہ۔ زبیدہ نے اس کے چہرے کے بدلتے ہوئے رنگ کو دیکھ کر اصل بات جاننے کی کوشش کی۔

"سرتاج! ایک سوال کا جواب دیں"

اس کی آواز پر چونک کر عمر نے اس کی طرف دیکھا اور ایک پھیکی سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر آئی۔

"ایسے حالات میں سب سے بڑی فکر کیا ہو سکتی ہے؟ یہی کہ کسی نہ کسی طرح یہاں خود کو باقی رکھا جائے یا یہاں اپنے گزشتہ پانچ سو برس کے قیام کا جائزہ لیا جائے اور آئندہ کے لئے کوئی منصوبہ بندی کی جائے؟"

"مجھے نہیں معلوم"

"مجھے معلوم ہے۔" ہند بولی

"یہ میں بخوبی جانتا ہوں" باپ نے کہا لیکن اب دیر ہو گئی ہے اور ہم کل اس پر بات کریں گے۔"

"وقت ہمارے ساتھ نہیں ہے۔ ابو!"

"اللہ تمہیں خوش رکھے۔ آرام سے سو جاؤ"

"کیا آپ کو کچھ وقت لگے گا؟" زبیدہ نے پوچھا

"بس چند منٹ۔ میں کچھ تازہ ہوا لینا چاہتا ہوں"

ان کے چلے جانے کے بعد کچھ دیر تک عمر وہیں بیٹھا رہا۔ خیالات میں گم۔ خالی میز کو گھورتے ہوئے وہ اٹھا اور کمبل اوڑھ کر صحن میں آگیا۔ حالانکہ سردی اتنی زیادہ نہیں تھی

پھر بھی تازہ ہوا سے اسے پھریری سی آگئی اور ٹہلتے ہوئے اس نے کمبل کو مزید کس کر لپیٹ لیا۔

گھر میں شمعیں گل کی جا رہی تھیں۔ اور وہ ستاروں کی روشنی میں ٹہلتا رہا صرف اس چھوٹی سی نہر کی آواز آ رہی تھی جو ایک سرے سے صحن میں داخل ہوتی تھی اور درمیان میں فوارے سے ہوتی ہوئی دوسری طرف سے باہر نکل جاتی تھی۔ اچھے وقتوں میں وہ مہکتے ہوئے چنبیلی کے پھول توڑتا۔ نرمی سے انہیں ریشمی رومال میں رکھتا اور تازہ رکھنے کے لئے ان پر پانی چھڑکتا اور انہیں زبیدہ کے سرہانے رکھ دیتا۔ صبح بھی وہ اسی طرح تازہ اور معطر ہوتے۔ آج رات اس کے ذہن میں ایسے خیالات نہیں تھے۔

عمر بن عبداللہ سوچ میں تھا۔ اور یادیں اتنی تیزی سے لوٹ رہی تھیں کہ وہ کانپ گیا۔ اسے آگ کی دیوار نظر آئی۔ اس رات کی یادوں نے ذہن پر یلغار کی۔ اس کے آنسو تھمتے ہی نہیں تھے اور اس کی داڑھی میں الجھتے جا رہے تھے۔ آٹھ برس قبل غرناطہ کی شکست نے بازی الٹ دی تھی۔ یہ پہلے سے ہی سب پر عیاں تھا اور نہ عمر اور نہ اس کے دوست اس پر حیران تھے۔ لیکن ہتھیار ڈالنے کی شرائط میں مسلمانوں کو جو اکثریت میں تھے ثقافتی اور مذہبی آزادی کی ضمانت دی گئی تھی بشرطیکہ وہ کاسٹیل حکمرانوں کی حاکمیت کو تسلیم کر لیں۔ تحریری طور پر اور گواہوں کے سامنے اقرار کیا گیا تھا کہ غرناطہ کے مسلمانوں کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہو گی اور نہ انہیں اپنے مذہبی فرائض کی ادائیگی سے روکا جائے گا نہ عربی تعلیم اور بول چال سے اور نہ ہی اپنے تہوار منانے سے۔ ہاں۔ عمر نے سوچا۔ ازابیلا کے پادریوں نے یہی وعدے کئے تھے تاکہ خون خرابے سے بچا جا سکے اور ہم نے ان کا اعتبار کیا۔ ہم کیسے اندھے ہو گئے تھے۔ شراب نے ہمارے ذہنوں کو مفلوج کر دیا ہو گا۔ ہم نے ان کی چکنی چپڑی باتوں اور وعدوں پر کیسے یقین کر لیا؟

معاہدہ پر دستخطوں کے وقت مقتدر امرا کی صف میں عمر بھی موجود تھا۔ اسے آخری سلطان ابوعبداللہ کی آخری رخصت نہیں بھولتی تھی۔ ایک کاسٹیلی نے اسے بوآبدل کہہ کر پکارا تھا اور اسے پچاراز کے ایک محل میں بھیج دیا گیا تھا۔ سلطان مڑا اور اس نے شہر پر ایک آخری نظر ڈالی۔ الحمرا کو دیکھ کر اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور بس۔ بالکل خاموش۔ کہنے کو تھا بھی کیا؟ اندلس میں وہ اپنی تاریخ کے انجام کو پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں باتیں کی تھیں۔ عمر اور اس کے ساتھی شکست تسلیم کرنے کو تیار تھے۔ اور پھر۔ جیسا کہ زبیدہ بار بار یاد دلاتی رہی۔ کیا اسلامی تاریخ حکومتوں کے عروج و

زوال سے نہیں بھری پڑی تھی؟ کیا خود بغداد وحشی تاتاریوں کے ہاتھوں تاراج نہیں ہوا تھا؟ یہ صحراؤں کی لعنت تھی۔ بدوؤں کا مقدر تھا۔ قسمت کی ستم ظریفی تھی۔ حدیث رسولؐ یا تو آفاقی ہے یا پھر کچھ بھی نہیں ہے۔

اچانک اسے اپنے چچا کا مرجھایا ہوا چہرہ نظر آیا۔ اس کا چچا۔ میکال الملک۔ اس کا چچا۔ قرطبہ کا بشپ۔ میگوئل الملک۔ وہ اترا ہوا چہرہ جس میں دکھ جھلکتا تھا اور جو نہ داڑھی میں چھپتا تھا نہ اس کی جھوٹی ہنسی میں۔ اماں جب بھی میکال کے بچپنے کا ذکر کرتی تو اس میں یہ فقرہ ضرور ہوتا "اس کے اندر شیطان تھا" یا "وہ ایک ایسے نل کی طرح تھا جسے شیطان کھولتا اور بند کرتا تھا"۔ ایسی باتیں پیار اور محبت سے کہی جاتی تھیں تاکہ ظاہر ہو کہ میکال بچپن میں کتنا شرارتی تھا۔ سب سے چھوٹا اور سب سے چہیتا بیٹا۔ یزید سے زیادہ مختلف نہیں۔ تو پھر ایسی کیا بات تھی کہ میکائل قرطبہ بھاگ گیا اور میگوئل بن گیا؟ بوڑھے چچا کی طنز بھری آواز ابھی تک عمر کے دماغ میں گونج رہی تھیں۔ "عمر! تمہیں پتہ ہے کہ تمہارے مذہب میں خرابی کیا ہے؟ ہمارے لئے یہ بہت آسان تھا۔ عیسائی رومن ایمپائر میں جذب ہونا چاہتے تھے چنانچہ وہ زیر زمین چلے گئے۔ روم کے تہہ خانے ان کی تربیت گاہ بنے۔ اور جب انہیں غلبہ حاصل ہوا تو پہلے ہی وہ اپنے لوگوں کے ساتھ مضبوط رشتے قائم کر چکے تھے۔ اور ہم؟ نبی اکرمؐ نے خالدؓ بن ولید کو بھیجا اور اس نے تلوار کے زور پر فتح حاصل کر لی۔ ہاں۔ صحیح ہے۔ اس نے بڑی فتوحات حاصل کیں۔ ہم نے دو مملکتوں کو تاراج کر دیا۔ ہر چیز ہماری آغوش میں آ گری ہم نے ممالک عرب' فارس اور کچھ باز نطینی علاقوں پر تسلط جما لیا۔ دوسری جگہوں پر ایسا نہ ہو سکا کیوں؟ ہمیں دیکھو ہم سات سو برس تک اندلس میں رہے اور پھر بھی ہم کوئی پائدار تعمیر نہ کر سکے اس کے ذمہ دار صرف عیسائی نہیں ہیں کیوں عمر!؟۔ قصور ہمارا ہے یہ ہماری فطرت میں ہے"۔

"ہاں' ہاں چچا میکال! میرا مطلب ہے میگوئل! قصور ہمارا بھی ہے لیکن اب اس پر سوچنے کا کیا فائدہ مجھے تو صرف آگ کی یہ دیوار نظر آ رہی ہے اور اس کے پیچھے اس گدھ کا بھوکا چہرہ۔ وہ اپنی فتح کا جشن منا رہا تھا۔ زیمنس کا عذاب۔ وہ ملعون پادری ازابیلا کی خاص ہدایات کے تحت غرناطہ بھیجا گیا ہے اس چڑیل کا وہ کٹر پادری (کنفیسر) جسے یہاں بھیجا گیا ہے کہ (ملکہ) کی بلاؤں کو دور کرے۔ وہ اسے اچھی طرح جانتی ہے اور اسے بھی ملکہ کی مرضی کا پوری طرح علم ہے۔ کیا تمہیں اس کی آواز نہیں سنائی دیتی؟ وہ بڑے مکر و فریب سے بڑی نرمی سے کہتا ہے مقدس باپ! میں غرناطہ کے کافروں سے پریشان ہوں۔ کبھی کبھی

میرا جی چاہتا ہے کہ انہیں مطیع بنانے کے لئے سب کو سولی پر چڑھا دوں انہیں صحیح راستہ پر لے آؤں۔ اس نے زیمنس کو غرناطہ کیوں بھیجا ہے؟ اگر انہیں اپنے عقائد پر اتنا ہی یقین ہے تو وہ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ نہ ماننے والے خود ہی مان جائیں گے؟

"کیا آپ بھول گئے ہیں کہ انہوں نے زیمنس دی سسرینوس کو غرناطہ کیوں بھیجا؟ اس لئے کہ ان کے خیال میں آرچ بشپ تلاویرا معاملات سے صحیح طریقہ سے نہیں نمٹ رہا تھا۔ تلاویرا ہمیں دلائل سے قائل کرنا چاہتا تھا۔ اس نے ہماری علمی کتابیں پڑھنے کے لئے عربی سیکھی۔ اس نے اپنے پادریوں کو بھی یہی ہدایت کی۔ اس نے انجیل اور چرچ کی تعلیمات (catechism) کا عربی میں ترجمہ کیا۔ ہمارے کچھ بھائی بند اس طرح ان کے قائل ہو گئے لیکن زیادہ نہیں اسی لئے اس نے زیمنس کو بھیجا۔ میرے بشپ چچا! میں نے پچھلے سال ہی آپ کو یہ تفصیل بتائی تھی مگر آپ جلد بھول گئے اگر وہ واقعی ہوشیاری سے کام لیتے اور آپ کو غرناطہ کا آرچ بشپ بنا دیتے تو آپ کیا کرتے؟ آپ کس حد تک جاتے میکال! کتنی دور میگوئل!؟

"میں اس مجلس میں موجود تھا جہاں زیمنس نے ہمارے عالموں اور قاضیوں کو مناظرے میں قائل کرنے کی کوشش کی تھی۔ کاش آپ بھی وہاں ہوتے۔ ایک پہلو سے آپ کو اپنے علماء پر فخر ہوتا۔ زیمنس تیز ہے' سمجھ دار ہے لیکن اس روز وہ کامیاب نہیں ہوا۔"

"جب ذکری بن موسیٰ نے نقطہ نقطہ جوابات دیئے تو خود زیمنس کے پادری بھی اس کو داد دینے لگے۔ آقائے کلیسہ کو غصہ آ گیا۔ اس نے دعویٰ کیا کہ ذکری بن موسیٰ نے مقدس مریم کی شان میں گستاخی کی ہے جبکہ ہمارے رفیق نے صرف یہ پوچھا تھا کہ عیسیٰؑ کے پیدا ہونے کے بعد بھی وہ کنواری کس طرح رہ سکتی ہے؟ آپ کو اس سوال کی منطق کا اندازہ ہو گا یا پھر آپ کی دینیات واضح حقائق کو تسلیم کرنے سے منع کرتی ہے؟"

"ذکری کو عقوبت خانہ میں لے جایا گیا اور اس پر اتنا ظلم ڈھایا گیا کہ وہ مذہب تبدیل کرنے پر تیار ہو گیا۔ اسی وقت ہم چلے آئے لیکن ہم نے زیمنس کی آنکھوں میں ایک چمک دیکھی جیسے کہ اس پر یہ انکشاف ہو گیا تھا کہ لوگوں کو عیسائی بنانے کا بہترین طریقہ صرف یہی ہے۔"

"اگلے روز تمام لوگوں کو حکم دیا کہ سڑکوں پر نکل آئیں۔ زیمنس دی سسروس نے۔ خدا اسے غارت کرے' ہمارے رسم و رواج اور ثقافت کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ صرف

اس ایک دن میں انہوں نے ہماری تمام لائبریریاں خالی کر دیں اور باب الرملا میں کتابوں کی ایک بلند دیوار کھڑی کر دی۔ انہوں نے ہمارے کلچر کو نذر آتش کر دیا۔ انہوں نے بیس لاکھ کتابیں جلا ڈالیں۔ آٹھ صدیوں کا اثاثہ ایک دن میں راکھ کا ڈھیر ہو گیا۔ انہوں نے ہر چیز نہیں جلائی۔ وہ بہرحال وحشی نہیں تھے صرف ایک مختلف ثقافت رکھتے تھے جسے وہ اندلس پر مسلط کرنا چاہتے تھے۔ ان کے اپنے علماء نے ان سے درخواست کی کہ تین سو کتابوں کو چھوڑ دیا جائے جن کا تعلق خصوصاً طب سے تھا۔ زیمنس نے یہ بات مان لی اس لئے کہ خود اس کو بھی اعتراف تھا کہ طب میں ہمارا علم عیسائی دنیا سے کہیں زیادہ تھا۔"

"یہ وہ آگ کی دیوار ہے جو ہر وقت میری آنکھوں کے سامنے رہتی ہے چچا! اسے دیکھ کر میں اپنے مستقبل کے لئے فکر مند ہو جاتا ہوں۔ جس آگ نے ہماری کتابوں کو جلایا ہے وہ ایک دن ہر اسی چیز کو بھسم کر ڈالے گی جو ہم نے اندلس میں تخلیق کی ہے۔ اس چھوٹے سے گاؤں سمیت جسے ہمارے بزرگوں نے تعمیر کیا تھا جہاں ہمارا اور آپ کا بچپن گزرا۔ اس کا نبیؐ کی فتوحات یا اسلام کے پھیلنے سے کیا تعلق ہے۔ بشپ یہ آٹھ سو سال پہلے کی بات ہے کتابوں کی دیوار تو ابھی پچھلے سال ہی جلائی گئی ہے"۔ اس اطمینان کے ساتھ کہ بحث میں اس کا پلہ بھاری رہا ہے عمر بن عبداللہ گھر لوٹ آیا اور اپنی بیوی کی خوابگاہ میں داخل ہوا۔ زبیدہ ابھی سوئی نہیں تھی۔

"وہ آگ کی دیوار عمر!؟"

وہ بستر پر بیٹھ گیا اور سر کی جنبش سے اسے جواب دیا۔ اس کی بیوی نے محسوس کیا کہ جیسے عمر کے کندھے جھک گئے ہیں۔ "تمہارے جسم کا یہ کھچاؤ میرے لئے تکلیف دہ ہے۔ یہاں لیٹ جاؤ۔ میں مالش کرتی ہوں" عمر نے اس کی بات مان لی اور اس کی بیوی نے بڑی مہارت سے اس کے جسم کے اینٹھے ہوئے حصوں پر ہاتھ رکھ دیئے وہ پتھر کی طرح سخت تھے اور اس کی انگلیوں نے ان کو نرم کرنا شروع کر دیا اور اسے محسوس ہوا کہ کھچاؤ کم ہونے لگا ہے۔

"ہند کے متعلق آپ میگوئل کو کیا جواب دیں گے؟"

"لڑکی کیا کہتی ہے؟"

"وہ کہتی ہے اس سے بہتر ہے وہ کسی گھوڑے سے شادی کر لے"

عمر کے چہرہ پر یکلخت ایک تبدیلی پیدا ہوئی وہ زور سے ہنسا۔ "اس کا ذوق ہمیشہ سے ہی اچھا ہے۔ بہرحال۔ یہی آپ کا جواب ہے"

"لیکن آپ اس بشپ کو کیا بتائیں گے؟"

"میں چچا میگوئل سے کہوں گا کہ یو آن کیلئے اپنا شریک حیات حاصل کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ کہ وہ پادری ہو جائے اور کلیسائی ذمہ داریاں سنبھال لے۔"

زبیدہ کچھ مطمئن ہو کر کھلکھلائی۔ عمر کی طبیعت بحال ہو گئی تھی۔ وہ جلد ہی نارمل ہو جائے گا لیکن وہ غلطی پر تھی۔ کتابوں کی دیوار ابھی تک جل رہی تھی۔

"مجھے یقین نہیں کہ عیسایت قبول کئے بغیر وہ ہمیں اندلس میں رہنے دیں گے۔ ہند کا یو آن سے شادی کرنا ایک مذاق ہے لیکن میں بنو حزیل اور ان لوگوں کی طرف سے فکر مند ہوں جو صدیوں ہمارے ساتھ رہے ہیں اور جنہوں نے ہماری خدمت کی ہے"

"تم سے زیادہ کسے پتہ ہے کہ میں مذہبی نہیں ہوں۔ وہ تمہاری توہمات کی ماری بی دایا اچھی طرح سے یہ بات جانتی ہے۔ وہ ہمارے یزید سے کہتی رہتی ہے کہ اس کی ماں مذہب کا احترام نہیں کرتی گو میں کم از کم ظاہرداری تو کرتی ہوں۔ رمضان میں روزے رکھتی ہوں۔ میں ____"

"لیکن سب جانتے ہیں کہ تم اپنی صحت کے لئے روزے رکھتی ہو۔ یہ کوئی راز نہیں۔"

"اڑا لو میرا مذاق، لیکن بچوں کی خوشی اہم ہے پھر بھی..."

عمر پھر سنجیدہ ہو گیا "ہاں"

"لیکن میرے اندر کوئی چیز ہے جو مجھے مذہب بدلنے سے روکتی ہے یہ سوچ کر ہی مجھے غصہ آنے لگتا ہے۔ مجھ پر جنون سوار ہو جاتا ہے۔ اپنے اوپر صلیب کا نشان بنانے اور یہ تصور کرنے سے پہلے کہ میں انسانی گوشت کھا رہا ہوں اور خون پی رہا ہوں میں مر جانا بہتر سمجھتا ہوں۔ ان کی رسومات کی اس مردم خوری سے مجھے کراہت آتی ہے۔ اس کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ تمہیں یاد ہے کہ جب صلیبی سپاہیوں نے جنگی قیدیوں کو بھون کر کھایا تھا تو عربوں کو کیسا دھچکا لگا تھا۔ میری تو یہ سوچ کر ہی طبیعت خراب ہو جاتی ہے لیکن یہ ان کے اعتقاد کا حصہ ہے۔"

"تم بھی عجب تضادات میں گھری ہوئی عورت ہو۔ زبیدہ بن قدوس! ایک ہی سانس میں تم یہ بھی کہتی ہو کہ سب سے زیادہ تمہیں بچوں کی خیریت مطلوب ہے اور اس واحد راستہ کی بھی مخالفت کرتی ہو جو انہیں ان کے اپنے آبائی گھر میں تحفظ کی ضمانت دے سکتا ہے۔"

"اس کا خوشی سے کیا تعلق ہے؟ تمہارے تمام بچے، یزید سمیت ازابیلا کے سپاہیوں

سے لڑنے کیلئے تیار ہیں۔ اگر تمہارا ڈھل مل ایمان میگوئل کے سامنے ہتھیار ڈال بھی دے تو پھر بھی تم اپنے بچوں کو کیسے قائل کرو گے؟ ان کے لئے تمہارا مذہب بدلنا اتنا ہی بڑا صدمہ ہو گا جتنی یہ آگ کی دیوار"

"یہ مذہبی نہیں' سیاسی معاملہ ہے۔ میں اللہ کے سامنے دل صاف رکھوں گا۔ یہ محض دکھاوا ہو گا"

"اور جب عیسائی امرا دعوتوں پر آئیں گے تو کیا تم ان کے ساتھ سور کھا لو گے؟"

"شاید۔ لیکن کبھی دائیں ہاتھ سے نہیں۔"

زبیدہ ہنسی لیکن وہ بھی سہمی ہوئی تھی اسے محسوس ہوا کہ عمر نے تقریباً فیصلہ کر لیا ہے۔ آگ کی دیوار نے اس کے ذہن کو متاثر کیا ہے۔ جلد ہی وہ بھی میگوئل کے نقش قدم پر چلنے لگے گا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر زبیدہ کو تعجب میں ڈال دیا تھا۔

"کیا میں نے تمہیں بتایا ہے کہ جس روز وہ ہمارے ورثہ کو تباہ کر رہے تھے تو ہمارے منہ سے کیا کلمے نکل رہے تھے؟ اور ہم سینکڑوں کی تعداد میں تھے"

"نہیں۔ تم بھولتے ہو کہ غرناطہ سے لوٹنے کے بعد پورے ہفتہ بھر تم بالکل خاموش رہے تھے۔ تم نے کسی سے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ یزید تک سے نہیں۔ میں نے التجائیں کیں لیکن تمہیں بلوا نہ سکی۔" "خیر چھوڑو۔ زبیدہ! اس رات ہم بچوں کی طرح روئے۔ اگر ہمارے آنسوؤں کو جمع کیا جاتا تو وہ اس آگ کو بجھا دیتے لیکن اچانک میں نے محسوس کیا کہ میں وہ چیزیں ورد کر رہا تھا جو بچپن میں سیکھی تھیں۔ پھر مجھے ایک زبردست شور سنائی دیا اور مجھے اندازہ ہوا کہ صرف مجھے ہی شاعر کے وہ الفاظ یاد نہیں تھے۔ یکجہتی کے احساس نے مجھے ہمت دی جو اب بھی مجھ میں ہے۔ میں یہ سب کچھ تمہیں اس لئے بتا رہا ہوں کہ میں کبھی بھی اپنی مرضی سے مذہب تبدیل نہیں کروں گا۔ تمہیں یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے۔"

زبیدہ نے اپنے شوہر کو گلے لگا لیا اور اس کی آنکھوں کے بوسے لئے

"شاعر کے الفاظ کیا تھے؟"

عمر نے سسکیوں کو دباتے ہوئے سرگوشی کے انداز میں کہا:

"تم کاغذ جلا سکتے ہو
لیکن جو کاغذوں میں ہے اسے نہیں جلا سکتے
یہ میرے سینہ میں محفوظ ہے

میں جہاں جاتا ہوں یہ میرے ساتھ جاتا ہے
میں وارد ہوتا ہوں تو یہ بھی وارد ہوتا ہے
اور میرے ساتھ ہی قبر میں چلا جائے گا"

زبیدہ کو یاد آیا اس کا ایک اتالیق جو پیدائشی شک پرست sceptic تھا سینکڑوں بار اسے یہ کہانی سنا چکا تھا۔ یہ اشعار ابن حیفم کے تھے جو پانچ سو سال قبل پیدا ہوا تھا۔ اس وقت جب اسلامی ثقافت نے براعظم یورپ کے تاریک گوشوں کو منور کرنا شروع کیا ہی تھا۔ ابن حیفم اندلس کا سب سے عظیم اور جرات مند شاعر تھا۔ وہ مورخ بھی تھا اور سوانح نگار بھی اور چار سو کتابوں کا مصنف تھا۔ وہ سچ کا پرستار تھا مگر لوگوں کا لحاظ نہیں کرتا تھا روائتی اسلام کے مبلغوں پر اس کے سخت حملوں کی وجہ سے جامع مسجد میں جمعہ کی نماز کے بعد اس پر کفر کا فتویٰ لگایا گیا۔ جب اشبیلیہ میں علماء نے اس کی کچھ کتابوں کو نذر آتش کیا تو اس نے یہ اشعار پڑھے۔

"مجھے بھی اس کے متعلق معلوم ہے مگر وہ غلط ثابت ہوا۔ کلیسائی عدالتیں اس سے ایک قدم آگے جاتی ہیں۔ خیالات کو نذر آتش کرنے سے ان کی تسلی نہیں ہوتی۔ وہ اسکے خالق کو بھی جلا دیتے ہیں۔ اس میں ایک منطق ہے ہرنئی صدی میں نئے اضافے ہوتے ہیں
"

اس نے اطمنان کا سانس لیا کہ اس کا شوہر جلد بازی میں کوئی ایسا فیصلہ نہیں کرے گا جس کے لئے اسے ساری عمر پچھتانا پڑے۔ اس نے ہمت افزائی کے لئے اس کا سر تھپتھپایا۔ مگر وہ پہلے ہی سو چکا تھا۔

کوششوں کے باوجود زبیدہ کے دل کو سکون نہیں ہوا اور وہ سو نہ سکی۔ اب اس کے خیالات اس کے بڑے لڑکے زہیر کے انجام پر مرکوز ہو گئے۔ خوش قسمتی سے زخم کچھ ایسا زیادہ نہیں تھا۔ اس وقت تو نہیں۔ لیکن اس کی تیز مزاجی اسے کسی بھی مشکل میں ڈال سکتی تھی۔ غرناطہ میں بہت خطرہ تھا۔ زبیدہ نے سوچا کہ اس کا بہترین حل یہ ہے کہ اس کی شادی اپنی بھتیجی خدیجہ سے کر دے جو اپنے خاندان کے ساتھ اشبیلیہ میں رہتی تھی۔ یہ بڑا اچھا جوڑا رہے گا۔ گاؤں والے کسی تقریب کے منتظر تھے اور اعلیٰ پیانہ پر شادی کا انعقاد سب کی تفریح کا باعث ہو گا اور افسروں کو بھی کوئی تشویش نہ ہو گی۔ اور کل کے ان خوشگوار لمحات کے معصومانہ تصور نے خاتون خانہ کو میٹھی نیند سلا دیا۔

باب 2

الحزیل میں ستمبر کی ایک صبح کتنی مسحور کن کتنی شاندار ہے۔ سورج ابھی نکلا نہیں ہے لیکن اس کی کرنوں نے آسمان کو منور کر دیا ہے اور افق پر سنہرے نارنجی رنگ بکھر گئے ہیں۔ ہر شے نور میں ڈوبی ہوئی ہے اور ہر طرف ایک سکوت ہے۔ ابھی پرندے چہچہانا شروع کر دیں گے اور گاؤں میں موذن کی آواز اہل ایمان کو نماز کی دعوت دے گی گاؤں کے تقریباً دو ہزار باسی ان آوازوں سے مانوس ہیں۔ وہ بھی جو مسلمان نہیں ہیں موذن کی پابندی اوقات کو سراہتے ہیں۔ جہاں تک دوسروں کا تعلق ہے سب اس آواز پر لبیک نہیں کہتے۔ آقا کے گھر میں صرف اماں جاء نماز پھیلاتی ہے اور دن کے کاموں میں مصروف ہو جاتی ہے۔

آدھے سے زیادہ گاؤں والے زمینوں پر کام کرتے ہیں۔ یا اپنی یا بنو حزیل کی زمینوں پر۔ باقی جلاہے ہیں جو گھر پر یا حویلی میں کام کرتے ہیں۔ مرد ریشم کے کیڑے پالتے ہیں اور عورتیں مشہور زمانہ حزیل ریشم تیار کرتی ہیں جس کی مانگ سمرقند تک ہے۔ پھر کچھ دکاندار ہیں۔ ایک لوہار' ایک موچی' ایک درزی' ایک بڑھئی بس یہ سارا گاؤں ہے۔ حویلی میں کام کرنے والے سوائے اماں' بونے اور مالیوں کے سب رات کو گاؤں میں اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے ہیں۔

زہیر بن عمر تازہ دم ہو کر صبح سویرے ہی اٹھ گیا۔ وہ زخم کو تو بھول گیا تھا لیکن اس کی تکلیف سے اس کا سر ابھی کچھ بھاری تھا۔ اس نے کھڑکی سے باہر جھانکا اور اسے آسمان کے رنگ بہت خوبصورت لگے۔ گاؤں سے آدھے میل کے فاصلہ پر ایک چھوٹی سی پہاڑی تھی جس کی چوٹی کے قریب چٹانوں کے درمیان ایک غار تھا۔ سب اسے بڈھے بابا کا غار

کہتے تھے- پہاڑی پر غار میں ایک چھوٹا سا سفیدی کیا ہوا کمرہ تھا- اس کمرے میں ایک درویش رہتا تھا جو مقفیٰ نثر میں ترنم سے شعر پڑھتا تھا اور غرناطہ کے زوال کے بعد سے زہیر اس کی صحبت کو بہت اہمیت دینے لگا تھا-

کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کہاں سے آیا ہے اسکی کتنی عمر ہے اور وہ کب وہاں پہنچا تھا؟ زہیر کا یہی خیال تھا- عمر کو وہ غار تو یاد تھا لیکن اسے یقین تھا کہ اس کے بچپنے میں یہ خالی تھا بلکہ درحقیقت کسان اسے بیٹھک کے طور پر استعمال کرتے تھے- خود بابا کو بھی اپنی موجودگی کو پراسرار بنانے میں مزہ آتا تھا- جب بھی زہیر اس سے کوئی ذاتی سوال کرتا وہ شعر پڑھ کر بات ٹال جاتا- اس کے باوجود زہیر کو لگتا تھا کہ یہ مکار سچا ہے-

اس صبح اس کی بڑی خواہش ہوئی کہ وہ غار والے بابا سے گفتگو کرے- وہ اپنے کمرے سے نکلا اور حمام میں داخل ہو گیا- غسل کرتے ہوئے اس کا جی چاہا کہ یزید اٹھ کر آجائے اور اس سے باتیں کرے- انہیں نہاتے ہوئے باتیں کرنے میں بہت مزہ آتا تھا- یزید کو اس لئے کہ زہیر بیس منٹ تک وہاں سے ہل نہیں سکتا تھا اور زہیر کو اس لئے کہ وہ یوں اس شکرے کو اتنے قریب سے دیکھ سکتا تھا-

"حمام میں کون ہے؟"

"یہ اماں کی آواز تھی- اس کا لہجہ تحکمانہ تھا-

"میں ہوں- اماں"

"اللہ رکھے- تم اٹھ گئے ہو؟ تمہارا زخم...."

زہیر کی ہنسی کی آواز سن کر وہ درمیان میں ہی رک گئی- وہ حمام سے نکلا اور کپڑے پہن کر صحن میں آگیا-

"زخم- مذاق کرتی ہو- اماں! ایک عیسائی احمق نے مجھ پر چھوٹے سے چاقو سے وار کیا تھا اور تم نے مجھے شہادت کے درجہ تک پہنچا دیا-"

"ابھی بونا باورچی خانہ میں نہیں آیا ہے- میں تمہارے لئے ناشتہ بناؤں؟"

"ہاں- لیکن میری واپسی پر- میں بابا کے غار تک جا رہا ہوں-"

"مگر گھوڑے پر زین کون چڑھائے گا؟"

"تم میری پیدائش سے مجھے جانتی ہو- تمہارا خیال ہے میں گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر سوار نہیں ہو سکتا؟"

"اس ابلیس کو میری طرف سے کہنا_ اسے بتانا کہ مجھے معلوم ہے کہ اسی نے ہماری

تین مرغیاں چرائی تھیں- اس سے کہنا کہ اگر اس نے پھر ایسی حرکت کی تو میں یہاں سے کچھ آدمی لے کر اسے سرعام کوڑے لگواؤں گی-"

زہیر مزے لیتے ہوئے ہنسا اور اس کا سر تھپتھپایا- "بابا ایک چور؟ اماں کیسی احمقانہ باتیں کرتی ہے"

"تمہیں پتہ ہے آج میں کیا ناشتہ کروں گا؟"

"کیا؟"

"مشروب جنت"

"صرف اس شرط پر کہ تم میری طرف سے اس ابلیس کو ڈانٹ پلاؤ"

"ضرور"

پندرہ منٹ بعد زہیر اپنے چہیتے گھوڑے خالد پر سوار بابا کے غار کی طرف رواں تھا- وہ راستے میں دیہاتیوں کی طرف ہاتھ ہلاتا جاتا جو لکڑی کے ساتھ بندھے ہوئے بڑے بڑے رومالوں میں اپنا کھانا لئے کھیتوں کی طرف جا رہے تھے- کچھ نے احتراماً سر ہلائے اور چلتے رہے- دوسرے رک گئے اور مسکرا کر اسے سلام کیا- غرناطہ میں اس کے جھگڑے کی خبر گاؤں میں پھیل گئی تھی اور انہوں نے بھی اسے داد دی جو کسی بات کو کبھی مانتے ہی نہیں- اس میں کوئی شک نہیں کہ زہیرالفحل- جسے زہیر گھوڑا کہا جاتا تھا- گاؤں میں سے سرپٹ دوڑتا ہوا بڑا اچھا لگ رہا تھا دور جاتے ہوئے وہ آہستہ آہستہ محض ایک سایہ سا نظر آنے لگا اور زمین کی ناہمواری کے سبب کبھی نظر آتا اور کبھی آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا-

بابا نے گھوڑے اور اس کے سوار کو پہاڑی پر چڑھتے ہوئے دیکھا اور مسکرایا- عمر ابن عبداللہ کا بیٹا ایک بار پھر مشورہ کرنے آیا تھا- اس کے بار بار آنے سے اس کے والدین یقیناً ناخوش ہوں گے- "اب اسے کیا چاہئے؟"

"اسلام و علیکم- بابا"

"وعلیکم السلام- ابن عمر کیسے آنا ہوا؟"

"رات میں غرناطہ گیا تھا"

"میں نے سنا ہے"

"اور ...؟"

بڈھے نے اپنے شانے جھٹکائے

"میں نے صحیح کیا یا غلط؟"

زہیر کو بڑا لطف آیا جب اس نے شعروں میں جواب دیا!

"باطل نے دنیا کو اس قدر خراب کر دیا ہے کہ برسرپیکار فرقے ایک دوسرے کی مقدس کتابوں کی توہین کرتے ہیں لیکن کیا نفرت انسان کے خمیر میں نہیں ہے۔؟
گرجا اور مسجد ساتھ ساتھ تعمیر ہوئے ہیں۔"

زہیر نے پہلے یہ اشعار نہیں سنے تھے۔ اس نے داد دی۔ "یہ تمہارے ہیں؟"

"پاگل لڑکے۔ غافل انسان۔ کیا تم ایک عظیم استاد کی آواز نہیں پہچانتے؟ ابوالعلی معری!"

"لیکن کہتے ہیں کہ وہ تو کافر تھا"

"کہتے ہیں! کہتے ہیں! کس میں جرات ہے؟ میرے سامنے تو کہیں!"

"ہمارے علماء دین۔ ہمارے عالم...."

اس پر بڈھا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ کمرے سے نکلا۔ حیرت میں ڈوبا ہوا زہیر پیچھے پیچھے چلا۔ اور وہ بڑے سپاہیانہ انداز میں پہاڑ کی چوٹی پر کھڑے ہو کر بہت بلند آواز میں یہ اشعار پڑھنے لگا:

"مذہب کیا ہے؟ ایک باندی جسے اس طرح پردے میں رکھا گیا ہے کہ کوئی اسے دیکھ نہ سکے اس کی شادی کے قیمتی تحائف اور اس کا جہیز اس کی خواہش کرنے والے کو حیران کر دیتے ہیں وہ تمام اچھی باتیں جو میں نے منبر سے سنی ہیں۔ میرے دل نے ان کا ایک لفظ بھی قبول نہیں کیا۔"

زہیر نے دانت نکالے

"یہ بھی المعری ہے؟"

بڈھے نے ہاں میں سر ہلایا اور مسکرایا۔

"میں نے اس کی ایک کتاب سے اتنا کچھ سیکھا ہے جتنا تمام دینی کتب سے نہیں سیکھا۔ میرا مطلب ہے تمام کتابوں سے"

"یہ کفر ہے"

"سیدھی سادھی حقیقت ہے"

زہیر اس کی اس ضعیف الاعتقادی پر حیران نہیں ہوا۔ اس نے وہ صرف اتنا ظاہر کیا کہ اسے کچھ تعجب ہوا ہے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ بڈھا یہ سمجھے کہ اسے بڑی آسانی سے ایک مرید ہاتھ آ گیا ہے۔ غرناطہ میں نوجوانوں کی ایک ٹولی تھی۔ زہیر ان سب سے واقف تھا۔

ان میں سے ایک اس کا بچپن کا دوست تھا جو کم از کم مہینے میں ایک بار گھوڑے پر بیس میل کا سفر کر کے اس غار تک آتا اور فلسفہ' تاریخ' موجودہ بحران اور مستقبل کے متعلق لمبی لمبی بحثیں کرتا۔ ہاں ہمیشہ مستقبل کے متعلق۔ ان کو جو تھوڑی بہت عقل کی باتیں آ گئی تھیں ان کی وجہ سے انہیں غرناطہ میں اپنے دوستوں پر بحث میں برتری حاصل رہتی اور کبھی کبھی وہ اپنے بزرگوں کو بھی کسی بڑی چبھتی ہوئی بات سے اتنا متاثر کرتے کہ اگلے جمعہ کو ہر مسجد میں اس کا ذکر ہوتا۔ اپنے دوست ابن بصیر سے جو فلسفیوں کے اس گروہ کا لیڈر تھا اس نے پہلی بار اس درویش کی ذہنی صلاحیتوں کی بابت سنا تھا جو زندیق۔ یعنی شکی کے نام سے لکھتا تھا۔

پہلے اسے ان سنی سنائی باتوں پر یقین آ گیا تھا کہ یہ بوڑھا ایک خبطی تھا جسے شہر سے نکال دیا گیا تھا اور جو چرواہوں کے رحم وکرم پر زندہ تھا۔ اماں تو اس سے بھی زیادہ اس بات پر مصر تھی کہ وہ بالکل پاگل ہو گیا ہے اور اس سے اور اس کی شیطانی حرکتوں سے کوئی واسطہ نہیں رکھنا چاہئے۔ زہیر نے سوچا کہ اگر وہ صحیح کہتی ہے تو مجھے یہاں ایک حاضر جواب دانا شخص کی جگہ ایک قطعی احمق آدمی کا سامنا ہوتا لیکن اس سے یہ دشمنی کیوں اور کب پیدا ہوئی۔ یہ سوچ کر وہ مسکرایا۔

جب زہیر وہاں پہنچا تو بڈھا ایک پیالے میں سے بھیگے ہوئے بادام نکال کر چھیل رہا تھا۔ اب وہ انہیں پیسنے لگا اور قطرہ قطرہ پانی ملاتا رہا یہاں تک کہ وہ ایک گاڑھی کھیر میں تبدیل ہو گئے۔ اس نے نظریں اٹھائیں اور زہیر کو مسکراتے ہوئے دیکھا۔

"بہت خوش ہو۔ کیا بات ہے؟ شہر میں جو تم نے حرکت کی وہ حماقت تھی۔ یہ تو سیدھی سادھی بھڑکانے والی بات تھی۔ خوش قسمتی سے تمہارے والد اتنے ناسمجھ نہیں ہیں۔ اگر تمہارے ملازموں نے عیسائی کو مار دیا ہوتا تو تم سب کو گھیر کر وہ راستے میں ہی ختم کر دیتے۔"

"اوہ خدایا! تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

بڈھے نے کوئی جواب نہیں دیا۔ لیکن کھیر کو پتھر کے پیالے سے نکال کر پتیلی میں ڈال دیا جس میں دودھ پہلے ہی سے موجود تھا۔ اس میں کچھ جنگلی شہد ملایا۔ الائچیاں ڈالیں اور دارچینی کا ایک ٹکڑا بھی ڈال دیا۔ پھر آگ دہکائی۔ منٹوں میں ابال آ گیا۔ اس نے آگ پر راکھ ڈال کر اسے کم کر دیا اور ہلکی آنچ پر یہ کھیر پکنے کے لئے چھوڑ دی۔ زہیر خاموشی سے یہ سب کچھ دیکھتا رہا اور اس کی خوشبو کے مزے لیتا رہا۔ پھر بڈھے نے پتیلی اٹھائی اور لکڑی

کے چمچے سے کھیر کو خوب ہلا کر اس پر باریک پسا ہوا بادام چھڑک دیا۔ پھر اسے مٹی کے پیالوں میں انڈیلا اور ایک پیالہ زبیر کو دے دیا۔ نوجوان نے مزے لے لے کر اسے پیا اور خوشی سے چلا اٹھا!

"آب حیات۔ جنت میں یہی مشروب ملتا ہو گا"

زندیق نے اس تعریف پر خوش ہو کر کہا کہ جنت میں تو انہیں اس سے بھی بہتر مشروب ملتے ہوں گے۔

"لیکن میں نے تو آج تک ایسے مزے کی چیز نہیں چکھی..."

اس نے بات کو ادھورا چھوڑ دیا اور پیالہ اس کے سامنے زمین پر رکھ دیا۔ اسے یاد آیا کہ یہ مزہ اس نے پہلے بھی چکھا تھا۔ لیکن کہاں؟ زبیر نے غور سے بڈھے پر نظر کی۔ بڈھے نے کہا:

"کیا بات ہے؟ بادام کم ہیں؟ شہد زیادہ ہے؟ مجھے معلوم ہے کہ اس طرح مزہ خراب ہو جاتا ہے لیکن میں نے اسے بہت اچھی طرح بنایا ہے۔ اسے پی لو۔ دوست! یہ رومی دیوتاؤں کی شراب نہیں ہے یہ دماغ کے لئے بہت اچھا شربت ہے۔ غالباً سب سے پہلے ابن سینا نے اس بات پر زور دیا تھا کہ بادام ہمارے ذہن کو تیز کرتے ہیں۔"

زبیر نے فورا اندازہ لگا لیا کہ بڈھا بات بنا رہا تھا۔ لیکن اس سے چوک ہو گئی تھی زبیر کو اب یاد آیا کہ اس نے یہ مشروب کہاں پیا تھا۔ بڑے چچا میگوئل کے گھر۔ قرطبہ کی جامع مسجد کے قریب۔ بڈھے کا ضرور اس سے کوئی تعلق ہو گا۔ زبیر کو لگا کہ اب راز کھلنے لگا ہے۔ لیکن ابھی کچھ واضح نہیں تھا۔ بڈھے نے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے شخص کے چہرہ کے اتار چڑھاؤ سے اندازہ لگایا کہ اس کا ایک راز فاش ہونے والا ہے۔ پیشتر اس کے کہ وہ موضوع کو بدلتا اس کے مہمان نے پہل کی'

"اماں نے تمہارے لئے ایک پیغام بھیجا ہے"

"اماں' اماں' کیا اماں' کون اماں؟ میں کسی اماں کو نہیں جانتا"

"میرے والد کی انا وہ ہمیشہ سے ہمارے ساتھ رہتی ہے۔ سارا گاؤں اسے جانتا ہے۔ اور تم جسے ہر بات کے جاننے کا دعویٰ ہے۔ تم اسے نہیں جانتے؟ یہ ماننے والی بات نہیں ہے۔"

"اب تم نے وضاحت کی تو میری سمجھ میں آیا۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں وہ کون ہے اور وہ کیسے ہر بات میں اپنی ٹانگ اڑاتی ہے۔ کیا بات ہے اس کی؟"

"اس نے کہا کہ میں تمہیں بتا دوں کہ اسے معلوم ہے کہ ہماری انڈے دینے والی تین مرغیاں کس نے چرائی ہیں؟"

بڈھا بڑے زور سے ہنسا۔ وہ اور چور؟

"اس نے کہا ہے کہ اگر دوبارہ تم نے ایسا کیا تو سارے گاؤں کے سامنے تمہیں مار پڑے گی"

"کیا تمہیں یہاں اس غار میں مرغیاں یا انڈے دکھائی دے رہے ہیں؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ اگر تمہیں گھر سے کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے کہو۔ وہ ایک گھنٹے کے اندر اندر پہنچ جائے گی۔ میں تو صرف پیغام دے رہا تھا۔"

"مشروب پیو۔ اور گرم کروں؟"

زبیر نے پیالہ اٹھایا اور ایک گھونٹ میں چڑھا گیا۔ اس نے بڈھے کو غور سے دیکھا۔ وہ ساٹھ سے اوپر تھا۔ شاید پینسٹھ سال کا وہ ہفتہ میں ایک بار سر منڈاتا تھا۔ اس وقت جو اس کے سر پر سفید ٹنڈ نظر آ رہی تھی اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ ابھی وہ گاؤں میں نائی کے پاس نہیں گیا ہے۔ اس کی ناک چھوٹی مگر نکیلی تھی۔ کسی پرندے کی چونچ کی طرح۔ اس کے زیتونی خاکی چہرے پر جھریاں پڑی ہوئی تھیں۔ موسم کے ساتھ اس کے چہرے کا رنگ بدل جاتا تھا۔ اس کی آنکھیں سب سے زیادہ نمایاں تھیں۔ وہ روایتی طور پر بڑی بڑی یا خوبصورت نہیں تھیں۔ بلکہ اس کے برعکس ان کے چھوٹے ہونے میں ایک سحر تھا۔ خاص طور پر جب وہ زور زور سے بحث کرتا تو وہ اندھیرے میں دیئے کی طرح جلنے لگتیں جیسا اس کے دشمن کہتے تھے کہ وہ بولائی ہوئی بلی کی آنکھوں کی طرح کی ہیں۔

اس کی سفید داڑھی بڑی نفاست سے تراشی ہوئی تھی۔ کسی درویش کے لئے یہ نفاست کچھ ذرا زیادہ ہی تھی۔ شاید یہ اس کے ماضی کی عکاس تھی۔ عام طور پر وہ ایک ڈھیلی ڈھالی شلوار اور ایسی ہی قمیض پہنتا تھا۔ سردیوں میں اوپر کمبل ڈال لیتا تھا۔ آج جب سورج اس کی کٹیا کے اندر چمک رہا تھا وہ بغیر قمیض کے بیٹھا ہوا تھا۔

اس کی چھاتی کی جھریوں سے اس کی صحیح عمر کا اندازہ ہوتا تھا۔ وہ واقعی بوڑھا تھا۔ لیکن کتنا بوڑھا اور وہ یوں بت بنا خاموش کیوں بیٹھا رہتا تھا اس کی کھلی ڈھلی طبیعت کا کوئی لگاؤ نہیں تھا اس چرب زبانی سے جس سے وہ زبیر کے ان سوالوں کا جواب دیتا جو اس کی اصلیت معلوم کرنے کے لئے کیے جاتے۔ گو کسی جواب کی امید نہیں تھی پھر بھی عمر بن عبداللہ کے بیٹے نے ایک بار اور پوچھا۔

"تم کون ہو۔ بابا؟"

"یعنی تمہیں واقعی معلوم نہیں؟"

زہیر کو تعجب ہوا۔ "کیا مطلب؟"

"کیا تمہاری اماں نے تمہیں کچھ نہیں بتایا' واقعی نہیں؟ میں تمہارے چہرے سے اندازہ لگا سکتا ہوں۔ کیسی عجیب بات ہے۔ تو انہوں نے طے کر لیا ہے کہ خاموش رہیں گے۔ تم اپنے والدین سے کیوں نہیں پوچھتے؟ وہ میرے متعلق سب کچھ جانتے ہیں۔ یوں تمہارا تجسس ختم ہو سکتا ہے۔"

"کیا بڑے چچا میگوئل کو پتہ ہے کہ تم کون ہو؟"

بوڑھے کے چہرے پر زردی چھا گئی۔ اسے دکھ ہوا۔ اس کی نظریں باداموں کے مشروب پر جم گئیں اور وہ خیالوں میں ڈوب گیا۔ ایک دم سے اس نے نظریں اٹھائیں:

"زہیر الفحل۔ تمہاری عمر کتنی ہے؟"

زہیر جھینپ گیا۔ زندیق کے منہ سے اسے اپنا یہ گھریلو نام اسے گالی کی طرح لگا۔

"اگلے مہینہ میں 23 برس کا ہو جاؤں گا"

"ہاں۔ اور تمہیں گاؤں والے الفحل کیوں کہتے ہیں؟"

"شاید اس لئے کہ مجھے شہسواری پسند ہے۔ میرا باپ بھی جب مجھے خالد پر سوار دیکھتا ہے تو یہی کہتا ہے کہ شاید میں اور گھوڑا ایک ہی ہیں"

"بکواس۔ فضولیات۔ کیا تمہیں بھی ایسا ہی لگتا ہے؟"

"نہیں۔ بالکل نہیں۔ لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ میں صرف خالد کو ہی نہیں بلکہ کسی بھی گھوڑے کو گاؤں کے ہر آدمی سے زیادہ تیز دوڑا سکتا ہوں۔"

"ابن عمر! ایک بات سمجھ لو۔ تمہیں الفحل کہنے کی یہ وجہ نہیں ہے"

زہیر پریشان ہو گیا کیا بوڑھا اپنی اصلیت چھپانے کے لئے کوئی اور چال چل رہا تھا؟

"نوجوان! تمہیں پتہ ہے میں کیا کہہ رہا ہوں؟ یہ صرف تمہاری شہ سواری کی بات نہیں ہے۔ جب موقع ملے تو تم ان کی عورتوں پر بھی چڑھ دوڑتے ہو۔ مجھے خبر ملی ہے کہ تم گاؤں کی کنواریوں کی عصمتیں بھی خراب کرتے ہو۔ بتاؤ یہ سچ ہے۔"

زہیر غصہ سے کھڑا ہو گیا۔

"یہ جھوٹ ہے۔ بہتان ہے۔ میں نے کبھی کسی لڑکی سے زبردستی نہیں کی ہے جو بہتان لگاتا ہے میں اس سے مقابلہ کے لئے تیار ہوں۔ یہ کوئی مذاق نہیں ہے؟"

"یہ کس نے کہا ہے کہ تم زبردستی کرتے ہو؟ یہ تو تمہارا حق ہے۔ اس میں زبردستی کا کیا سوال؟ اگر ذہن کھلا نہ ہو تو کھلی ٹانگوں کا کیا فائدہ' تمہیں میری بات پر اتنا غصہ کیوں آیا' تمہارا باپ ایک شریف انسان ہے۔ وہ لہو و لعب میں نہیں پڑتا لیکن اس طرح کے واقعات تمہارے خاندان میں صدیوں سے ہو رہے ہیں۔ جوشیلے احمق! بیٹھ جاؤ۔ سنا نہیں؟ بیٹھ جاؤ۔"

زہیر نے اس کا کہا مانا

"تم ابن حد۔ موچی کو جانتے ہو؟"

زہیر اس سوال سے گھبرا گیا۔ اس نیک آدمی کا اس قسم کی گفتگو میں کیا ذکر؟ لیکن اس نے ہاں میں سر ہلایا۔ اگلی مرتبہ جب اس سے ملو تو اس کے چہرے کو غور سے دیکھنا۔ شاید تمہیں کوئی مشابہت نظر آئے۔

"کس سے؟"

"خاندانی مشابہت۔ بس"

"کونسا خاندان؟"

"بھئی۔ تمہارا خاندان۔ بنی حزیل کی مشابہت پر غور کرنا"

"خبطی بڈھے۔ ابن حد یہودی ہے۔ اس کے آباؤاجداد کی طرح...."

"اس کا اس بات سے کیا تعلق ہے؟ اس کی ماں گاؤں کی سب سے خوبصورت عورت تھی۔ تمہارے پردادا نے ایک روز اسے دریا پر نہاتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ وہ انتظار کرتا رہا اور جب وہ نہا چکی تو اس کو دبوچ لیا۔ ابن حد اس کا نتیجہ ہے۔ جو دراصل ابن محمد ہے۔"

زہیر نے قہقہہ لگایا۔ کم از کم بزرگ سپاہی کا ذوق اچھا تھا۔ "بہرحال میں نہیں سوچ سکتا کہ وہ..." "الفحل" بڈھے نے لقمہ دیا۔ زہیر رخصت کے لئے کھڑا ہوا۔ سورج چڑھ آیا تھا۔ اور اسے اماں کا آسمانی جنتی مشروب یاد آیا۔ بڈھا ایک مرتبہ پھر اسے چوٹ دے گیا تھا۔

"میں اب چلتا ہوں اور تمہارے کہنے پر عمل کروں گا۔ اپنے والد سے تمہاری زندگی کے بارے میں پوچھوں گا۔"

"تمہیں ایسی جلدی کاہے کی ہے؟"

"اماں نے جنتی مشروب بنانے کا وعدہ کیا تھا اور....."

"عامرہ اور اس کے جنتی مشروب' کیا اس منحوس گھر میں کچھ بھی نہیں بدلا؟ تم میں

ایک کمزوری ہے۔ زہیر الفضل۔ ایک ایسی کمزوری جو تمہیں برباد کردے گی۔ تم بہت جلدی باتوں میں آجاتے ہو۔ تمہارے دوست جس طرف چاہیں تمہیں لے جاتے ہیں۔ تم ان کی دم بن جاتے ہو۔ تم کسی سے کچھ پوچھتے نہیں ہو۔ تمہیں خود سوچنا چاہئے۔ ہمیشہ۔ خاص طور پر اس زمانے میں جب بات مفروضوں کی نہیں ہے بلکہ ہر فیصلہ زندگی اور موت کا فیصلہ "

"کم از کم تمہیں یہ کہنے کا حق نہیں۔ کیا میں دو برس سے تم سے سوالات نہیں کر رہا ہوں۔ کیا میں اپنی بات پر مصر نہیں ہوں بابا؟"

"ہاں۔ مجھے اس سے انکار نہیں لیکن اب جب میں تمہیں کچھ بتانے لگا ہوں تو تمہیں جانے کی اتنی جلدی کیوں ہے؟"

"لیکن میں سمجھتا تھا کہ تم نے کہا ہے کہ میں اپنے باپ سے...."

"بالکل۔ یہ تم تمہیں ٹالنے کا ایک بہانہ تھا۔ جو ہر دفعہ تم پر چل جاتا ہے۔ بے وقوف لڑکے! تمہارا باپ تمہیں کبھی کچھ نہیں بتائے گا۔ رہی تمہاری ماں تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ وہ بڑی جذباتی بی بی ہے اور بہت محترم لیکن اس معاملہ میں غالباً وہ تمہارے باپ کی پیروی کرے گی۔ ابھی میرے پاس ٹھہرو۔ ابن عمر! میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا۔"

زہیر انکشافات کے خیال سے لرزنے لگا۔ بڈھے نے پانی گرم کیا اور کافی تیار کی پھر اس برتن کو ایک طرف ہٹا کر ایک بڑا سا بہت استعمال شدہ دستی قالین غار کے درمیان بچھا دیا۔ وہ آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ اور زہیر کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ جب وہ دونوں بیٹھ گئے تو بڈھے نے کافی کے دو پیالے بھرے اور سڑ سڑ کر کے پینے لگا۔ پھر وہ یوں شروع ہوا:

"ہم سمجھتے تھے کہ پرانے دن ساری دنیا میں ختم ہو جائیں غرناطہ میں ختم نہیں ہوں گے۔ ہمیں یقین تھا کہ اندلس میں اسلامی سلطنت قائم رہے گی لیکن ہمیں اندازہ نہیں تھا ہم خود اپنے آپ کو کس طرح تباہ کر رہے تھے۔ وہ دن اب لوٹ کر نہیں آئیں گے اور جانتے ہو۔ کیوں؟ اس لئے کہ دین کے خود ساختہ محافظ آپس میں لڑ پڑے۔ ایک دوسرے کو قتل کرنے لگے اور عیسائیوں کے سامنے متحد ہونے کے قابل نہیں رہے اور پھر وقت ہاتھ سے نکل گیا۔

جب سلطان ابوعبداللہ نے اپنی سلطنت پر آخری نظر ڈالی تو وہ رو پڑا۔ جس پر اس کی ماں عائشہ بی بی نے کہا بہتر ہے کہ تم عورتوں کی طرح روؤ۔ اس لئے کہ تم مردوں کی طرح مقابلہ نہیں کر سکے۔ مجھے یہ بات کبھی بھی مناسب نہیں لگی۔ اس وقت تک عیسائیوں کی عسکری قوت بہت بڑھ چکی تھی ہمارا خیال تھا کہ سلطان ترکی ہماری مدد کرے گا۔ اور ملاکا پر

مخبر تعینات کر دیئے گئے لیکن کوئی نہ آیا۔ یہ سب صرف پندرہ برس پہلے کی بات ہے۔ میں جس زمانے کی بات کر رہا ہوں وہ سو برس پہلے کا ہے۔

تمہارا پردادا ابن فرید ایک بے مثال سپاہی تھا۔ کہتے ہیں کہ عیسائی نائٹ ابن قاسم سے بھی زیادہ اس سے ڈرتے تھے۔ اور یقین کرو کہ یہ بہت بڑی بات تھی _ ایک مرتبہ مدینہ سد کے محاصرہ کے موقع پر وہ اکیلا گھوڑے پر سوار ہو کر کاسٹلین بادشاہ کے خیمہ پر پہنچا۔ اس نے پکار کے کہا۔"او عیسائیوں کے بادشاہ! میں تم میں سے ہر ایک کو چیلنج کرتا ہوں کہ وہ مجھ سے جنگ کرے۔ امیر نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تمہیں بتادوں کہ اگر تم میں سے کوئی مجھے گرا دے گا تو دروازے کھول دیئے جائیں گے۔ لیکن اگر غروب آفتاب تک میں اپنے گھوڑے پر سوار رہا تو تمہیں شکست ماننی پڑے گی۔"

بادشاہ۔ تمہارے پردادا کی شہرت کے پیش نظر یہ چیلنج تسلیم کرنے کو تیار نہ تھا۔ لیکن عیسائی نائٹس باغی ہو گئے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ چیلنج قبول نہ کرنا ان کی مردانگی پر ایک داغ ہو گا۔ چنانچہ چیلنج قبول کر لیا گیا۔ اور جو ہونا تھا وہ ہوا۔ جب سورج غروب ہوا تو بنو حزبل کا سردار خون میں نہا رہا تھا لیکن ابھی تک اپنے گھوڑے پر سوار تھا۔ تقریباً 60 عیسائی نائٹ مر چکے تھے۔ محاصرہ اٹھا لیا گیا.... ایک ہفتہ کے لئے۔ پھر وہ لوٹے۔ گیریژن (فوجی دستے) پر اچانک حملہ کر دیا اور آخر کار فتحیاب ہوئے لیکن ابن فرید اس وقت تک الحزبل واپس پہنچ چکا تھا۔

تمہارا دادا عبداللہ صرف دو برس کا تھا۔ جب تمہاری دادی پھوپھی زہرہ کی پیدائش پر اسکی مشفق ماں نجمہ بی بی کا انتقال ہو گیا۔ اس کی چھوٹی بہن مریم نے اس کی جگہ لے لی اور بچوں کی سرپرست ہو گئی اور وہ بھی کیا ماں تھی کہتے ہیں کہ جب بچے بڑے ہوئے تو اسی کو اپنی ماں سمجھتے تھے۔ زہیر کی بے قراری بڑھتی جا رہی تھی۔ "تمہیں یقین ہے یہ تمہاری ہی کہانی ہے؟" "مجھے تو لگتا ہے جیسے میری کہانی ہے مجھے اپنے پردادا کے بڑے افسانوی قصے سنائے گئے ہیں"

زہیر کو گھورتے ہوئے زندیق کی آنکھیں اور بھی چھوٹی ہو گئیں۔ "اگر اب تم نے ایک مرتبہ بھی ٹوکا تو میں پھر کبھی تم سے اس موضوع پر بات نہیں کروں گا۔ سمجھے!"

زہیر نے یہ سخت شرط منظور کر لی اور بڈھے نے پھر کہنا شروع کیا:

"لیکن کچھ مشکلات تھیں۔ ابن فرید اپنی بیوی سے بڑی شفقت اور عزت سے پیش آتا تھا لیکن اسے اس سے لگاؤ نہیں تھا۔ وہ مردانگی صلاحیتیں کھو بیٹھا تھا۔ بڑے بڑے حکیم

اور معالج آئے۔ عجیب وغریب کشتے دیئے گئے لیکن اس کی قوت بحال نہ ہوئی۔ خوبصورت دوشیزاؤں نے اس کی خوابگاہ میں گشت لگائے مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔

انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ ذہنی بیماریوں کا جسمانی بیماریوں کی طرح علاج نہیں ہوتا۔ جب دل میں ولولہ ہی نہ ہو تو مرغ اذان نہیں دیتا۔ کیا واقعی تمہیں یہ تمام باتیں معلوم نہیں؟"

زہیر نے انکار میں سر ہلایا۔

"یہ جان کر مجھے واقعی تعجب ہوا ہے۔ اماں اور بو نے دونوں کو سب باتیں معلوم ہیں۔ ان میں سے کسی نے تمہیں بتایا ہو گا؟" اور بڈھے نے ان دوناموں سے اپنی بدمزگی ظاہر کرنے کیلئے بہت زور سے غار کے باہر تھوکا۔

"ابھی نہ رکو۔ مجھے سب کچھ بتاؤ" زہیر نے بڑی بے قراری اور التجا سے کہا۔ بڈھا پیالہ میں* اور کافی انڈ یلتے ہوئے مسکرایا۔

"ایک روز جب ابن فرید اپنے چچا کے پاس قرطبہ گیا ہوا تھا تو وہ دونوں گھوڑوں پر سوار ہو کر شہر سے باہر ایک گاؤں کی طرف روانہ ہوئے جہاں ایک عیسائی رئیس رہتا تھا فتح اشبیلیہ کے وقت اس کے تم لوگوں سے خاندانی تعلقات تھے۔ کاؤنٹ۔ ڈون الویرو۔ گھر پر نہیں تھا نہ اس کی بیوی تھی لیکن جب وہ انتظار کر رہے تھے تو ایک ملازمہ کچھ پھل اور مشروب لے کر آئی۔ وہ زیادہ سے زیادہ 15یا16 برس کی ہو گی۔ اس کا نام بیٹرس تھا اور اس کا قد کاٹھ خوبصورت تھا۔ اس کی جلد پکی ہوئی خوبانیوں کی طرح تھی اور اس کی آنکھیں بادام جیسی تھیں۔ ابن فرید کی آنکھیں اس پر سے ہٹتی ہی نہ تھیں۔ اس کے چچا نے فوراً ہی صورت حال کو بھانپ لیا۔ اس نے اٹھ جانے کی کوشش کی لیکن تمہارا پردادا وہاں سے ہلنے کے لئے تیار نہ تھا۔ اس کے چچا نے بعد میں گھر والوں کو بتایا کہ تب ہی اس کا ماتھا ٹھنک گیا تھا کہ ابن فرید تباہی کی طرف جا رہا ہے لیکن اس کی تنبیہہ' اس کے خدشوں اور بدشگونیوں کا کوئی اثر نہ ہوا۔ ابن فرید کی خود سری مشہور تھی۔

جب ڈون الویرو اپنے بیٹوں کے ساتھ واپس آیا تو وہ سب مہمانوں سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ بڑی سی دعوت کا اہتمام کیا گیا۔ بستر تیار کئے گئے۔ ان دونوں کے اس رات قرطبہ آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ پیغام بھجوا دیا گیا کہ ابن فرید اگلے روز تک نہیں آئے گا۔ اندازہ کرو کہ وہ کتنا خوش ہو گا۔ آخر کار کافی رات گزرنے کے بعد اس مرد میدان نے بڑی انکساری کے ساتھ اپنے میزبان سے لڑکی کے متعلق خواہش ظاہر کی۔

"تم بھی' میرے یار! تم بھی" ڈون الویرو نے کہا۔ بیٹرس ہماری پکانے والی ڈوروتھیا کی بیٹی ہے۔ تم چاہتے کیا ہو؟ اگر تم اسکے ساتھ رات گزارنا چاہتے ہو تو بے شک اس کا بندوبست ہو سکتا ہے"۔ ڈون الویرو کی حیرانی کا اندازہ کرو کہ جب اس نے یہ فراخدلانہ پیشکش کی تو ابن فرید کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو گیا۔ وہ کھڑا ہو گیا اور اس نے اپنے میزبان کو مقابلہ کی دعوت دی۔ ڈون الویرو نے اندازہ کر لیا کہ معاملہ سنگین ہے۔ اس نے کھڑے ہو کر ابن فرید کو سینہ سے لگا لیا۔ "دوست! تم چاہتے کیا ہو؟" سب خاموش ہو گئے ابن فرید کی آواز حلق میں اٹک کر رہ گئی "میں اسے بیوی بنانا چاہتا ہوں۔ بس" اس بات پر اس کے چچا کو غش آ گیا جو غالباً زیادہ پی جانے کا اثر تھا۔ ڈون الویرو کیا کہہ سکتا تھا۔ اس نے اتنا ہی کہا کہ لڑکی کا باپ مرچکا ہے اور اسے ڈوروتھیا سے پوچھنا پڑے گا۔ لیکن اس نے یہ بھی واضح کر دیا کہ چونکہ وہ عورت ان کے ہاں ملازم ہے اس لئے انکار کی گنجائش نہیں ہے۔

"تمہارا پردادا صبر نہیں کر سکتا تھا اس نے کہا۔ اسے اسی وقت بلاؤ" ڈون الویرو نے ایسا ہی کیا۔ ڈوروتھیا آئی۔ لیکن وہ بہت گھبرائی ہوئی اور پریشان تھی۔ اس نے جھک کر سب کو سلام کیا۔ ڈون الویرو نے کہا۔ 'ڈوروتھیا! میرے مہمانوں کو تمہارا بنایا ہوا کھانا بہت پسند آیا ہے اور یہ عظیم نائٹ ابن فرید تمہارے پکانے کی بہت تعریف کر رہا ہے۔ وہ تمہاری بیٹی کے حسن کی بہت تعریف کرتا ہے۔ ہم نے اسے یہاں پلتے بڑھتے دیکھا ہے ہمیں اس کے چہرے کے نقوش کوئی خاص نظر نہیں آتے۔ لیکن اجنبیوں کے لئے اس کا حسن تباہ کن ہے۔ کیا تم نے اس کی شادی کے متعلق کچھ سوچا ہے؟ وہ بے چاری کیا کہتی۔ وہ خود بہت حسین تھی۔ خوبصورت جسم اور گھٹنوں تک لہراتے لمبے سرخ بال۔ وہ اس سوال پر دم بخود ہو کر رہ گئی۔ بے یقینی سے اس نے اپنا سر نفی میں ہلایا 'تو پھر'۔ ڈون الویرو نے کہا۔ 'میرے پاس تمہارے لئے ایک اچھی خبر ہے۔ میرا دوست ابن فرید اسے اپنی بیوی بنانا چاہتا ہے۔ سمجھیں! ہمیشہ کے لئے اپنی بیوی ایک رات کی داشتہ نہیں۔ وہ تمہیں اس کے لئے اچھی رقم دے گا۔ تمہارا کیا خیال ہے؟

ابن عمر! ذرا سوچو کہ بیچاری عورت کی کیا حالت ہوئی ہو گی۔ وہ رونے لگی جس سے ابن فرید بہت متاثر ہوا۔ اور اس نے پھر اسے یقین دلانے کی کوشش کی کہ اسکے ارادے نہایت نیک ہیں۔ تب اس نے ڈون الویرو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ 'میرے آقا! جیسے آپ کی مرضی۔ اس کا باپ نہیں ہے۔ آپ ہی فیصلہ کریں' اور ڈون الویرو نے اسی وقت

اپنا فیصلہ سنا دیا کہ اگلی صبح بیٹرس تمہاری پردادی نمبر۳ بن جائے گی- اور شراب پی گئی- کہتے ہیں کہ تمہارے دادا کی پیدائش کے بعد سے تمہارے اس بزرگ کے چہرے پر کبھی اتنی خوشی نہیں دیکھی گئی تھی- وہ ساتویں آسمان پر تھا- وہ گانے لگا اور اتنا خوش اور مست تھا کہ دوسرے بھی اس کے ساتھ شامل ہوگئے- وہ کبھی اس نغمہ کو نہیں بھولا جو اس وقت سے آج تک بھی تمہارے گھر میں گایا جاتا ہے"

زہیر تن کے بیٹھ گیا-

"کیا یہ خمریہ تھا- شراب کی مدح میں؟"

بڈھا مسکرایا اور اس نے ہاں میں سرہلایا- زہیر ابن فرید کی کہانی سے اس قدر متاثر ہوا کہ وہ بھی گانے لگا:

میرے حواس کو جذبات کی رو میں بہہ جانے دو
محبت کی آگ میں سلگتے ہوئے اس دل پر رحم کرو
اس وقت تیوری نہ چڑھاؤ جب میں تمہیں تمہارے اصلی روپ میں
دیکھوں
کہ محبت زندگی ہے اور اس میں مرجانا جنت ہے
جہاں تمام گناہ بخش دیئے جاتے ہیں-

"واللہ" بڈھے نے داد دی- "تم اچھا گاتے ہو"

"میں نے شعر اپنے والد سے سنے ہیں"

"اور اس نے اپنے باپ سے- لیکن جب سب سے پہلے یہ پڑھے گئے تھے اس کی بات ہی اور تھی- ابھی اور سننا ہے یا آج اتنا ہی کافی ہے؟ سورج پہاڑیوں پر چمکنے لگا ہے- تمہارا جنتی کھانا گھر پر تمہارا انتظار کر رہا ہے- اگر تم تھک گئے ہو...."

"جاری رکھو- آگے چلو"

"اگلی صبح ناشتہ کے بعد بیٹرس نے اسلام قبول کر لیا- جب اس سے کسی اسلامی نام کے انتخاب کے لئے کہا گیا تو وہ گھبرا گئی- چنانچہ اس کا نیا نام بھی اس کے شوہر نے رکھا- اسمیٰ- اسمیٰ بنت ڈوروتھیا-

"بیچاری- اسے شادی کی خبر اس وقت دی گئی جب وہ صبح سویرے باورچی خانہ کی صفائی کے لئے اٹھی اور آگ جلانے چلی- اس کے آنسو نکل آئے- کچھ گھنٹوں کے بعد نکاح ہو گیا- تمہارے پردادا کے بھائی کو یہ رسم ادا کرنی پڑی کیونکہ وہاں وہی ایک مسلمان

تھا- پیدائش' موت' شادی' طلاق کے لئے لمبی چوڑی رسومات کی ضرورت نہیں- ہمارا مذہب سادہ ہے- پادریوں نے ان رسموں کو مشکل بنا دیا ہے-

"ابن فرید کو جلدی تھی- وہ گھروالوں کے سامنے یہ اٹل حقیقت رکھنا چاہتا تھا تاخیر مہلک ثابت ہو سکتی تھی- نجمہ کے بھائی اور مریم خاندان کی اس شاخ سے تعلق رکھتے تھے جو دوسرے قبیلوں سے معاملات طے کرنے کے لئے مشہور تھی- وہ بڑے ماہر قاتل تھے- قدرتی طور پر یہ بات ان کے لئے بہت ناقابل برداشت تھی کہ ایک عیسائی غلام زادی کو ان کی بہن پر ترجیح دی جائے- داشتاؤں کا تو تمہیں پتہ ہی ہے کہ ان کی اجازت ہے- لیکن یہ بات دوسری تھی- گھر کی ایک نئی مالکہ لائی جا رہی تھی- اور نہ ان سے پوچھا گیا تھا نہ انہیں بتایا گیا تھا- یقیناً اس سے بچے بھی ہوں گے- اگر وقت مل جاتا تو وہ بیٹرلیس کو قتل بھی کر سکتے تھے- ابن فرید کو سارا اندلس "شیر" کہتا تھا- وہ اتنا بہادر تھا- لیکن اتنی ہی چالاکی سے وہ لومڑی بھی بن سکتا تھا- اسے معلوم تھا کہ اگر اس نے شادی کر لی تو اسے سسرال کی حمایت بھی حاصل ہو جائے گی- اس کا چچا بے شک ناراض تھا- مگر ڈون الویرو کے گھر میں اس نے کوئی جھگڑا نہیں کیا- یہ بعد میں ہوا-

"چنانچہ ابن فرید اور بیٹرلیس بنت ڈوروتھیا قرطبہ آ گئے- انہوں نے غرناطہ کی سلطنت اور الحزیل کی امان گاہ تک دو دن کا سفر شروع کرنے سے پہلے ایک دن اور ایک رات آرام کیا- ابن فرید کو یہ معلوم بھی نہ تھا کہ یہ خبر پہلے ہی گھر پہنچ گئی تھی- جس کے لئے اس کے چچا نے ایک قاصد دوڑایا تھا-

"گھر میں سوگ کا سماں تھا- تمہارا دادا عبداللہ اس وقت اٹھارہ برس کا تھا- وہ پورا مرد تھا- تمہاری دادی زہرہ اس سے چار سال چھوٹی تھی- میری ہی عمر کی- یہ دونوں صحن میں نہر کے پاس چل پھر رہے تھے اور بہت پریشان تھے- میں دیکھ رہا تھا کہ بغیر کسی وجہ کے ان کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی- جب میں نے تمہارے دادا سے پوچھا تو وہ مجھ پر برس پڑا- کتے کے بچے- دفعہ ہو جاؤ- اس سے تمہارا کوئی تعلق نہیں' اس نے اس سے پہلے کبھی مجھ سے اس طرح بات نہیں کی تھی- جیسے ہی مریم بی بی کمرے سے باہر آئی دونوں اس کی طرف دوڑے اور اس سے لپٹ کر رونے لگے- خوش قسمتی سے میری گستاخی آئی گئی ہو گئی- مجھے تمہارے دادا سے بہت لگاؤ تھا- اور اس دن اس کی ڈانٹ سے مجھے بہت دکھ ہوا بعد میں البتہ مجھے اس کے غصہ کی وجہ معلوم ہو گئی- لیکن اس دن تک میں اس کے اور زہرہ کے ساتھ دوستوں کی طرح کھیلتا تھا' کوئی تبدیلی ہو گئی تھی- جیسے ہی سکون کی فضا بحال

ہوئی میں نے پرانی روش پر چلنا چاہا لیکن تعلقات پھر کبھی پہلے جیسے نہ ہوئے۔ میں یہ بات نظر انداز نہ کر سکا کہ وہ میرا آقا تھا اور مجھے بار بار یاد دلایا جاتا کہ میں ایک کنیز زادہ ہوں اس ملازمہ کا بیٹا ہوں جو اب اسمٰی بی بی کی خدمت پر معمور ہے۔"

زہیر نے سوچا کہ اب آخر کار وہ اپنے متعلق بتانے لگا ہے۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ کوئی سوال پوچھتا بڈھے نے اپنی بات جاری رکھی:

"مریم بی بی سب سے زیادہ نیک دل خاتون تھی حالانکہ اگر کوئی ملازمہ ذرا بھی بے تکلف ہونے کی کوشش کرتی تو اس کی زبان ذرا بھی لحاظ نہ کرتی۔ البتہ اماں کی بات الگ تھی۔ مجھے وہ اچھی طرح یاد ہے۔ کبھی کبھی وہ دریا میں نہانے جاتی۔ چھ ملازمائیں اس کے آگے چلتیں اور چار پیچھے۔ وہ اس کے دونوں طرف چادریں تانے رہتیں تاکہ پردہ رہے۔ اگر زہرہ ان کے ساتھ نہ ہوتی تو وہ خاموشی سے چلتیں رہتیں۔ زہرہ ساتھ ہوتی تو خالہ اور بھتیجی خوب باتیں کرتی چلتیں اور کنیزوں کو بھی زہرہ کی باتوں پر ہنسنے کی اجازت ہوتی۔ ملازم مریم کی عزت کرتے تھے مگر اسے پسند نہیں کرتے تھے۔ اس کی مرحوم بہن کے بچے اس پر فدا تھے۔ تمہارے دادا اور اس کی بہن کے ساتھ وہ کوئی زیادتی نہیں کر سکتی تھی انہیں معلوم تھا کہ ان کا باپ اس سے خوش نہیں تھا۔ جیسا کہ بچوں کے ساتھ ہوتا ہے انہیں محسوس ہوتا تھا کہ کوئی گڑ بڑ ضرور ہے۔ اور بہت بڑی گڑ بڑ۔ لیکن ان کی محبت میں کمی نہیں آئی۔" بڈھا ایک دم سے رک گیا اور زہیر کی بے چین آنکھوں میں جھانکنے لگا۔

"چھوٹے آقا! تم کسی بات سے پریشان ہو۔ کیا تم اب جانا چاہتے ہو اور کل واپس آؤ گے؟ کہانی تو کہیں نہیں بھاگی جا رہی۔"

دور افق پر زہیر کی نظر ایک چھوٹے سے ہیولے پر پڑ گئی تھی اور مٹی کے اڑنے سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ کوئی سوار ہے جو تیزی سے دوڑتا آ رہا ہے۔ اسے گمان گزرا کہ الحزیل سے کوئی پیغام آ رہا ہے۔ "مجھے ڈر ہے کہ ہماری بات ادھوری رہ جائے گی۔ اگر سوار گھر سے کوئی پیغام لایا ہے تو پھر میں کل طلوع آفتاب کے وقت آؤں گا۔ کیا جانے سے پہلے تم میری الجھن دور کرو گے؟"

"پوچھو۔"

"تم کون ہو۔ بابا؟ تمہاری ماں ہمارے گھر میں کام کرتی تھی۔ لیکن تمہارا باپ کون تھا۔ کیا تم بھی ہمارے خاندان کے فرد ہو؟"

"میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ میری ماں نجمہ بی بی ساتھ جہیز میں قرطبہ سے آئی

تھی۔ ابن فرید کی شادی کے وقت وہ سولہ سترہ برس کی ہو گی۔ میرا باپ؟ کون جانے؟ مری ماں بتاتی تھی کہ وہ تمہاری جاگیر میں مالی تھا اور جس سال میں پیدا ہوا وہ ملاکا کی لڑائی میں مارا گیا۔ یہ صحیح ہے کہ اس سے اس کی شادی ہوئی تھی۔ لیکن اللہ ہی جانے کہ وہ میرا باپ بھی تھا۔ بعد میں اسمٰی بنت ڈوروتھیا کی اچانک اور پراسرار موت کے بعد اور عجیب وغریب حالات میں میری ماں کے مرنے کے بعد میں نے اپنے حقیقی باپ کے متعلق قصے سنے۔ یہ کہا گیا کہ میں ابن فرید کے نطفے سے ہوں۔ بعد کے برسوں میں اس کے رویہ سے یہی ظاہر ہوتا تھا۔ لیکن اگر ایسا ہوتا تو میری ماں مجھے خود بتا دیتی۔ پھر میں نے اس بات پر سوچنا ہی چھوڑ دیا۔"

زہیر ان واقعات سے بہت پریشان ہوا۔ اب اسے کچھ کچھ وہ کہانیاں یاد آئیں جو اماں اسمٰی بی بی کی مصیبتوں کے بارے میں سناتی تھی لیکن اب وہ اس کے ذہن سے بالکل ہی محو ہو چکی تھیں۔ وہ بہت بے قرار تھا کہ وہاں ٹھہرے اور ساری بات سنے۔ لیکن اڑتی ہوئی خاک قریب آتی جا رہی تھی۔

"تم اب بھی ایک اہم حقیقت کو چھپا رہے ہو"

"وہ کیا ہے؟"

"تمہارا نام۔ بابا"

بڈھے کا سر جواب تک بلند تھا ایک دم سے جھک گیا اور وہ قالین پر بنے ہوئے نقوش کو دیکھنے لگا۔ پھر اس نے زہیر کی طرف دیکھا اور مسکرایا۔

"مجھے جو نام میری ماں نے دیا تھا میں کبھی کا بھول چکا ہوں۔ شاید میرے دوست اور دشمن مجھے واجدالزندیق کے نام سے جانتے ہیں۔ جب میں نے اپنی پہلی کتاب لکھی تو یہی نام استعمال کیا۔ مجھے اب بھی اس نام پر فخر ہے۔"

"تم نے کہا تھا کہ تمہیں معلوم ہے وہ مجھے الفحل کیوں کہتے ہیں۔ میں بھی سوچوں گا اور تمہارے نام کی کوئی چبھتی ہوئی سی وجہ تلاش کروں گا۔"

"جواب آسان ہے۔ یہ میرا صحیح تعارف ہے۔ میں بہرحال ایک متشکک ہوں۔ ایک جنونی آزاد خیال" دونوں ہنس پڑے۔ جیسے ہی سوار غار کے باہر پہنچا دونوں کھڑے ہو گئے۔ زہیر عادۃً بڑے جوش کے ساتھ بڈھے سے بغلگیر ہوا اور اس کے رخسار کو بوسہ دیا۔ زندیق اس محبت سے بہت متاثر ہوا۔ پیشتر اس کے کہ وہ کچھ کہتا۔ سوار آہستہ سے کھانسا۔

"جوان اندر آجاؤ۔ کیا میرے والد کا کوئی پیغام ہے؟" زہیر نے پوچھا۔

لڑکے نے ہاں میں سرہلایا- وہ مشکل سے تیرہ برس کا ہو گا-

"معاف کیجئے- آقا- مالک نے کہا ہے کہ آپ فوراً واپس آجائیں- ناشتہ پر آپ کا انتظار ہو رہا ہے-"

"اچھا- تم اپنے خچر پر چڑھو جسے تم گھوڑا کہتے ہو اور لوٹ جاؤ- کہنا کہ میں آ رہا ہوں- ٹھہرو- میں نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے- اب واپس جاؤ- میں چند منٹ میں تم تک پہنچ جاؤں گا- میں خود اپنے والد کو سلام کروں گا- تمہارے لئے کوئی پیغام نہیں ہے-"

لڑکے نے سلام کیا اور ابھی وہ جانے ہی والا تھا کہ زندیق نے اسے روک لیا- "بیٹے- ادھر آؤ- تمہیں پیاس لگی ہے؟"

لڑکے نے زہیر کی طرف دیکھا جس نے گردن کے اشارے سے اسے اجازت دی- لڑکے نے بڑی بے صبری سے پانی کا پیالہ لیا اور غٹا غٹ پی گیا-

"لو- یہ کچھ کھجوریں بھی واپسی کے لئے لے لو- جب تمہارا چھوٹا آقا تم کو آ لے گا تو تمہیں انہیں کھانے کا موقع مل جائے گا-"

لڑکے نے بڑی احسان مندی کے ساتھ کھجوریں لے لیں- دونوں کے سامنے تعظیم سے جھکا اور اپنے گھوڑے کو ہانکتا ہوا پہاڑی راستہ پر چل پڑا-

"خدا حافظ- واجدالزندیق"

"خدا حافظ- بیٹے! میری ایک درخواست ہے"

"جو چاہے کہو-"

"جب پچیس برس پہلے تمہارے باپ نے مجھے یہاں رہنے کی اجازت دی تھی تو صرف ایک شرط لگائی تھی کہ اس خاندان کے معاملات کے متعلق میرے ہونٹ ہمیشہ سلے رہیں گے اگر کبھی بھی اسے معلوم ہوا کہ یہ شرط توڑ دی گئی ہے تو یہ اجازت واپس لے لی جائے گی اور اس کے ساتھ ہی جو کھانا وغیرہ مجھے تمہارے ہاں سے ملتا ہے وہ بھی بند ہو جائے گا- میرا مستقبل تمہارے ہاتھ میں ہے- میرے پاس سرچھپانے کو اور کوئی جگہ نہیں"

زہیر کو غصہ آ گیا

"لیکن یہ قابل قبول نہیں ہے- یہ ناانصافی ہے- میرے باپ سے ایسی توقع نہیں- میں..."

"تم کچھ نہیں کرو گے- ہو سکتا ہے تمہارے باپ نے غلطی کی ہو- لیکن اس کی کچھ وجوہات تھیں- میں تم سے یہ عہد چاہتا ہوں کہ تم خاموش رہو گے-"

"میرا وعدہ- میں قرآن کی قسم کھاتا ہوں..."

"تمہاری زبان ہی کافی ہے-"

"ٹھیک ہے- زندیق! مگر اس کے بدلے تم سے میں بھی وعدہ لینا چاہتا ہوں کہ تم مجھے ساری بات بتاؤ گے-"

"میری بھی یہی نیت ہے"

"تو پھر- خدا حافظ- بابا"

زندیق اس جگہ گیا جہاں خالد بندھا ہوا تھا اور جب زہیر سوار ہوا تو اس نے مسکرا کر داد دی- زندیق نے گھوڑے کو تھپکا-

"بغیر زین کے گھوڑے پر سواری"

"ہاں"_ زہیر چلایا- "... یہ ایسا ہی ہے جیسے شیطان کی پیٹھ پر سواری- اور اگر یہ بات صحیح ہے تو میں یہی کہوں گا کہ شیطان کی پیٹھ بہت آرام دہ ہے"

"اللہ تمہیں خیریت سے رکھے- الفتی! تمہارا گھرانا پھلے پھولے-" بڈھے نے چلا کر کہا اور جاتے ہوئے زہیر کو مسکرا کر دیکھتا رہا- کچھ دیر زندیق وہاں خاموش کھڑا زہیر کی شہ سواری کی داد دیتا رہا-

"میں بھی ایک زمانہ میں ایسا ہی تھا- زہرہ- تمہیں یاد ہے؟" کسی نے جواب نہ دیا-

باب 3

یزید قیلولے سے اٹھ گیا تھا۔ اسے کچھ کپکپی تھی اور اس کے چہرے پر پسینہ تھا۔ اس کی ماں جو اس کے ساتھ لیٹی ہوئی تھی اپنے چھوٹے بچے کی اس حالت سے پریشان ہو گئی۔ اس نے کپڑے سے اس کا چہرہ پونچھا اور عرق گلاب سے تر کیا اور اس کے ماتھے کو چھوا۔ باہر چلتی ہوئی ہواؤں کی طرح اس کی پیشانی ٹھنڈی تھی۔ خطرہ کی کوئی بات نہیں تھی۔

"بیٹے! تمہاری طبیعت خراب ہے؟"

"نہیں۔ میں نے ایک عجیب سا خواب دیکھا ہے امی! یہ اتنا سچا تھا۔ سہ پہر کے خواب سچے کیوں ہوتے ہیں؟ شاید اس لئے کہ نیند کچی ہوتی ہے؟"

"شاید۔ تم خواب سناؤ گے؟"

"میں نے مسجد قرطبہ کو دیکھا۔ امی وہ بہت ہی خوبصورت ہے اور پھر بڑے چچا میگوئل داخل ہوئے اور خون کی بوتلیں ہر طرف انڈیلنے لگے۔ میں نے انہیں روکنا چاہا۔ لیکن انہوں نے مجھے مارا....."

"خواب حقیقتوں سے بھی آگے نکل جاتے ہیں" زبیدہ بیچ میں بول پڑی۔ اماں کے اکسانے پر بچوں کا میگوئل پر بار بار حملے کرنا اسے اچھا نہیں لگا۔ چنانچہ اس نے اپنے بچے کی توجہ ہٹانی چاہی۔ "لیکن آدمی کتنے بھی خواب دیکھتا رہے مسجد قرطبہ کی خوبصورتی کو نہیں پہنچ سکتا۔ ہم ایک روز تمہیں اس کی شاندار محرابیں دکھانے کے لئے لے چلیں گے اور رہا میگوئل ...." اس نے ٹھنڈی سانس لی۔

زہیر نے حمام میں جاتے ہوئے یہ گفتگو سنی اور خاموشی سے ماں کے کمرے میں داخل ہو گیا اور اس نے قرطبہ کے بشپ کے متعلق یزید کی باتیں سن لیں۔

"مجھے وہ اچھے نہیں لگتے۔ کبھی بھی نہیں۔ وہ ہمیشہ بڑے زور سے میرے گلے کھینچتے ہیں۔ اماں کہتی ہے ان سے کسی بہتری کی توقع نہیں۔ وہ کہتی ہے کہ ان کی ماں امی بی بی بھی انہیں پسند نہیں کرتی تھی۔ امی! آپ کو پتہ ہے ایک مرتبہ میں نے اماں اور بونے کو امی بی بی کے متعلق باتیں کرتے سنا تھا۔ اماں کہتی ہے کہ میگوئل نے انہیں مارا۔ کیا یہ سچ ہے؟"

زبیدہ کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ اس نے بڑی بے یقینی کے ساتھ چھوٹا سا ایک قہقہہ لگایا۔ "یہ کیا حماقت ہے؟ میگوئل نے اپنی ماں کو نہیں مارا۔ تمہارے والد کو دکھ ہو گا کہ تم ایسی باتیں کرتے ہو۔ تمہاری اماں بڑی بکواس کرتی ہے۔ تم اس کی کسی بات کا اعتبار نہ کرو۔"

"امی! کیا آپ یقین کے ساتھ یہ کہہ رہی ہیں؟" زبیر نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ اس کی آواز سے دونوں چونک گئے۔ یزید کود کر اس کی گود میں چڑھ گیا۔ دونوں بھائی بغلگیر ہو گئے اور ایک دوسرے کے بوسے لینے لگے۔ ماں مسکرا اٹھی۔

"شیر کا بچہ اپنے محافظ کے پاس پہنچ گیا ہے۔ ہم نے صبح تمہاری بڑی کمی محسوس کی۔ یزید بےقرار گھومتا رہا۔ خود بھی پریشان اور دوسروں کو بھی پریشان کرتے ہوئے وہ بڈھا ایسی کیا دلچسپ باتیں کر رہا تھا؟"

زبیر نے پہلے ہی سے اس متوقع سوال کا جواب سوچ رکھا تھا۔

"اندلس کا المیہ۔ ہمارا طرز زندگی جس میں باقی رہنے کی صلاحیت نہیں رہی تھی۔ اس کا خیال ہے کہ ہم اپنی تاریخ کے خاتمہ پر ہیں۔ امی! وہ بہت پڑھا لکھا آدمی ہے۔ واقعی ایک عالم۔ آپ اس کے متعلق کیا جانتی ہیں؟ وہ اپنے متعلق بات کرنے کو تیار نہیں۔"

"اماں سے پوچھو"۔ یزید بولا۔ "وہ اس کے متعلق سب کچھ جانتی ہے۔" "میں اماں سے کہوں گی کہ آئندہ وہ اپنی داستان طرازیوں کو قابو میں رکھے اور یزید کی موجودگی میں احتیاط سے کام لے۔"

زبیر مسکرایا اور وہ اماں اور اسکی باتوں پر گفتگو کرنا چاہتا ہی تھا کہ اس کی آنکھیں اس کی ماں کی آنکھوں سے ٹکرائیں۔ اس کے لئے اشارہ کافی تھا۔ وہ بستر میں اٹھ کر بیٹھ گئی تھی اور فوراً اس نے حکم دیا:

"زبیر۔ جاؤ غسل کرو۔ تمہارے بال مٹی سے اٹے ہوئے ہیں۔"

"اور اس میں سے گھوڑے کے پسینہ کی بو آتی ہے" یزید نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

دونوں بھائی رخصت ہو گئے اور زبیدہ نے تالی بجائی۔ دو کنیزیں اندر داخل ہو گئیں۔

ایک کے ہاتھ میں آئینہ اور دو کنگھے تھے۔ بغیر ایک لفظ بولے ان دونوں نے مالکن کے سر کی مالش شروع کر دی۔ دونوں کے ہاتھ بڑی ہم آہنگی کے ساتھ چلنے لگے۔ ہیں انگلیاں جو بہت نرم تھیں لیکن جن کی گرفت سخت تھی پورے سر پر مہارت سے پھرتی رہیں۔ صرف نہر کے پانی کی آواز تھی جو زبیدہ کے کانوں میں آتی رہی۔ جب اس نے محسوس کیا کہ اس کا اندرونی توازن ٹھیک ہو گیا ہے تو اس نے انہیں رکنے کا حکم دیا۔

دونوں عورتیں زمین پر بیٹھ گئیں۔ زبیدہ بستر کے کنارے پر بیٹھ گئی اور وہ اس کے پیر دبانے لگیں۔ چھوٹی لڑکی امیہ ابھی نئی تھی اور وہ گھبرائی ہوئی تھی کہ اسے ابھی اچھی طرح ایڑھیاں ملنی نہیں آتی تھیں۔

"لوگ گاؤں میں کیا باتیں کرتے ہیں؟" زبیدہ نے پوچھا۔ امیہ کو حال ہی میں ترقی دے کر زبیدہ کی کنیز خاص بنایا گیا تھا اور زبیدہ اس کی ہمت افزائی کر رہی تھی۔ مالکہ کے خطاب کرنے پر نوجوان ملازمہ کا چہرہ سرخ ہو گیا اور اسنے بڑے لڑکھڑاتے ہوئے لہجہ میں کہنا چاہا کہ سب لوگ بنو حزیل کا بہت احترام کرتے ہیں' خدیجہ جو اس سے بڑی تھی اور پہلے سے وہاں کام کر رہی تھی اس کی مدد کو آئی۔

"بی بی! سب لوگ یہی بات کر رہے ہیں کہ زبیر نے کافر کے منہ پر طمانچہ مارا"

"زبیر بن عمر غبیہ اور احمق ہے۔ لوگ کیا چاہتے ہیں؟"

امیہ نے بڑی مشکل سے اپنی ہنسی روکی لیکن زبیدہ کی بے تکلفی نے اسے حوصلہ دیا اور اس نے کھل کر جواب دیا۔

"نوجوان ابن عمر کے ساتھ ہیں مالکن! لیکن کئی بزرگ اس سے ناخوش ہیں۔ انہیں شک ہے کہ عیسائی کو غصہ دلایا گیا ہو گا۔ اور موچی ابن حد تو گھبرایا ہوا ہے۔ اسے ڈر ہے کہ کہیں وہ الحزیل پر حملہ کرنے کے لئے سپاہی نہ بھیج دیں اور ہم سب کو قید نہ کر لیں۔ وہ کہتا ہے...."

"ابن حد تو اچھے وقتوں میں بھی برا ہی سوچتا ہے مالکن!"

"خدیجہ کو تشویش تھی کہیں امیہ کچھ زیادہ ہی نہ کھل جائے۔ اور وہ گفتگو کا رخ موڑنا چاہتی تھی۔ لیکن زبیدہ نے اصرار کیا۔

"خاموش رہو۔ لڑکی تم بتاؤ۔ ابن حد نے کیا کہا؟"

"مالکن! مجھے ساری بات تو یاد نہیں۔ لیکن اس نے کہا کہ ہمارے سہانے خواب ختم ہو گئے ہیں اور جلد ہی ہم کانپتے ہوئے بیدار ہوں گے۔"

زبیدہ مسکرائی۔

"وہ اچھا انسان ہے۔ چاہے وہ ناخوشگوار باتیں ہی سوچتا ہو۔ دوست کے ہاتھ کا پتھر بھی سیب ہوتا ہے۔ کیا تم نے میرے کپڑے حمام میں رکھ دیئے؟"

امیمہ نے ہاں میں سر ہلایا۔ زبیدہ نے سر کی جنبش سے انہیں جانے کے لئے کہا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ موچی وہی کہہ رہا ہے جو سارا گاؤں محسوس کرتا ہے۔ بڑی بے یقینی کی فضا تھی چھ سو برس میں پہلی مرتبہ گاؤں والوں کے سامنے یہ امکان تھا کہ ہو سکتا ہے کہ ان کے بچوں کا کوئی مستقبل نہ ہو۔ قرطبہ اور اشبیلیہ کی فتح کے بعد جو کچھ غرناطہ میں ہوا اس کے متعلق سینکڑوں کہانیاں گشت کر رہی تھیں۔ ہر پناہ گزیں خوف و ہراس اور وحشیانہ مظالم کی داستانیں اپنے ساتھ لاتا۔ سب سے زیادہ تشویشناک یہ تفصیلات تھیں کہ کس طرح کیتھولک چرچ اور حکومت نے کئی شہروں میں جاگیریں اور املاک ضبط کر لی تھیں۔ گاؤں والوں کو سب سے زیادہ اسی بات کا ڈر تھا وہ اس زمین سے نکالے جانے کے لئے قطعی تیار نہیں تھے جہاں وہ اور ان کے آباؤاجداد صدیوں سے کھیتی باڑی کرتے آ رہے تھے۔ اگر اپنے گھروں کو بچانے کا صرف یہی طریقہ تھا کہ وہ مذہب تبدیل کر لیں تو بہت سے اس کٹھن فیصلہ پر بھی تیار تھے۔ سب سے پیش پیش گھر کا منشی عبیداللہ تھا تحفظ اور دولت جس کے دین وایمان تھے۔

زبیدہ نے طے کیا کہ وہ اپنے شوہر سے بات کرے گی اور کسی فیصلہ پر پہنچے گی۔ گاؤں والے کسی فیصلہ کے لئے بنوحزیل کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ جانتی تھی کہ زہیر کے طیش میں آ جانے سے وہ خوف زدہ ہو گئے ہوں گے۔ جمعہ کے دن عمر کو مسجد میں جانا چاہئے۔ لوگ تسلی چاہتے ہیں۔

صحن میں سے گزرتے ہوئے زبیدہ نے دیکھا کہ اس کے بچے شطرنج کھیل رہے تھے۔ اس نے ایک منٹ کھیل دیکھا اور یہ دیکھ کر بہت محظوظ ہوئی کہ زہیر کے ماتھے پر چڑھی ہوئی بڑی سی تیوری اس بات کی شاہد تھی کہ یزید فتح کے قریب تھا۔ اس نے اپنی فتح کا اعلان کیا تو جوش سے اسکی چھوٹی سی آواز تھرا رہی تھی۔ "جب بھی کالی ملکہ میری طرف ہوتی ہے میں جیتتا ہوں۔"

"مردود! تم کیا کہہ رہے ہو؟۔ اپنی زبان کو لگام دو۔ شطرنج مکمل خاموشی میں کھیلنی چاہئے۔ یہ اس کھیل کا پہلا اصول ہے۔ تم بولائے ہوئے مرغ کیطرح ٹر ٹر کرتے رہتے ہو"

"تمہارے سلطان کو میری ملکہ نے پھنسا دیا تھا" یزید نے کہا۔" میں تو اس وقت بولا

جب مجھے پتہ ہو گیا کہ کھیل ختم ہو چکا ہے۔ اس میں غصہ کرنے کی کیا بات ہے۔؟ ڈوبتے ہوئے آدمی کو بارش کی کیا پروا۔؟>

زہیر نے جسے اس بات کا غصہ تھا کہ ایک نو سال کے بچہ نے اسے ہرا دیا ہے اپنا سلطان میز پر ڈالا۔ دبی ہوئی ہنسی ہنسا اور لمبے لمبے قدموں سے باہر نکل گیا۔

"ذلیل! میں تمہیں رات کے کھانے پر دیکھوں گا"

یزید ملکہ کو دیکھ کر مسکرایا۔ وہ مہروں کو جمع کر کے ان کے ڈبے میں ڈال رہا تھا جب ایک پرانا ملازم جس کا چہرہ پیلا پڑا ہوا تھا جیسے اس نے کسی بھوت کو دیکھا ہو۔ دوڑتا ہوا صحن میں آیا۔ اماں باورچی خانہ سے نکلی اس نے اس کے کان میں کچھ کہا۔ یزید نے پہلے کبھی بڑھیا کو اتنا پریشان نہیں دیکھا تھا۔ کیا عیسائی فوج الحزیل پر حملہ کرنے والی تھی؟ پیشتر اس کے کہ وہ برجی پر چڑھ کر خود دیکھتا اس کا باپ وہاں آیا اور اس کے پیچھے پیچھے اماں۔

یزید پیچھے نہیں رہنا چاہتا تھا۔ وہ لاپروائی سے چلتا ہوا اپنے باپ کے پاس آیا اور اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ عمر اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا لیکن نوکر پر غصہ سے نظر کی۔

"تمہیں یقین ہے، کوئی غلطی تو نہیں ہوئی؟"

"نہیں میرے آقا! میں نے خود ان لوگوں کو گاؤں سے گزرتے ہوئے دیکھا ہے۔ دو عیسائی سپاہی بی بی کے ساتھ ہیں۔ لوگ انہیں دیکھ کر ڈر گئے ہیں۔ ابن حد نے ان کو پہچانا اور مجھے کہا کہ میں تیزی سے جا کر آپ کو بتا دوں۔"

"واللہ۔ اتنے برسوں کے بعد۔ جاؤ جوان! واپس جانے سے پہلے کچھ کھالو۔ اماں تمہیں باورچی خانہ میں لے جائے گی۔ یزید! جاؤ۔ اپنی امی کو بتاؤ کہ میں ان سے بات کرنا چاہتا ہوں اس کے بعد اپنے بھائی اور بہنوں کو بتاؤ کہ آج رات ایک مہمان آ رہا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ سب یہاں اکٹھے ہو جائیں تاکہ سب عزیز مل کر مہمان کا استقبال کریں۔ دوڑ کے جاؤ"

زہرہ بنت نجمہ نے موچی سے ایک آدھ بات کی گو اس نے گاؤں کے بزرگوں میں سے کسی کے سلام کا جواب نہیں دیا۔ اس نے محض سر کو ذرا سا ہلا دیا اور بس۔ جیسے ہی ان کی گاڑی گاؤں کی تنگ گلیوں سے ہوتی ہوئی درختوں کے جھنڈ کے قریب پہنچی جہاں سے گھر صاف دکھائی دیتا تھا۔ اس نے گاڑی بان کو کہا کہ وہ ندی کے ساتھ ساتھ کچے راستہ پر چلے۔

"پانی کے ساتھ ساتھ چلتے رہو۔ جب تک کہ بنو حزیل کا گھر نظر آئے" یہ کہتے ہوئے

اس کی کمزور آواز لرزنے لگی۔ اسے گمان بھی نہیں تھا کہ وہ اپنی زندگی میں پھر یہ گھر دیکھ سکے گی۔ برسوں کے رکے ہوئے آنسو ابل پڑے جیسے طوفانی دریا اپنے کناروں سے باہر نکل آتا ہے۔ اب صرف یادیں ہی ہیں۔ اس نے خود کو تسلی دی۔

وہ سمجھتی تھی کہ نصف صدی کے دوران اس نے سب کچھ بھلا دیا ہے۔ زندگی کتنے فریب دیتی ہے۔ پہلی ہی نظر میں اس نے دیکھ لیا کہ کچھ ضائع نہیں ہوا ہے مانوس منظر پر نظر پڑی تو اسے ہر چیز اتنی صاف دکھائی دینے لگی کہ اسکے دل پر ایک چوٹ پڑی۔ ادھر اناروں کا باغ تھا۔ گاڑی کے گھوڑے کی رفتار دھیمی پڑی تو وہ مسکرائی۔ وہ لمبے سفر سے تھک گیا تھا اور پانی پینے کے لئے رکا۔ حالانکہ یہ خزاں کا موسم تھا پھر بھی وہ آنکھیں بند کرتی تو اسے باغ کی خوشبو آتی۔

"تمہیں یقین ہے کہ کسی نے تمہیں نہیں دیکھا؟ اس کی آواز میں گھبراہٹ اور تڑپ تھی صرف چاند نے! مجھے تمہارے دل کی دھڑکن سنائی دے رہی ہے۔"

اس رات اور کوئی گفتگو نہیں ہوئی اور جھٹ پٹے سے پہلے ہی وہ رخصت ہو گئے۔

"تم میری بیوی بنو گی؟"

"مجھے اور کوئی نہیں چاہئے"

اس نے آنکھیں کھولیں اور سورج کی آخری شعاؤں کا لطف لیا۔ یہاں کچھ بھی نہیں بدلا تھا وہی اونچی اونچی دیواریں' وہی برج' دروازے ہمیشہ کی طرح کھلے ہوئے تھے۔ ہوا میں سردی کا اثر تھا۔ زمین کی خوشبو اس کے حواس پر چھا گئی۔ پانی کی دھیمی دھیمی آواز اور ریشم کی طرح بہتی ندی جو حمام تک جاتی تھی۔ سب کچھ ویسا تھا جیسا برسوں پہلے تھا اور عبداللہ کا بیٹا عمر اب اس جاگیر کا مالک تھا۔ اسے لگا کہ اسکے ساتھ جو عیسائی سپاہی تھے وہ کچھ متفکر نظر آ رہے تھے۔ اور فوراً ہی اس کا سبب بھی اسے معلوم ہو گیا۔ تین گھوڑے سوار جنہوں نے سفید بھڑکیلے لباس اور عمامے پہنے ہوئے تھے اسکی طرف بڑھے۔ گاڑی رک گئی۔

عمر بن عبداللہ اور اس کے دونوں بیٹے زہیر اور یزید گھوڑوں کو لگام دے کر رک گئے اور انہوں نے بزرگ خاتون کو سلام کیا۔

"السلام علیکم۔ میرے والد کی بہن! خوش آمدید"

"جب میں گئی تھی تو تم چار برس کے تھے۔ تمہاری ماں مجھے ہمیشہ تاکید کرتی تھی کہ تم پر سخت نظر رکھوں۔ ادھر آؤ"

عمر گھوڑے سے اترا اور چل کر گاڑی کی طرف گیا۔ اس نے اس کے سر کا بوسہ لیا۔

"گھر چلو" اس نے سرگوشی سے کہا۔

جب وہ دروازے پر پہنچے تو پرانے ملازم انتظار کر رہے تھے۔ اماں لنگڑاتی ہوئی آگے بڑھی اور اس سے بغلگیر ہوئی۔ زہرہ گھوڑے سے اتر آئی۔

"بسم اللہ۔ بسم اللہ۔ اپنے پرانے گھر میں خوش آمدید۔ بی بی" اسے خوش آمدید کہتے ہوئے اماں کے آنسو نکل آئے۔

"میں خوش ہوں کہ تم ابھی زندہ ہو عامرہ! واقعی خوش ہوں۔ میں ماضی کو بھلا چکی ہوں اور اب لوٹنا نہیں چاہتی ہوں" جب دونوں معمر عورتوں کی آنکھیں ملیں تو زہرہ نے کہا۔

پھر اسے اندر لایا گیا۔ جہاں زبیدہ' ہند اور کلثوم نے ادب سے جھک کر اس کا استقبال کیا۔ زہرہ نے ایک ایک پر نظر کی اور پھر مڑ کر دیکھا کہ یزید بھی اس کے پیچھے پیچھے آ رہا ہے۔ وہ پیچھے ہی تھا۔ زہرہ نے اس کا عمامہ پکڑا اور ہوا میں اڑا دیا۔ اس پر ماحول کا کھچاؤ کچھ کم ہوا اور سب ہنس پڑے۔ زہرہ نے گدے پر جھک کر یزید کو گلے لگا لیا۔ لڑکا بھی شفقت کو محسوس کر کے اس سے لپٹ گیا۔

"بڑی پھوپھی زہرہ! اماں نے مجھے بتایا تھا کہ آپ غرناطہ میں چالیس برس تک میرستان میں قید رہیں۔ لیکن آپ مجھے پاگل نہیں لگتیں۔"

عمر نے گھور کر بیٹے کو دیکھا اور خاندان کے تمام افراد گھبرا گئے۔ لیکن ہند نے ایک قہقہہ لگایا:

"مجھے یزید سے اتفاق ہے۔ آپ پہلے کیوں نہیں آئیں؟" زہرہ مسکرائی۔

"پہلے میرا خیال تھا کہ یہاں میرا آنا کوئی پسند نہیں کرے گا پھر میں نے اس پر سوچا ہی نہیں۔"

اماں دو ملازماؤں کے آگے آگے تولیے اور صاف کپڑے لئے ہوئے داخل ہوئی۔

"السلام علیکم بی بی! حمام تیار ہے۔ یہ لڑکیاں آپ کی خدمت کریں گی۔"

"شکریہ عامرہ! اس کے بعد مجھے کھانے کو کچھ چاہئے۔"

"کھانا تیار ہے پھوپھی! زبیدہ بولی۔ ہم کھانے پر آپ کا انتظار کر رہے تھے۔"

اماں نے زہرہ کا ہاتھ تھاما اور وہ چلتے ہوئے صحن میں پہنچ گئیں پیچھے پیچھے دو خادمائیں تھیں جب وہ ذرا دور نکل گئیں تو ہند نے پوچھا۔

"ابو! بڑی پھوپھی زہرہ پاگل نہیں ہیں۔ ہے نا! کیا وہ کبھی پاگل تھیں؟"

عمر نے کندھے جھٹکائے اور ایک اچٹتی ہوئی سی نظر زبیدہ پر ڈالی "بیٹا! مجھے معلوم نہیں۔ ہم سب کو یہی بتایا گیا کہ قرطبہ میں ان کا دماغ الٹ گیا تھا۔ انہیں یہاں واپس بھیج دیا گیا تھا لیکن انہوں نے شادی سے انکار کر دیا اور پہاڑیوں میں گھومنا شروع کر دیا اور ملحدانہ شعر پڑھنے لگیں۔ کم از کم مجھے کبھی نہیں لگا کہ وہ بیمار ہیں۔ بات سیدھی سی تھی۔ میرے والد کو ان سے لگاؤ تھا اور وہ اس فیصلہ پر بہت ناخوش تھے لیکن ابن فرید بہت سخت گیر انسان تھے۔ ہمیں چاہئے کہ آخری عمر میں انہیں خوش رکھیں۔" ہند موضوع بدلنا نہیں چاہتی تھی۔

"لیکن ابو! آپ کیوں کبھی ان سے ملنے میرستان نہیں گئے۔ کیوں نہیں گئے؟"

"میرا خیال تھا کہ انہیں اس سے بہت دکھ ہو گا۔ مجھے کبھی کبھی یہ خیال آیا۔ لیکن کوئی چیز مجھے روک دیتی تھی۔ میرے والد ان سے ملنے جاتے تھے لیکن ہر مرتبہ واپس آنے پر وہ سخت اداس رہتے اور ہفتوں مسکراتے تک نہیں تھے۔ میرا خیال تھا کہ ان یادوں کو جھنجھوڑا نہ جائے۔ لیکن بیٹے! اب وہ یہاں آگئی ہیں اور خود ہی تمہارے سب سوالوں کا جواب دیں گی۔ پھوپھی زہرہ کبھی بھی اتنی محتاط نہیں تھیں"

"تم یہ نہ سوچنا کہ ہم نے ان کے وجود کو ہی بھلا دیا تھا۔" زبیدہ نے کہا۔ "پچھلے ہفتہ تک باقاعدہ ہر ہفتہ تمہارے والد اور ان کے بھائی حشام انہیں کپڑے اور پھل بھیجتے رہے"

"مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی۔" یزید نے بزرگوں کے سے انداز میں کہا اور اسے بڑا برا لگا کہ اس پر سب ہنسنے لگے اور اسے منہ پھیر کر اپنی مسکراہٹ چھپانی پڑی۔

اگر زہرہ کی صحیح الدماغی کے متعلق کچھ شکوک رہ بھی گئے تھے تو وہ رات کے کھانے پر دور ہو گئے۔ وہ اتنے اطمینان سے ہنستی اور باتیں کرتی رہیں جیسے وہ ہمیشہ سے یہیں رہتی رہی ہوں۔ ایک موقع پر جب گفتگو کا رخ اندلس کے المیہ کی طرف مڑ گیا تو بزرگ خاتون نے ایسی سیاسی بصیرت کا ثبوت دیا کہ زبیدہ حیران رہ گئی۔

"ہمیں زوال کیوں آیا؟ ہم بیوقوفوں کی طرح غیرت کے چکر میں پڑ گئے۔ تمہیں پتہ ہے ہند کہ یہ کیا ہے؟ یزید تمہیں!"

"نہیں۔ احمق ہوتے ہیں جو درگذر نہیں کرتے۔"

آخر ہند نے ہی وہ سوال پوچھا جو سب کے ذہن میں تھا۔

"بڑی پھوپھی۔ آپ کو میرستان چھوڑنے کی اجازت کیسے ملی یہ کیسے ہوا؟"

بزرگ خاتون کو واقعی اچنبھا سا ہوا۔ کیا تمہیں بالکل پتہ نہیں؟"

سب نے انکار میں سر ہلائے۔

"اس جگہ ہم ساری دنیا سے بالکل کٹے ہوئے تھے۔ سارے غرناطہ میں یہی باتیں ہو رہی ہیں کہ میرستان میں کیا ہوا۔ میرا خیال تھا آپ کو معلوم ہو گا" وہ اپنے پوپلے منہ سے ہنسنے لگی۔ "بہتر ہے میں تمہیں بتا ہی دوں بھتیجی! کیا کوئی میٹھی چیز ہے؟"

پیشتر اس کے کہ زبیدہ کچھ بولے۔ اماں! جو بڑی مستعدی سے انتظار کر رہی تھی کہ کھانا کب ختم ہو۔ ایک دم سے بولی۔ "کیا بی بی کچھ بہشتی مشروب پسند کریں گی؟"

"بہشتی مشروب! تمہیں یاد ہے عامرہ؟"

"ہاں۔ مجھے یاد ہے۔" اماں نے کہا۔ "البتہ زہیر کے ناشتے کے لئے تو مجھے کچھ بنانا ہی تھا لیکن وہ دوپہر تک واپس نہیں آیا۔ تمام چیزیں صبح ہی سے تیار تھیں۔ آٹا گندھا ہوا تھا اور ہم اس کے پیڑے بنا کر پکانے ہی والے تھے۔ بس ابھی لائی۔"

یہ دیکھتے ہوئے کہ سب لوگ متوقع نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ زہرہ کو محسوس ہوا کہ اب وقت آگیا ہے کہ وہ انہیں سب کچھ بتا دے چنانچہ اس نے ان اہم واقعات کو بیان کرنا شروع کر دیا جنہوں نے اس کی زندگی میں ایک انقلاب برپا کر دیا تھا۔

"دس روز پہلے کچھ پادری آئے اور وہاں کے لوگوں کے مذہب کے متعلق سوالات کرنے لگے۔ ان میں سے اکثریت نبیؐ کے ماننے والوں کی تھی۔ باقی یہودی تھے اور چند ایک عیسائی پادریوں نے افسروں کو بتایا کہ طلیطلہ کے آرچ بشپ...."

"زمینس!" زہیر نے آہستہ سے کہا۔ اس کی بڑی پھوپھی مسکرائی۔

"وہی۔ اس نے پادریوں کو حکم دیا کہ لوگوں کو زبردستی عیسائی بنائیں اور اس کے لئے میرستان سے زیادہ موزوں اور کیا جگہ ہو سکتی تھی؟ ہمیں ڈرانے' دھمکانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ لیکن انہوں نے زیادتی کی۔ اب صرف ان ہی کو وہاں رہنے کی اجازت تھی جو حضرت مریم کے کنوارے ہونے اور عیسیٰؑ کے خدا کا بیٹا ہونے پر ایمان رکھتے تھے۔ تمہیں پتہ ہے کہ وہاں شراب پر پابندی ہے اور جب ان لوگوں نے پادریوں کی بھری ہوئی صراحیاں دیکھیں تو انہوں نے بڑی خوشی خوشی عیسیٰؑ کا خون پیا اور اس طرح آسانی کے ساتھ تبدیلی مذہب ہو گئی۔

"جب میری باری آئی تو میں نے کہا کہ غیر قانونی باتوں سے اجتناب میرے لئے کوئی مشکل نہیں۔ لیکن میں تمہیں یہ بتانا چاہتی ہوں کہ میں شیطان کا یہ پیشاب نہیں پیتی لیکن

پہلے ہی اپنی مرضی سے عیسائی ہو گئی ہوں۔ دراصل مقدس باپ! یہی وجہ ہے کہ میرے گھروالوں نے مجھے یہاں بھیج دیا۔ ان کا خیال ہے کہ میرا دماغ خراب ہو گیا ہے کہ میں تمہارے مذہب پر ایمان لے آئی ہوں بے چارے پادری بوکھلا گئے۔ انہوں نے سوچا تھا کہ میں واقعی پاگل ہوں اور وہ میری باتوں پر دھیان نہیں دیں گے۔ اس لئے میں نے اپنی گردن میں لٹکی ہوئی صلیب انہیں دکھائی۔ اور بچو! پتہ ہے۔ یہ ترکیب چل گئی۔

"اگلی صبح مجھے الحمرا میں کیپٹن جنرل کے سامنے پیش کیا گیا۔ ذرا سوچو۔ میرستان سے کوئی کاسٹلین بادشاہ کے نمائندے سے ملنے جائے! وہ بڑی عزت سے پیش آیا جو کچھ میرے ساتھ ہوا تھا میں نے بتایا۔ جب میں نے بتایا کہ میں ابن فرید کی بیٹی ہوں تو اسے تقریباً غش آگیا۔ اس نے کہا کہ اس نے والد سے تمہارے پردادا کی بہادری کی داستانیں سنی تھیں اور اس نے مجھے کچھ قصے سنائے بھی۔ مجھے بھی وہ معلوم تھے لیکن میں نے اس کو اس بات کا اندازہ نہیں ہونے دیا اور ایک ایک لفظ بڑے غور سے سنتی رہی اور موقع بہ موقع مسکراتی اور اشاروں سے داد دیتی رہی۔ ہم دونوں اس بات کو بھول گئے کہ اپنے والد کی سخت دماغی کی وجہ سے میں وہاں پر تھی۔ اس نے مجھ سے غرناطہ کی صورت حال کے بارے میں پوچھا۔ میں نے بتایا کہ چالیس برس پہلے میں نے خدا سے دعا کی تھی کہ مجھے کوئی بہت بڑی سعادت دے اور میری خواہش تھی کہ مرنے سے پہلے میری یہ دعا قبول ہو جائے۔ وہ کیا سعادت ہے۔ محترمہ؟" کیپٹن جنرل نے پوچھا۔ "مجھے اتنی قدرت دے کہ میں اس بات میں ٹانگ نہ اڑاؤں جس سے میرا کوئی تعلق نہ ہو"

جس طرح وہ کیپٹن جنرل کی اور خود اپنی نقلیں اتار رہی تھی اس پر یزید کو ہنسی آئی۔ اور وہ کھلکھلا پڑا۔ سب ہنسنے لگے یہاں تک کہ کلثوم بھی جو اس افسانوی کردار کے آجانے سے خاصی گھبرائی ہوئی تھی۔-زہرہ بھی اس بات سے خوش تھی کہ سب ان کی کہانیوں میں دلچسپی لے رہے تھے چنانچہ اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ "آپ کہیں گے کہ یہ میری بزدلی تھی۔ اور آپ سچے ہیں۔ بات یہ ہے۔ بچو! کہ میں وہاں سے نکلنا چاہتی تھی۔ اور اگر میں سچ بول دیتی..... اگر میں ان پر ظاہر کر دیتی کہ جب زمنس نے ہماری کتابیں جلائی تھیں تو مجھے کتنا برا لگا تھا تو اب بھی میں میرستان میں ہوتی یا مجھے کانونٹ میں بھیج دیا جاتا۔ تمہیں معلوم ہے کہ وہ میرستان سے ہم سب کو ہماری تہذیب کی یہ آتشبازی دکھانے لے گئے تھے تب مجھے اس گھر کا اور اس کی لائبریری میں رکھی ہوئی بہت سی کتابوں کا خیال آیا۔ ابن حزم' ابن خلدون' ابن رشد' ابن سینا' کم از کم یہاں یہ محفوظ رہیں گی۔ میں کیپٹن جنرل کو

یہ سب کچھ بھی بتا سکتی تھی لیکن انہیں کبھی یقین نہ آتا کہ میں پاگل نہیں ہوں اور میری لاپروائی نے وہ تاثر دیا جو میں دینا چاہتی تھی۔

"کیپٹن جنرل کھڑا ہوا۔ احتراماً جھکا اور اس نے میرے ہاتھ چومے۔ "محترمہ! مطمئن رہیے۔ جب بھی آپ چاہیں گی سپاہیوں کی حفاظت میں آپ کو آپ کے گھر پہنچا دیا جائے گا" پھر اس نے رخصت چاہی اور مجھے واپس میرستان میں لایا گیا۔ آپ میری حالت کا اندازہ کر سکتے ہیں میں نے پورے چالیس برس اس عمارت سے قدم باہر نہیں نکالا تھا۔ میں تو صبر سے موت کا انتظار کر رہی تھی اور پھر یہ سب کچھ ہو گیا۔ بہرحال۔ آپ ان سب کتابوں کو باہر بھیج دیں۔ قاہرہ کی یونیورسٹی یا فیض میں انہیں پہنچا دیں۔ یہاں یہ کبھی محفوظ نہیں رہ سکتیں۔ اب مجھے اور کچھ نہیں کہنا۔ میں امید کرتی ہوں کہ میں یہاں بوجھ بن کر نہیں رہوں گی۔"

"یہ آپ کا گھر ہے۔" عمر نے کسی قدر اعتماد سے کہا۔ "آپ کو تو یہاں سے جانا ہی نہیں چاہئے تھا"

ہند' زہرہ کے گلے سے لگ گئی اور اسے بوسہ دیا۔ بزرگ خاتون اس پر خلوص عقیدت کے اظہار سے بہت متاثر ہوئی۔

"مجھے نہیں معلوم تھا بڑی پھوپھی! کہ آپ عیسائی ہو گئی ہیں"

"مجھے بھی نہیں معلوم" زہرہ نے کہا اور یزید زور سے ہنسا۔

"کیا آپ نے محض وہاں سے نکلنے کے لئے یہ بہانہ بنایا؟۔ واقعی!"

زہرہ نے ہاں میں سرہلایا اور سب ہنسنے لگے لیکن یزید کسی بات پر پریشان تھا۔

"تو پھر آپ کو صلیب کہاں سے ملی؟"

"میں نے خود بنائی۔ اس جگہ وقت کا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔ میں نے وہاں لکڑی میں بہت سے نقش ونگار بنائے تاکہ میں خود کو مصروف رکھوں اور بالکل ہی پاگل نہ ہو جاؤں"

یزید اپنی جگہ سے اٹھ کر زہرہ کے قریب بیٹھ گیا۔ اور یہ دیکھنے کے لئے کہ وہ واقعی اصلی انسان ہے اس کے ہاتھ کو زور سے دبایا۔

مجھے پہلے ہی یقین ہو گیا ہے کہ میرا بھتیجا بھی اپنے باپ کی طرح ایک اچھا انسان ہے۔ تمہارے بچے تمہارے سامنے ڈرے ہوئے یا گھبرائے ہوئے نہیں رہتے ہم ایسے نہیں تھے۔ ہوں..... کچھ خوشبو آ رہی ہے۔ عامرہ کے ہاتھ میں اب بھی کمال ہے۔" اماں مکئی

کے کلچے لئے ہوئے اندر آئی اس نے انہیں کپڑے میں لپیٹا ہوا تھا تاکہ گرم رہیں اس کے پیچھے بونا تھا جو دھات کے ایک برتن میں ابلتا ہوا دودھ لئے ہوئے تھا۔ آخر میں عمیمہ تھی جو تازہ بھوری کھانڈ سے بھرا ہوا شکر دان لا رہی تھی۔ بونے نے جھک کر زہرہ کو سلام کیا جس کا اس نے جواب دیا۔

"بونے۔ تمہاری اماں ابھی زندہ ہے۔ یا مر گئی؟"

"وہ کوئی پندرہ برس پہلے مر گئی مالکن! وہ بھی آپ کے لئے دعا کرتی تھی۔"

"وہ اپنے لئے دعا کرتی تو شاید اب تک زندہ ہوتی"

اماں نے بہشتی مشروب تیار کرنا شروع کر دیا۔ اس کے ہاتھ ایک بڑے سے پیالے کے اندر تھے جہاں وہ کلچوں کے ٹکڑے کر رہی تھی۔ وہ آسانی سے ٹوٹتے جاتے تھے۔ وہ تازہ مکھن ملاتی جاتی اور انہیں نرم کرتی جاتی۔ پھر اس نے عمیمہ کو بلایا جو اس میں شوگر ڈالنے لگی اور اماں ہاتھوں سے اسے ملاتی رہی۔ آخر اس نے اپنی انگلیاں باہر نکالیں۔ زہرہ نے تالی بجائی اور اپنا پیالہ آگے بڑھایا۔ اماں نے اپنے ہاتھ سے اس کا پیالہ بھرا۔ دوسروں کو بھی اسی طرح ان کا حصہ دیا گیا۔ پھر اس پر گرم دودھ ڈال کر سب نے مزے لے لے کر کھایا۔ ان کو وہ اتنے مزے کا لگا کہ وہ پکانے والے کا شکریہ ادا کرنا ہی بھول گئے۔

"جنت!۔ واقعی یہ جنت ہے۔ کیا زبردست بہشتی مشروب ہے عامرہ! اب میں سکون سے مر سکوں گی۔"

"اماں! میں نے کبھی ایسا جنتی مزہ نہیں چکھا۔ اماں" یزید نے کہا۔

"یہ جنتی کھانا صرف میرے لئے تو نہیں بنا۔ کیوں اماں!" زہیر نے پوچھا۔

"اس کے ذائقہ سے مجھے اپنی جوانی کا زمانہ یاد آتا ہے" عمر بولا

اماں خوش تھی۔ تینوں گھر والوں اور مہمان نے کھلے عام اس کی تعریف کی تھی۔ آج اسے شکایت کا کوئی موقع نہیں تھا۔ اس سارے بے معنی اہتمام پر جو ابن فرید کے زمانہ سے چلا آتا تھا ہند دل ہی دل میں بہت ہنسی۔ یہ رسم ابن فرید کی پہلی شادی کے وقت سے قائم تھی۔

ہند کی خوابگاہ پھر زہرہ کے قبضہ میں آ گئی۔ اسے نئے سرے سے بزرگ خاتون کے لئے تیار کیا گیا تھا۔ ہند زنان خانہ میں ایک خالی کمرے میں منتقل ہو گئی تھی۔ جو اس کی ماں کے کمرے کے قریب تھا۔ تمام عورتیں اور اماں زہرہ کو اس کے کمرے تک پہنچانے گئیں۔ وہ صحن میں دروازے کی دہلیز پر کھڑی ہو کر آسمان کو دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھ سے ایک

آنسو ٹپکا۔ پھر ایک اور' میں ہر مہینہ اس صحن کو یاد کیا کرتی تھی۔ تمہیں یاد ہے کہ جب چاند پورا ہوتا تو انار کے درخت کا سایہ کیسا لگتا؟ عامرہ۔ اگر چاند ہمارے پاس ہو تو ہمیں ستاروں کی کیا ضرورت؟ اماں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور بڑے آرام سے اسے دروازے میں سے لے گئی زبیدہ' ہند اور کلثوم نے اسے شب بخیر کہا۔

صحن کے دوسرے حصہ میں زہرہ کا بستر لگانے کے بعد عمیمہ اپنے کمرے میں جا رہی تھی کہ ایک ہاتھ نے اسے پکڑ لیا اور اسے ایک کمرے میں گھسیٹ لیا۔

"نہیں۔ آقا!" اس نے سرگوشی کی آواز میں کہا۔

زہیر نے اس کی چھاتی کو ٹٹولا لیکن جب اس کے ہاتھ ادھر ادھر چھونے لگے تو لڑکی نے اسے روک دیا۔

"آج نہیں الفعل میں صاف نہیں ہوں۔ اگر یقین نہیں تو ہاتھ ڈال کر خود دیکھ لو" اس نے ہاتھ کھینچ لئے! اور کوئی جواب نہیں دیا۔ عمیمہ جلدی سے دروازے میں سے نکلی اور غائب ہو گئی۔

ہند اور کلثوم اپنی ماں کی خوابگاہ میں آئیں اور بستر پر بیٹھ کر زبیدہ کو کپڑے بدلتے ہوئے دیکھتی رہیں۔

عمر بیچ کے دروازے سے دوسرے کمرے میں داخل ہوا۔

"آج کی شام کیسی عجیب تھی۔ وہ میرے والد سے صرف دو برس چھوٹی تھیں۔ مجھے ان میں اپنے باپ کی بہت جھلک نظر آتی ہے۔ وہ ایک دوسرے کے کتنے قریب تھے! مجھے معلوم ہے کہ ان کے چلے جانے کا انہیں کتنا دکھ تھا۔ کیسی تکلیف وہ بات تھی۔ زندگی کیسے تباہ ہو گئی۔ زہرہ یقیناً باکمال ثابت ہوئی تمہیں معلوم ہے وہ شاعری بھی کرتی تھی؟ اور اچھی شاعری۔ میرے دادا جب وہ ان سے ناراض تھے تو اس وقت بھی اس کے معترف تھے...."

دروازے پر دستک ہوئی اور زہیر اندر داخل ہوا۔ "مجھے آوازیں آئیں اور میں سمجھا کہ فیملی کانفرنس ہو رہی ہے۔" "یزید کے بغیر تو فیملی کانفرنس نہیں ہو سکتی" ہند بولی وہی ان میں سنجیدگی سے حصہ لیتا ہے۔ ابو ہمیں بڑی پھوپھی کے متعلق بتا رہے تھے کہ تم کود پڑے۔"

"یہی تو میں سننے آیا ہوں۔ روز تو ایسا نہیں ہوتا کہ کوئی مردہ جی اٹھے۔ وہ بھی کیا عجیب عورت رہی ہوں گی۔ پچاس برس یہاں سے خانہ بدر رہیں۔ آج ان کا رویہ کتنا اچھا تھا نہ تلخی نہ غصہ۔ بالکل پرسکون۔"

"ان کے ہم سے ناراض ہونے کی کوئی وجہ نہیں"۔ ان کے والد نے کہا۔ "ہم نے انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا"

"ابو! کس نے انہیں نقصان پہنچایا کس نے؟ کیوں؟ بڑی پھوپھی زہرہ کا جرم کیا تھا؟"

ہند کے لہجے میں غصہ تھا جسے اس نے چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ زہرہ کے متعلق وہ کچھ بھی نہیں جانتی تھی۔ صرف اماں کا کوئی اشارہ یا کوئی اڑتی سی بات جو اس نے اشبیلیہ میں اپنے رشتہ کے بھائی بہنوں سے سنی تھی۔ اس کے علاوہ وہ کچھ نہیں جانتی تھی۔ آج وہ اس بزرگ خاتون کی پروقار شخصیت سے بہت متاثر ہوئی تھی۔ ان کہانیوں کا اس حقیقت سے کوئی تعلق نہیں تھا جو آج اس نے دیکھی تھی جبکہ اصلی زہرہ نے یہاں اپنے آبائی گھر میں غرناطہ کے ہنگاموں سے پناہ لی تھی۔

عمر نے زبیدہ کی طرف دیکھا جس نے سر کی جنبش سے اپنی رضا مندی کا اظہار کیا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ بچوں کو زہرہ کی پراسرار شخصیت کے متعلق جتنا بھی یاد ہو بتا دیا جائے۔ بہت سی باتیں خود اسے بھی معلوم نہیں تھیں۔ جو لوگ ابھی تک بقید حیات تھے ان میں سے صرف اماں کو تفصیلات معلوم تھیں اور شاید ایک اور شخص کو— بڑے چچا میگوئل کو چھوڑ کر جسے شاید ہر بات کا پتہ تھا۔

"یہ بہت پرانی بات ہے" عمر بن عبداللہ نے کہنا شروع کیا۔ "اتنی پرانی کہ مجھے سب باتیں یاد بھی نہیں۔ میں اب جو کچھ تمہیں بتانے لگا ہوں میری اماں نے مجھے بتایا تھا جو زہرہ کو بہت پسند کرتی تھیں اور ان سے بہت لگاؤ رکھتی تھیں۔"

"مجھے صحیح طرح تو نہیں معلوم کہ زہرہ کی مشکلات کب شروع ہوئیں لیکن میری اماں کہا کرتی تھیں کہ یہ اس دن سے شروع ہوئیں جب تمہارے پردادا مرحوم اپنی نئی دلہن۔ بی بی اسمی۔ کو لے کر الحزیل واپس آئے۔ وہ زہرہ سے چند ہی سال بڑی تھی اور اس نے یہاں کے طور طریقوں کو کسی طرح بھی بدلنے کی کوشش نہیں کی۔ اس نے گھر کا سارا انتظام دادی مریم کے سپرد کر دیا۔ کہتے ہیں کہ شروع شروع میں وہ اتنی گھبرائی ہوئی تھی کہ نوکروں کو بھی کوئی ہدایات نہیں دیتی تھی۔ زہرہ اور میرے والد مریم سے بہت قربت رکھتے تھے۔ انہوں نے ماں کے مرنے کے بعد انہیں پالا تھا۔ چنانچہ انہوں نے ان کے دل میں ماں کی جگہ لے لی تھی۔ بہن بھائی کو اسمی کی آمد مداخلت محسوس ہوئی۔ کوئی ایسی ویسی بات نہیں ہوئی لیکن ان کے اور باپ کے درمیان ایک خلیج پیدا ہو گئی۔ اس معاملہ میں بے شک ملازموں نے بڑا گندہ کردار ادا کیا۔ بہرحال انہیں اسمی کے خاندان کا پتہ تھا۔ وہ ایک

عیسائی باورچن تھی جس کی ماں بھی باورچن تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ ابن فرید نے اسے ڈان الویرو کی ملازمت سے چھڑا کر اپنے ہاں بلا لیا تھا۔ اس کی وجہ سے بہت باتیں بنیں سارے گاؤں میں چرچا رہا اور خاص طور سے باورچی خانہ میں۔ تم سوچتے ہو گے کہ باورچیوں کو اس بات سے کوئی ہمدردی تھی کہ ان میں سے ایک کو بڑا مرتبہ مل گیا ہے۔ مگر ایسا کچھ نہیں تھا۔ خاص طور سے بونے کے باپ نے بڑا زہر پھیلایا۔ آخر ایک دن ابن فرید نے اسے بلایا اور ڈانٹ پلائی کہ وہ خود اسے صحن میں پھانسی پر چڑھا دے گا۔ دھمکی نے کام کیا۔ آہستہ آہستہ معاملہ ٹھنڈا ہو گیا۔ جوش کم ہو گیا۔

"مشکل یہ تھی کہ ملازم اس بات کی بھی پروا نہیں کرتے تھے کہ بچے پاس ہیں اور زور زور سے باتیں کرتے رہتے تھے اور یوں باتیں بڑھتی گئیں۔ زہرہ سخت بد دل ہوئی۔ ابن فرید ان کی زندگی کا مرکز تھے۔ انہوں نے اسمی سے شادی کر لی اور زہرہ کو محسوس ہوا کہ جیسے ان کے ساتھ بے وفائی کی گئی ہے۔ صرف اپنے والد کو جتانے کے لئے انہوں نے شادی کے ہر پیغام کو ٹھکرا دیا۔ وہ اپنے آپ میں سمٹتی چلی گئیں۔ وہ کئی کئی دن کسی سے بات نہ کرتیں۔

"ظاہر ہے ابن فرید کو پتہ تھا کہ ان کی شادی کے کیا نتائج ہوں گے۔ وہ ان مسائل سے بے خبر نہیں تھے۔ اسی لئے انہوں نے قرطبہ سے خادماؤں کی ایک فوج اسمی کی خدمت کے لئے ملازم رکھ لی اس خیال سے کہ وہ اسمی کی وفادار رہیں گی۔ ان پر انہوں نے ایک بڑی عمر کی عورت کو مقرر کیا جو ہمارے ہاں عرصہ سے کام کرتی رہی تھی لیکن دادی نجمہ کے غصہ کی وجہ سے نکال دی گئی تھی۔ اس نے گاؤں میں دھوبن کا کام شروع کر دیا تھا۔

"اس عورت کا ایک بیٹا بھی تھا جس کا باپ یا تو قرطبہ میں انجیریں بیچتا تھا یا ایک گھریلو ملازم تھا جو ملاکا کی جنگ میں مارا گیا تھا... خدا ہی جانے۔ وہ بہت ہی ذہین لڑکا تھا اور بنو حزیل کی مہربانی سے اس نے اچھی تعلیم حاصل کر لی تھی۔ وہ بھی میرے والد اور زہرہ کے ساتھ اسی استاد سے پڑھا کرتا تھا۔ ان کی بہ نسبت وہ بہت زیادہ پڑھتا تھا اور فلسفہ' تاریخ' ریاضی' دینیات اور طب پر بھی بہت زیادہ معلومات رکھتا تھا۔ وہ ہماری لائبریری کی کتابوں کا تمام گھروالوں سے زیادہ علم رکھتا تھا۔ اس کا نام محمد بن زیدون تھا۔ اس کی شکل صورت بھی اچھی تھی"۔

"تمہاری بڑی چچی کو اس سے محبت ہو گئی۔ ابن زیدون نے ان کو مایوسی کی دلدل سے نکالا اسی نے ان کو شعر کہنے کی ترغیب دی۔ اس گھر کی چاردیواری سے باہر کی دنیا بلکہ

اندلس سے بھی آگے کی دنیا پر غور کرنے پر اکسایا۔ اس نے ابن فرید کی شادی کے واقعات کی وضاحت کی اور زہرہ کو اس بات پر قائل کر لیا کہ اس میں بی بی اسمیٰ کا کوئی قصور نہیں تھا۔ اس طرح اس نے ان دونوں میں صلح کرادی۔"

حغالبًا یہی بات کہ جہاں وہ خود ناکام ہو گئے تھے وہاں یہ لڑکا کامیاب ہو گیا ابن زیدون سے ابن فرید کی سخت نفرت کا سبب بنی۔ ایک مرتبہ انہیں یہ کہتے ہوئے سنا گیا کہ اگر اس لڑکے نے اپنی زبان پر قابو نہ رکھا تو اس کی گردن اڑا دی جائے گی' انہوں نے لڑکے کو سزائیں دینی شروع کر دیں۔ ان کا اصرار تھا کہ وہ بھی دوسروں کی طرح کھیتوں میں کام کرے اور کوئی ہنر سیکھے۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ یوآن کا باپ اسے لکڑی کا کام سکھائے یا وہ ابن حد سے ریشمی جوتے بنانے سیکھے۔ لڑکا اپنی عمر کی نسبت بہت زیادہ عقلمند تھا۔ اس نے آقا کے غصہ کو بھانپ لیا لیکن اسے اس کی وجہ بھی معلوم ہو گئی اور وہ صحن سے پرے پرے رہنے لگا۔ اسمیٰ اور زہرہ دنوں نے ابن فرید کی منت کی کہ وہ لڑکے پر اتنی سختی نہ کریں۔ میرا خیال ہے کہ بالآخر دادی اسمیٰ انہیں اس بات پر راضی کرنے میں کامیاب ہو گئیں کہ ابن زیدون میرے والد اور زہرہ کو باقاعدہ ریاضی کی تعلیم دے۔

"میرے والد کم ہی پڑھائی کے لئے حاضر ہوتے۔ وہ اکثر شکار پر ہوتے یا غرناطہ میں عزیزوں کے پاس ٹھہرے ہوتے۔ چنانچہ ابن زیدون اور زہرہ کو روزانہ ملنے کا موقع مل گیا۔ اور جو ہونا تھا وہ ہوا....."

ہند کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

"لیکن وہ بھاگے کیوں نہیں۔؟ میں ہوتی تو فرار ہو جاتی"

"ابھی سب باتیں آتی ہیں ہند! صبر کرو۔ ایک مشکل اور بھی تھی اور وہ ایک اور نوجوان عورت تھی وہ بھی زہرہ کی طرح بہت خوبصورت تھی لیکن اس کے برخلاف وہ ایک ملازم کی بیٹی تھی اور گھر میں ملازمہ کی حیثیت میں کام کرتی تھی وہ ہماری عمیمہ سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھی وہ بہت ذہین تھی لیکن اس نے باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی تھی اور وہ بھی ابن زیدون سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ قدرتی بات ہے کہ ابن فرید کو یہ بات بہت موزوں لگی اور انہوں نے دونوں خاندانوں کو شادی کی تیاریاں کرنے کا حکم دیا۔

"زہرہ پاگل ہو گئیں۔ شاید مجھے یہ لفظ استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ یوں کہو کہ وہ سخت جنونی کیفیت میں مبتلا تھیں جب ابن زیدون نے انہیں بتایا کہ کیا تجویز کیا جا رہا تھا۔ انہوں نے اسے تاکید کی کہ رات کو گھر کے باہر اناروں کے جھنڈ میں ملے۔"

ہند نے قہقہہ لگایا۔ جس پر زہرہ کے علاوہ باقی سب بھی مسکرانے لگے۔ باپ نے پوچھا "کہ کیا بات ہے؟"۔

"کچھ چیزیں کبھی نہیں بدلتیں۔ کیوں بھیا؟ ذرا سوچو وہ اناروں کے جھنڈ میں ملتے ہیں" زہیر کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اس کا باپ اشارے کو سمجھ گیا۔ مسکرایا۔ اور اپنے بڑے لڑکے سے توجہ ہٹاتے ہوئے پھر زہرہ کی کہانی سنانے لگا۔

"وہ رات انہوں نے میاں بیوی کی طرح گزاری۔ اگلی صبح زہرہ دادی اسمیٰ کے پاس گئیں اور انہیں سب کچھ بتا دیا۔ اسمیٰ ششدر رہ گئیں کہ وہ کسی بھی قیمت پر انہیں ایک ملازمہ کے بیٹے سے شادی نہیں کرنے دیں گی......"

"لیکن....." ہند نے کچھ کہنا چاہا لیکن اپنے باپ کی تیوری پر بل دیکھ کر رک گئی۔

"ہاں ہند! مجھے معلوم ہے۔ لیکن ایسی باتوں کی کوئی منطق نہیں ہوتی۔ اسمیٰ نہیں چاہتی تھیں کہ زہرہ ان کی جیسی غلطی کریں۔ یقیناً یہ متضاد باتیں ہیں لیکن غیر معمولی نہیں۔ تمہاری ماں کو یاد ہو گا کہ جب بڑے چچا رحیم اللہ نے ایک طوائف سے شادی کی تو وہ تمام بڑی چچیوں میں سب سے زیادہ پاکباز نکلی۔ شوہر کی زبردست وفادار اور ہر طرح کی جنسی بے راہروی کی سخت مخالف اور ہر برائی سے متنفر۔ غالبًا یہ اسی بات کا نتیجہ ہے جسے ابن خلدون سماجی حیثیت کی تبدیلی سے پیدا ہونے والے تذبذب کا نام دیتا ہے۔ جب تم سب سے نچلی سطح سے سب سے بلند سطح پر پہنچ جاؤ تو تم ہمیشہ نیچے والوں کو حقارت سے دیکھو گے۔

خیر! تو کہانی یوں ہے کہ ایک رات جب زہرہ اور ابن زیدون اپنے پسندیدہ جھنڈ میں تھے تو زہرہ کی رقیب چپکے چپکے ان کے پیچھے پہنچ گئی' اس نے سب کچھ دیکھا۔ سب کچھ۔ اگلے روز اس نے سیدھی ابن فرید کو ساری بات بتا دی۔ انہوں نے اس کی بات پر ذرا بھی شک نہیں کیا۔ انہیں لگا کہ جیسے دھوبن کے بیٹے کے لئے ان کی نفرت صحیح ثابت ہوئی۔ گرجدار آواز میں چلا کر انہوں نے کہا کہ جو اس لڑکے کو پکڑ کر لائے گا اسے پانچ طلائی دینار ملیں گے۔

"میرا خیال ہے کہ اگر اس دن ابن زیدون پکڑا جاتا تو وہ اسی وقت اسے خسی کرا دیتے۔ یہ تو اس عاشق کی خوش قسمتی تھی کہ اگلے دن اسے سویرے ہی کسی کام سے غرناطہ بھیج دیا گیا۔ جب دادی اسمیٰ نے بتایا کہ اگر وہ واپس آیا تو اس کا کیا حشر ہو گا تو اس کی ماں نے گاؤں سے ایک دوست کو بھیجا کہ وہ اسے خبردار کر دے چنانچہ ابن زیدون غائب ہو گیا۔ ابن فرید کے جیتے جی وہ کبھی گاؤں میں نظر نہیں آیا......"

"ابو!" کلثوم نے بڑے نرم مودبانہ لہجے میں پوچھا۔ "بڑی پھوپھی کی رقیب کون تھی؟"

"اچھا۔ بیٹے! میرا خیال تھا کہ کل شام کے واقعات کے بعد تمہیں اندازہ ہو گیا ہو گا۔ وہ اماں تھی۔"

"اماں!" تینوں ایک ساتھ چلائے

"شش" زبیدہ نے کہا۔ "اگر تم ایسے چلاؤ گے تو وہ دوڑی ہوئی آجائے گی۔"

انہوں نے خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ہند سب سے پہلے بولی۔

"اور بڑی پھوپھی زہرہ؟"

"تمہارے پردادا نے میری دونوں دادیوں کے سامنے اسے بلایا۔ انہوں نے بہت منت کی کہ انہیں معاف کر دیا جائے۔ زہرہ بغاوت پر اتری ہوئی تھی۔ اب ہم ان سے پوچھ سکتے ہیں لیکن میری اماں نے بتایا کہ زہرہ نے غالباً یہ کہا تھا کہ صرف آپ ہی کو یہ حق کیوں ہو کہ اپنی مرضی سے شادی کریں؟ امی مجھے پسند ہیں اس لئے کہ وہ آپ کی پسند ہیں اور میری دوست بھی ہیں۔ اس پر انہوں نے ان کو مارا اور زہرہ نے انہیں برا بھلا کہا اور اتنا برا کہا کہ ابن فرید شرمندہ ہو کر باہر چلے گئے لیکن وہ اتنے شرمندہ نہیں تھے کہ معافی مانگتے۔ اگلے ہی روز وہ یہاں سے چلی گئیں اور پچھلی رات تک واپس نہیں آئیں۔ وہ قرطبہ میں کیا کرتی رہیں۔ مجھے نہیں معلوم۔ یہ باتیں تمہیں کسی اور سے پوچھنی پڑیں گی۔"

جس وقت عمر ابن عبداللہ کے بچے اپنی بڑی پھوپھی کی درد ناک کہانی پر غور کر رہے تھے ان کے تمام خیالات کا موضوع یہ تھا کہ اماں کو دفع کیا جائے اور سونے کی تیاری کی جائے۔ زہرہ نے بڑی احتیاط سے ابن زیدون کے ذکر سے اجتناب کیا تھا۔ وہ کوئی تلافی نہیں چاہتی تھی۔ بہرحال وہ آدھی صدی گنوا چکے تھے۔ ساری بات ختم ہو چکی تھی اور انہیں واقعی کوئی غصہ نہیں تھا۔ دونوں بزرگ عورتوں نے وہ شام بنو حزیل کے حالات پر غور کرتے ہوئے گذاری۔ زہرہ سب کچھ جاننا چاہتی تھیں اور اماں ہی وہ فرد تھی جو انہیں سب کچھ بتا سکتی تھی۔

اماں نے سارے واقعات بیان کئے اور کوئی تفصیل نہیں چھوڑی۔ ان کے بھائی عبداللہ کو ان کے پالتو سدھائے ہوئے گھوڑے نے گرا دیا اور وہ مر گئے اور پھر ان کی بیوی بھی ایک سال کے بعد ہی ان کے پیچھے پیچھے رخصت ہو گئی۔

"بستر مرگ پر بھی انہیں تمہارا خیال رہا اور انہوں نے عمر سے عہد لیا کہ وہ قرآن پر قسم کھائیں کہ تمہیں کھانا اور کپڑے بھیجتے رہیں گے۔ انہیں کبھی تمہاری جدائی کا دکھ نہیں بھولا"

زہرہ نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور ایک اداس سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر بکھر گئی۔

"ہماری بچپن کی یادیں کس طرح آپس میں الجھی ہوئی ہیں۔ تمہیں معلوم ہے؟" پھر وہ خاموش ہو گئی۔ شاید بھائی کی یاد نے دوسری یادیں تازہ کر دی تھیں۔ اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر اماں کو پرانے دن یاد آ گئے۔ وہ ضرور اس کے خیالوں میں آ رہا ہو گا۔ اماں نے سوچا۔ کاش وہ اس کے متعلق بات کرے۔ اب چھپانے کو ہے ہی کیا؟ شاید زہرہ نے اپنی پرانی رقیب کے خیالات کو بھانپ لیا زہرہ نے بڑی لاتعلقی کے سے انداز میں پوچھا۔ گو کہ اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا کہ محمد ابن زیدون کا کیا بنا۔ کیا وہ مر چکا ہے؟"

"نہیں بی بی! وہ زندہ ہے۔ اس نے اپنا نام بدل دیا وہ خود کو واحد الزندیق کہتا ہے اور یہاں سے چند میل دور پہاڑی پر رہتا ہے۔ زبیر ابن عمر اس سے باقاعدگی سے ملتا رہتا ہے۔ لیکن وہ اس کے ماضی کے متعلق کچھ نہیں جانتا' اسے گھر سے کھانا بھی بھیجا جاتا ہے۔ عمر بن عبداللہ کا حکم ہے۔ جب سے ہمیں پتہ لگا کہ غار میں رہنے والے کی اصلیت کیا ہے ہم اسے کھانا بھیج رہے ہیں۔ آج صبح ہی زبیر کئی گھنٹے اس کے ساتھ رہا۔"

زہرہ یہ خبر سن کر اتنی بیقرار ہوئی کہ اس کے دل کی دھڑکن اماں کے کانوں میں بندوق کی گولیوں کی طرح لگنے لگی

"میں اب سونا چاہتی ہوں۔ السلام علیکم۔ عامرہ!"

"وعلیکم السلام بی بی! اللہ آپ کو خوش رکھے"

"اس نے بہت عرصہ سے ایسا نہیں کیا۔ عامرہ!"

اماں چراغ لے کر کمرہ سے نکل گئی۔ باہر نکلتے ہوئے اس نے زہرہ کو کچھ بولتے ہوئے سنا۔ وہ کمرے میں واپس جانے ہی لگی تھی کہ اسے احساس ہوا کہ ابن فرید کی بیٹی اپنے آپ سے باتیں کر رہی تھی۔ اماں صحن کے پتھر پر جم گئی۔

"سب سے پہلی بار۔ یاد ہے محمد؟" زہرہ خود سے بول رہی تھی "ایسا تھا جیسے کلی کھل گئی۔ ہماری آنکھوں میں چمک تھی۔ امید تھی اور ہمارے دل اچھل رہے تھے۔ تم پھر میرے پاس کیوں نہیں آئے؟"

باب نمبر4

"اور کوئی راستہ نہیں۔ اگر ضروری ہوا تو ہم قید خانوں کی تاریکی کے ذریعہ ان کافروں کے ذہنوں کو صحیح عقیدہ سے منور کرنے کی کوشش کریں گے۔ میرے لائق احترام پیشرو پادری تلویرا نے دوسرے طریقے اختیار کئے مگر اسے ناکامی ہوئی۔ ذاتی طور پر میں سمجھتا ہوں کہ لاطینی۔ عربی ڈکشنری کے چھاپنے کا فیصلہ ایک غلط اقدام تھا' لیکن اس مسئلہ پر بہت کچھ کہا جا چکا ہے۔ شکر ہے کہ وہ دور ختم ہو گیا ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ غلط فہمی بھی کہ یہ کافر علم اور عقل کے ذریعہ ہم سے آملیں گے۔

عالی جناب! آپ ناخوش نظر آ رہے ہیں۔ مجھے اس بات کا پورا احساس ہے کہ سیاسی ضرورت کے تحت نرم رویہ شاید زیادہ مناسب ہو لیکن میری صاف گوئی کو معاف کیجئے۔ یہ ہزاروں روحوں کی نجات کا مسئلہ ہے اور مقدس کلیسا کی طرف سے مجھ پر یہ ذمہ داری عائد کی گئی ہے کہ میں ان کو بچاؤں اور تحفظ دوں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ کافر اگر اپنی مرضی سے ہمارے ساتھ نہیں آتے تو انہیں زبردستی راہ راست پر لایا جائے تاکہ ان کی نجات ہو سکے۔ محمدؐ کے دین کے کھنڈرات کی بنیادیں تک ہل گئی ہیں۔ یہ ہاتھ روکنے کا وقت نہیں ہے"۔

زمنس دی سیسنروس نے بڑی جذباتی تقریر کی۔ اس کی صرف ایک ہی مشکل تھی کہ جو شخص اس کے سامنے کرسی پر بیٹھا تھا وہ ڈون ا لیگو ہیر مینڈوزا تھا جو ٹینڈیلا کا کاؤنٹ تھا اور گرینیڈا کا میئر اور کیپٹن جنرل تھا۔ جسے مسلمان غرناطہ کہتے تھے۔ ڈون ا لیگو نے جان بوجھ کر اس ملاقات کے لئے عربی لباس پہنا ہوا تھا اور اس رویہ سے آرچ بشپ بہت پریشان تھا۔

"ایک روحانی پیشوا ہوتے ہوئے"۔ مقدس بزرگ! دنیاوی معاملات میں الجھنے کی آپ میں بڑی اہلیت ہے۔ کیا آپ نے اس معاملہ پر سنجیدگی سے غور کیا ہے؟ بادشاہ اور ملکہ نے یقیناً ہتھیار ڈالنے کی شرط پر خود دستخط کئے تھے۔ اس معاہدہ کو میں نے لکھا تھا۔ کیا ایسا نہیں ہے؟ مقدس باپ! جب ان کے سلطان سے ہماری ملکہ نے عہد کیا تو میں وہاں موجود تھا۔ ہم نے انہیں امن کی ضمانت دی تھی۔ الپین میں آج بھی پادری تلویرا کو بڑے احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اس لئے کہ اس نے معاہدہ کی پابندی کی تھی۔

"میں آپ سے بالکل دو ٹوک بات کروں گا۔ آرچ بشپ! جب تک آپ تشریف نہیں لائے تھے سلطنت میں کوئی بڑا مسئلہ پیدا نہیں ہوا تھا۔ آپ انہیں دلائل سے قائل کرنے میں ناکام ہو گئے ہیں اور اب آپ کلیسائی عدالت کے ہتھکنڈے استعمال کرنا چاہتے ہیں۔"

"کامیاب طریقے۔ جناب عالی! آزمائے ہوئے طریقے ہیں"۔

"ہاں۔ کیتھولک لوگوں پر آزمائے ہوئے طریقے۔ ان پر جن کی املاک پر آپ قبضہ کرنا چاہتے تھے اور یہودیوں پر جنہوں نے کبھی کہیں حکومت نہیں کی۔ جنہوں نے سونے کے سکے دیکر مذہب تبدیل کر کے اپنی آزادیاں حاصل کیں۔ یہاں یہ ہتھکنڈے نہیں چلیں گے۔ ان مسلمانوں میں اکثریت ان لوگوں کی ہے جو ہم سے ہی ہیں۔ میری اور آپ کی طرح۔ انہوں نے جزیرہ نما کے بہت بڑے حصہ پر حکومت کی ہے اور یہاں حکومت کرنے کے لئے انہوں نے انجیل کو نذر آتش کیا نہ کلیسا مسمار کئے اور نہ اپنی مسجدیں تعمیر کرنے کے لئے یہودیوں کی عبادت گاہوں کو آگ لگائی۔ یہاں ان کی جڑیں ہیں۔ انہیں کوڑوں اور تازیانوں سے ختم نہیں کیا جا سکتا۔ وہ مزاحمت کریں گے اور خون بہے گا۔ ان کا بھی اور ہمارا بھی۔"

سیسنروس نے کاؤنٹ کو بڑی حقارت سے دیکھا۔ اگر یہ حکومت کا کوئی اور سرکردہ رکن ہوتا تو آرچ بشپ اس کے منہ پر کہہ دیتا کہ وہ ایسی باتیں اس لئے کر رہا ہے کہ خود اس کے خون میں ملاوٹ ہے۔ اس میں افریقی خون ملا ہوا ہے لیکن یہ مردود کوئی عام آدمی نہیں تھا۔ ملک میں اس کے خاندان کی بڑی امتیازی حیثیت تھی۔ اسے اپنے شاعروں' انتظامی افسروں اور بہادروں پر فخر تھا جن کی بڑی مذہبی خدمات تھیں۔ مینڈوزا خاندان کا شجرہ نسب وزیگوتھک بادشاہوں سے ملتا تھا۔ سیسنروس اس آخری فضیلت کو نہیں مانتا تھا۔ اس کے باوجود یہ خاندان بہت پرشکوہ تھا۔ وزیگوتھ حوالے کے علاوہ بھی اس کی بہت اہمیت تھی۔ وہ اس خاندان سے اچھی طرح واقف تھا۔ وہ خود بادشاہ گر کارڈینل مینڈوزا کا مرہون

منت تھا' پھر یہ تو سارا ملک ہی جانتا تھا کہ کیپٹن جنرل کے چچا' سویل کے آرچ بشپ' نے ۱۴۷۸ء میں کاسٹلین تخت حاصل کرنے کے لئے ازابیلا کی کزن کو نیچا دکھانے میں اس کی مدد کی تھی۔ چنانچہ موجودہ بادشاہ اور ملکہ کی نظر میں مینڈوزا خاندان بہت محترم تھا۔ سیسنروس جانتا تھا کہ اسے احتیاط سے کام لینا چاہئے لیکن کاؤنٹ حد سے آگے بڑھتا جا رہا تھا اور چرچ اور حکومت کے باہمی تعلق کو نظر انداز کر رہا تھا۔ اس نے خاموش ہی رہنے کا فیصلہ کیا۔ اس شخص کی گستاخیوں کی سزا بعد میں بھی دی جا سکتی تھی۔ سیسنروس نے نہایت نرم لہجے میں پوچھا "کیا جناب عالی کلیسائی عدالت پر بڑے پیمانے پر بدعنوانیوں کا الزام لگا رہے ہیں؟"

"کیا میں نے بدعنوانیوں کا نام لیا ہے؟"

"نہیں۔ لیکن اشارہ تو..."

"اشارہ؟ کیسا اشارہ؟ میرے عزیز پادری سیسنروس! میں تو صرف یہ بتا رہا تھا کہ کلیسائی عدالت چرچ کیلئے زبردست دولت اکٹھی کر رہی ہے۔ ضبط شدہ املاک تنہا ترکوں کے خلاف تین جنگوں کے لئے کافی ہونگی۔ کیا ایسا نہیں ہے؟"

"جناب عالی! آپ اس املاک کا کیا بنائیں گے؟"

"مقدس باپ! مجھے بتایئے کہ کیا جنہیں آپ کافر کہتے ہیں ان کے بچے بھی گنہگار ہوتے ہیں؟"

"ہم سمجھتے ہیں کہ ایک خاندان کے افراد ایک دوسرے کے وفادار ہوتے ہیں"

"تو پھر ایک عیسائی جس کا باپ مسلمان ہو یا یہودی ہو اس پر کبھی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا؟"

"کبھی نہیں' شاید زیادہ سخت الفاظ ہیں"

"تو پھر یہ کیسے ہوا کہ توکیماوہ جو معروف یہودی خاندان سے ہے کلیسائی عدالت کا صدر ہو گیا؟"

"چرچ کے ساتھ اپنی وفاداری ثابت کرنے کے لئے اسے کچھ زیادہ ہی سخت ہونا پڑا۔ اتنا سخت کہ جس کی ضرورت غالباً ویزوگوتھ بادشاہوں کی شاخ کے کسی فرد کو نہ ہوتی"

"اب مجھے آپ کی منطق سمجھ میں آنے لگی ہے۔ خیر جو بھی ہو میں عربوں کو مزید ہزیمت کا شکار نہیں ہونے دوں گا۔ آپ بہت کر چکے۔ ان کی کتابوں کو جلانا بڑی شرم کی بات تھی۔ ہمارے نام پر ایک دھبہ تھا۔ طب اور سائنس پر ان کی تحریروں کا ساری دنیا

میں جواب نہیں"

"ان کو بچا لیا گیا ہے"

"یہ ایک وحشیانہ حرکت تھی۔ بندہ خدا' تم ایسے اندھے ہو کہ اتنا بھی نظر نہیں آتا"

"اس کے باوجود عالی جناب نے میرے احکام کو منسوخ نہیں کیا۔"

اب وار ڈون ا لیگو پر ہوا تھا اور اس نے غصہ سے پادری کو دیکھا۔ یہ ملامت بجا تھی۔ اس نے بزدلی کا ثبوت دیا تھا۔ سخت بزدلی کا۔ ایک درباری جو اسی وقت اشبیلیہ سے آیا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ ملکہ نے آرچ بشپ کو خفیہ حکم بھیجا ہے کہ لائبریریوں کو تباہ کر دے اسے اب پتہ چلا تھا کہ یہ جھوٹ تھا۔ سیسنروس نے اس درباری سے غلط بیانی کی تھی اور اسے کیپٹن جنرل کو یہ غلط خبر دینے پر اکسایا تھا۔ ڈون ا لیگو جانتا تھا کہ اسے دھوکہ دیا گیا ہے لیکن یہ کوئی جواز نہیں تھا۔ اسے حکم منسوخ کرنا چاہئے تھا اور سیسنروس کو مجبور کرنا چاہئے تھا وہ ازابیلا کا حکم دکھائے۔ پادری مسکرا رہا تھا۔ کاؤنٹ نے سوچا کہ یہ شخص پورا شیطان ہے۔ اس کے صرف ہونٹ مسکراتے تھے۔ آنکھیں نہیں۔

"بھیڑوں کا ایک گلہ اور ایک گڈریہ۔ جناب عالی! یہی اس ملک کی ضرورت ہے اور اسی طرح اس نئی دنیا کے خطرات میں ہماری بقاء ممکن ہے۔"

"آرچ بشپ! اللہ کے فضل سے آپ کو اپنی خوش نصیبی کا علم نہیں۔ اگر تمہارے یہ دشمن۔ یہودی اور مسلمان۔ جن کی وجہ سے تمہارا چرچ متحد ہے۔ یہ اگر نہ ہوتے تو عیسائی بے دین اس جزیرہ نما میں تہلکہ مچا دیتے۔ میں آپ کو حیران کرنا نہیں چاہتا۔ یہ کوئی اتنی گہری بات نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ بات آپ خود ہی سمجھ گئے ہوں گے"

آپ غلطی پر ہیں۔ جناب عالی! یہودیوں اور مسلمانوں کی تباہی ہی چرچ کے تحفظ کی ضمانت ہو سکتی ہے۔"

"اپنی اپنی جگہ ہم دونوں صحیح ہیں۔ کچھ لوگ میرا انتظار کر رہے ہیں۔ ہم مسئلہ پر آیندہ کسی روز گفتگو کریں گے۔"

اور یوں ایک دم سے ٹینڈیلا کے کاؤنٹ نے زمنس ڈی سیسنروس کو بتایا کہ ملاقات ختم ہو گئی۔ پادری نے اٹھ کر آداب کیا۔ ڈون ا لیگو کھڑا ہو گیا اور سیسنروس نے اسے عربی لباس میں سجا ہوا دیکھ کر ایک جھرجھری سی لی۔

"مجھے احساس ہے کہ میرے خیالات کی طرح میرا لباس بھی آپ کو ناپسند ہے"

"دونوں کا آپس میں ایک رشتہ ہے۔ جناب عالی"

کیپٹن جنرل نے بڑے زور کا قہقہہ لگایا۔ "مجھے آپ کے جبہ و دستار پر کوئی اعتراض نہیں تو آپ میرے لباس پر کیوں ناراض ہوتے ہیں؟ دربار میں جو پوشاک پہنی جاتی ہے اس سے تو یہ کہیں زیادہ آرام دہ ہے۔ ان تنگ پاجاموں اور کمریوں میں تو میں بالکل جکڑ جاتا ہوں۔ ان کا واحد مقصد تو صرف یہی لگتا ہے کہ خدا نے جن اہم اعضاء سے ہمیں نوازا ہے انہیں دبا کر رکھ دیا جائے۔ یہ لباس جو میں نے پہنا ہوا ہے اسے اس طرح بنایا گیا ہے کہ یہ ہمارے جسموں کو آرام دے اور یہ تمہارے چوغے سے اتنا مختلف بھی نہیں ہے۔ یہ پوشاک الحمرا میں پہننے کے لئے بنائی گئی ہے۔ کوئی اور لباس اس کے باریک اقلیدسی نقش و نگار میں نہیں چھپ سکتا۔ یہ بات پادری آپ بھی یقیناً سمجھتے ہوں گے۔ میرا خیال ہے کہ اللہ سے لو لگانے کے لئے مخصوص علامتوں کے علاوہ اور ذریعے بھی ہیں۔ لیکن شاید میں کافرانہ باتیں کر رہا ہوں اور میں آپ کو مزید روکنا یا پریشان کرنا نہیں چاہتا....."

پادری کے ہونٹوں پر ایک شرارت آمیز مسکراہٹ ابھری۔ وہ کچھ بڑبڑایا۔ تعظیماً" جھکا اور باہر نکل گیا۔ ڈون ا لیگو نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ کھڑکی کے نیچے البیسن کا وہ علاقہ تھا جہاں اس شہر کے مسلمان' یہودی اور عیسائی صدیوں سے ایک ساتھ رہتے اور کاروبار کرتے آئے تھے۔ کیپٹن جنرل اپنے خیالوں میں گم تھا۔ وہ ماضی اور حال پر غور کر رہا تھا جب ایک معنی خیز کھانسی کی آواز آئی اور اس نے پلٹ کر دیکھا کہ اس کا یہودی افسر خاص بن یوسف ایک ٹرے میں دو چاندی کے پیالے اور ان ہی کی طرح کا ایک کافی کا جگ لئے آ رہا تھا۔

"میری مداخلت معاف کیجئے۔ جناب عالی! لیکن آپ کے مہمان ایک گھنٹے سے آپ کے منتظر ہیں"

"اوہ۔ خدایا! انہیں اندر بھیجو۔ بن یوسف فوراً"

افسر واپس چلا گیا۔ جب وہ پلٹا تو ملاقات کے کمرے میں عمر اس کے ساتھ تھا۔

"عزت مآب عمر بن عبداللہ! جناب عالی!"

عمر نے روایتی انداز میں ڈون ا لیگو کو سلام کیا۔

"اسلام و علیکم۔ ڈون ا لیگو"

ٹینڈیلا کا کاؤنٹ ہاتھ پھیلائے ہوئے اس کی طرف بڑھا اور اس سے بغلگیر ہو گیا۔

"خوش آمدید۔ خوش آمدید۔ ڈون ہومر! آپ کیسے ہیں میرے پرانے دوست! کوئی

تکلف نہیں۔ تشریف رکھیں"

اب ڈون ا لیگو ان گدوں پر بیٹھ گیا جو کھڑکی کے قریب رکھے ہوئے تھے اور عمر کو اپنے پاس بیٹھنے کو کہا۔ افسر خاص نے کافی ڈالی اور دونوں کو پیش کی' ڈون نے اس کو اشارہ کیا اور وہ پیچھے چلتا ہوا دروازے سے باہر نکل گیا۔

"مجھے خوشی ہوئی کہ تم نے ابھی اسے ملازمت پر برقرار رکھا ہوا ہے۔"

"آپ اتنی دور چل کر اس لئے تو نہیں آئے کہ مجھے ملازموں کے انتخاب پر داد دیں۔ ڈون ہومر۔"

عمر اور ڈون ا لیگو ایک دوسرے کو بچپن سے جانتے تھے۔ ان کے دادا ایک دوسرے کے خلاف لڑے تھے۔ ان کی بہادری کی داستانیں لوک کہانیاں بن چکی تھیں۔ اس کے بعد یہ دونوں شجاع دوست بن گئے تھے اور باقاعدہ ایک دوسرے سے ملتے رہتے تھے۔ دونوں بزرگوں کو جنگوں کے نتائج کا علم تھا اور لوگ ان کے متعلق بنی ہوئی داستانوں کے مزے لیتے تھے۔ ۱۴۹۲ء سے پہلے ا لیگو اپنے دوست کو صرف ہومر کہتا تھا اس لئے کہ اس کے لئے "ع" کا بولنا مشکل تھا۔ اس کے ساتھ ڈون کا اضافہ نیا تھا۔ اس کی ابتداء غرناطہ کی جنگ سے ہوئی تھی۔ ناراض ہونے کی کوئی بات نہیں تھی۔ عمر کو احساس تھا کہ ڈون ا لیگو اب اس کا دوست نہیں تھا۔ اسے یہ بھی گمان تھا کہ ڈون ا لیگو بھی اس کے متعلق ایسے ہی سوچتا ہو گا۔ دونوں کئی مہینوں سے نہیں ملے تھے۔ یہ سب ایک دکھاوا تھا لیکن ظاہر داری تو کرنی ہی پڑتی ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ عیسائیوں کی فتح کے بعد ساری فراخدلی ختم ہو گئی تھی۔

تہواروں کے دنوں میں پھلوں اور مٹھائیوں کے تحائف کے تبادلے کے ذریعہ اچھے تعلقات برقرار تھے۔ صرف پچھلے سال کا کرسمس مختلف تھا۔ الحمرا میں کیپٹن جنرل کے گھر الحزبل سے کچھ نہیں آیا تھا۔ ڈون ا لیگو کو اس کا دکھ تھا لیکن حیرانی کسی کو نہیں تھی۔ حضرت عیسیٰؑ کے یوم ولادت سے چند ہفتہ پہلے ہی آگ کی دیوار اٹھی تھی۔ صرف عمر بن عبداللہ وہ واحد سرکردہ مسلمان نہیں تھا جس نے تقریبات کا بائیکاٹ کیا تھا۔

اسی خلاء کو پر کرنے کے لئے ڈون ا لیگو نے اپنے پرانے دوست کو بلا بھیجا تھا اور وہ اس کے پاس تھا۔ بالکل پرانے وقتوں کی طرح کافی پیتے ہوئے اس کی نظریں کھڑکی کے نقش و نگار پر جمی ہوئی تھیں۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس زمانہ میں یہاں عمر بن عبداللہ سلطان ابوعبداللہ کے برابر بیٹھا ہوتا اور کونسل کے ممبر کی حیثیت سے غرناطہ کے عیسائی ہمسایہ

مملکتوں کے تعلق کے بارے میں اسے مشورے دے رہا ہوتا۔

"ڈان ہومر۔ میں جانتا ہوں تم ناراض کیوں ہو؟ اس رات تمہیں گھر پر ہی رہنا چاہئے تھا۔ وہ کیا تھا جو تمہارے دادا نے میرے دادا سے کہا تھا؟ ہاں یاد آیا۔ اگر آنکھ نہ دیکھے تو دل نہیں دکھتا۔ میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ یہ میرا حکم نہیں تھا۔ یہ سیسنروس۔ ملکہ کا آرچ بشپ تھا جس نے تمہاری علمی کتابوں کو جلانے کا فیصلہ کیا تھا"

"تم غرناطہ کے کیپٹن جنرل ہو۔ ڈون ا لیگو"

"ہاں۔ لیکن میں ملکہ ازابیلا کی مرضی کے خلاف کیسے جا سکتا تھا؟"

"اسے معاہدہ کی شرائط یاد دلا کر جو آٹھ برس پہلے تمہارے ہی کمرے میں تمہارے اور میرے سامنے اس نے اور اس کے خاوند نے کیا تھا۔ لیکن تم خاموش رہے اور جس وقت اس شہر میں مہذب دنیا کی سب سے زیادہ شرم ناک حرکت کی جا رہی تھی تم نے منہ پھیر لیا۔ وہ تاتاری جنہوں نے بغداد کے کتب خانہ کو دوسو برس پہلے آگ لگائی تھی وہ جاہل وحشی تھے۔ جو لکھے ہوئے لفظ سے خوف زدہ تھے۔ ان کے لئے یہ ایک وحشیانہ حرکت تھی یہ ان کی جبلت میں تھی۔ جو کچھ سیسنروس نے کیا وہ اس سے کہیں زیادہ برا ہے۔ یہ ظلم ہے اور باقاعدہ سوچ سمجھ کر کیا گیا ہے..."

"میں...."

"ہاں تم... تمہارے چرچ نے اس درخت پر کلہاڑا چلا دیا جو تمہیں سایہ دے سکتا تھا۔ تمہارا خیال ہے اس سے تمہارے لوگوں کو فائدہ پہنچے گا۔ شاید لیکن کتنی دیر؟ سو برس؟ دو سو برس؟ یہ ممکن ہے لیکن آخر کار یہ مفلوج تہذیب تباہ ہو کر رہے گی۔ باقی یورپ اس سے فائدہ اٹھائے گا۔ یقیناً تم اس بات کو سمجھتے ہو کہ اس جزیرہ نما کا مستقبل تباہ کر دیا گیا ہے۔ جو لوگ کتابیں جلاتے ہیں۔ اپنے مخالفوں پر تشدد کرتے ہیں اور اپنے مذہب کے نہ ماننے والوں کو زندہ جلا دیتے ہیں وہ کبھی مضبوط بنیادوں پر کوئی تعمیر کھڑی نہیں کر سکتے۔ چرچ کی لعنت اس جزیرہ نما کو تباہ کر دے گی"

عمر نے محسوس کیا کہ وہ جذبات کی رو میں بہہ رہا ہے۔ چنانچہ وہ رک گیا اور ایک ہلکی مسکراہٹ اس کے چہرے پر نمایاں ہوئی۔

"معاف کرنا۔ میں یہاں کوئی وعظ کرنے نہیں آیا تھا۔ یہ مفتوحین کی حماقت ہوتی ہے کہ وہ اپنے فاتحین کو نصیحتیں کریں۔ اگر سچ پوچھو تو میں یہ جاننے کے لئے آیا تھا کہ ہمارے متعلق تمہارے کیا ارادے ہیں؟"

ڈون ا لیگو کھڑا ہو گیا اور اس بڑے دیوان میں ٹہلنے لگا۔ اس کے سامنے دو راستے تھے۔ وہ میٹھے الفاظ استعمال کر کے اپنے دوست کو مطمئن کر سکتا تھا کہ کچھ ہو یا نہ ہو بنوحزیل ہمیشہ آزادی کے ساتھ رہتے رہیں گے۔ وہ اس سے بھی آگے جانا چاہتا تھا لیکن اسے معلوم تھا کہ بات یوں نہیں ہے۔ گو اس کی خواہش تھی کہ یہ یونہی ہو۔ اس سے صرف ہومر کو غصہ آئے گا کیوں کہ یہ اسے عیسائیوں کی ایک اور چال لگے گی۔ کاؤنٹ نے فیصلہ کیا کہ ڈپلومیسی کو بالائے طاق رکھ دے۔ ”میرے دوست! میں تم سے کھری بات کروں گا۔ تم جانتے ہو کہ میری خواہش کیا ہے؟ تم میرا لباس دیکھ رہے ہو۔ میرے ملازموں میں مسلمان اور یہودی شامل ہیں۔ میرے لئے ان کے بغیر گرینیڈا ایسا ہی ہے جیسا نخلستان کے بغیر صحرا لیکن میں تنہا ہوں چرچ اور حکومت نے فیصلہ کر لیا ہے کہ تمہارے مذہب کو یہاں سے ہمیشہ کے لئے مٹا دیا جائے۔ اس کے لئے ان کے پاس سپاہی بھی ہیں اور ہتھیار بھی۔ میں جانتا ہوں کہ مزاحمت ہو گی لیکن یہ تمہارے لئے حماقت اور خود کشی ہو گی۔ اور آخر کار تمہیں شکست ہو گی۔ ہم سب سے زیادہ سیسنروس اس بات کو سمجھتا ہے۔ تم کچھ کہنے لگے تھے؟“

”اگر ہم نے بھی عیسایت کے ساتھ یہی سخت رویہ اختیار کیا ہوتا تو یہ صورت حال کبھی بھی پیش نہ آتی۔“

”منروا کے الو کی طرح بول رہے ہو۔ اس کے برخلاف تم نے اس جزیرہ کو مہذب بنانے کی کوشش کی۔ مذہب اور عقیدہ کا لحاظ کئے بغیر۔ یہ تمہاری شرافت تھی اور اب تمہیں اس کی قیمت دینی پڑے گی۔ جنگ کو ایک دن ختم ہی ہونا تھا۔ ایک کی فتح ہوتی اور دوسرے کو شکست فاش۔ تمہارے خاندان کو میرا مشورہ یہ ہے کہ فوراً عیسائی ہو جاؤ۔ اگر تم ایسا کرو تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں خود وہاں موجود ہوں گا بلکہ سیسنروس کو کھینچ کر وہاں لے جاؤں گا کہ وہ تمہارے لئے دعا کرے۔ حفاظت کی بہترین صورت یہی ہے۔ تمہارے گھر والوں کے لئے بھی اور تمہارے گاؤں کے لئے بھی۔ میرے دوست! تمہیں شاید میری باتیں بہت مایوس کن لگیں لیکن سب سے اہم بات یہ ہے کہ تم اور تمہارے سب لوگ محفوظ رہیں اور ان جاگیروں پر قائم رہیں جو صدیوں سے تمہاری ملکیت ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ قرطبہ کے بشپ نے بھی تمہیں سمجھانے کی کوشش کی تھی....“

عمر کھڑا ہو گیا اور اس نے ڈون ا لیگو کو سلام کیا۔

”میں تمہاری صاف گوئی پر خوش ہوں۔ تم سچے دوست ہو۔ لیکن میں تمہاری بات

نہیں مان سکتا۔ میرے خاندان والے رومن یا کسی دوسرے چرچ کی اطاعت پر تیار نہیں ہیں۔ ڈون ا لیگو! میں نے کئی مرتبہ اس بارے میں سوچا ہے۔ میں نے قتل کرنے کا بھی سوچا۔ گھبراؤ نہیں۔ میں نے سوچا کہ اپنے ماضی کو مار دوں' یادوں کو محو کر دوں لیکن یادیں بہت سخت ہیں۔ وہ مرنے پر تیار نہیں۔ ڈون ا لیگو مجھے ایک احساس ہوتا ہے کہ اگر ہماری حیثیتیں بدل جائیں تو تمہارا جواب بھی اس سے مختلف نہیں ہو گا۔“

”کہہ نہیں سکتا۔ ذرا میری طرف دیکھو۔ میرا خیال ہے کہ میں ایک اچھا مسلمان بن سکتا ہوں۔ چھوٹا یزید کیسا ہے۔ میرا خیال تھا کہ تم اسے ساتھ لاؤ گے“۔

”یہ مناسب موقع نہیں تھا۔ اب مجھے اجازت دیں۔ سلام علیکم۔ ڈون ا لیگو“۔

”خدا حافظ۔ ڈون ہومر! میری خواہش ہے کہ ہماری دوستی برقرار رہے۔“

عمر مسکرایا۔ لیکن باہر جاتے ہوئے وہ کچھ نہیں بولا۔ جنت العارف کے باہر' اس کا محافظ اور گھوڑا اس کے منتظر تھے۔ یہی وہ باغ تھا جہاں سب سے پہلے عمر کا زبیدہ سے سامنا ہوا تھا لیکن اس وقت عمر کو یادوں سے دلچسپی نہیں تھی۔ مینڈوزا کا چبھتا ہوا مشورہ ابھی اس کے کانوں میں گونج رہا تھا۔ باغ میں گرتے ہوئے پانی کی آواز کا سحر بھی اس کی توجہ نہ ہٹا سکا۔ کچھ عرصہ پہلے تک وہ یہ سمجھتا تھا کہ غرناطہ دشمن کے قبضہ میں ہے اور وقت آنے پر اسے آزاد کرا لیا جائے گا۔ کاسٹلین خاندان کے بہت سے اندرونی اور بیرونی دشمن تھے۔ اور جیسے ہی ان میں جنگ چھڑی یہ آزادی حاصل کرنے کا اچھا موقع ہو گا۔ اصل مقصد یہی ہے باقی سب مسائل ثانوی ہیں۔ شہر پر قبضہ ہو جانے کے بعد عمر عمائدین سے یہی کہتا رہا تھا۔

آگ کی دیوار نے سب کچھ بدل دیا تھا۔ اور اب کیپٹن جنرل نے اس کے خدشات کی تصدیق کر دی تھی۔ یہ بتوں کو پوجنے والے صرف فوجی فتح پر مطمئن نہیں تھے۔ سب سے پہلے تو یہی سوچنا حماقت تھی کہ وہ اپنے معاہدہ پر قائم رہیں گے۔ وہ تو ذہنوں پر قبضہ کرنا چاہتے تھے۔ دلوں کو چیرنا چاہتے تھے۔ نئی روح پھونکنا چاہتے تھے۔ جب تک کامیاب نہ ہو جائیں وہ چین سے نہیں بیٹھیں گے۔

غرناطہ جو اندلس میں نبیؐ کے ماننے والوں کے لئے جائے پناہ تھا اب ایک الاؤ میں تبدیل ہو گیا تھا۔

عمر نے سوچا۔ ”ہم یہاں رہے تو ختم کر دیئے جائیں گے“

وہ صرف بنی حزیل کے متعلق نہیں سوچ رہا تھا بلکہ اندلس میں اسلام کے مقدر کے

بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس کے محافظ نے دور سے اسے دیکھا۔ وہ حیران تھا کہ ملاقات اتنی مختصر رہی۔ وہ اپنے مالک کی تلوار اور پستول لے کر باغ کے دروازے کی طرف دوڑا۔ خیالوں میں ڈوبا ہوا عمر اصطبل تک آیا جہاں وہ گھوڑے سے اتر کر اپنے عمراد حشام کی قدیم رہائش گاہ کی طرف چلا۔

جس وقت اس کا باپ الحمرا میں تھا زہیر اپنے دوستوں کے ساتھ عوامی حمام میں صبح صبح غسل کر رہا تھا۔ بھاپ سے اچھی طرح غسل کرنے کے بعد حمام کے ملازمین نے انہیں ایک اسفنج سے ملنا شروع کر دیا اور ان پر اچھی طرح سے صابن ملا۔ پھر وہ ایک علیحدہ غسل خانے میں چلے گئے۔ یہاں وہ ستانے اور ایک دوسرے سے تبادلۂ خیال کرنے لگے۔ اس کے دوست زہیر کے شانے کے چھوٹے سے زخم کی داد دے رہے تھے۔

صرف غرناطہ میں اس قسم کے ساٹھ سے زیادہ حمام تھے۔ شامیں خواتین کیلئے مخصوص تھیں چنانچہ مردوں کو مجبوراً صبح کے وقت غسل کرنا پڑتا۔ آج صبح زہیر جس حمام میں گیا تھا وہ شرفاء کے بچوں اور ان کے مہمانوں کے لئے مخصوص تھا۔ گرمیوں کے موسم میں خاص طور پر لوگوں کی ٹولیاں یہاں نہانے کے لئے آتی تھیں۔ وہ چاندنی رات میں یہاں غسل کرتے۔ اس وقت وہاں ملازم بھی نہیں ہوتے تھے۔ لیکن اب شہر پر قبضہ کے بعد سے یہ سلسلہ کچھ کم ہو گیا تھا بلکہ ختم ہی ہو گیا تھا۔ اگلے وقتوں میں غرناطہ کی شکست سے پہلے حمام سیاسی اور سماجی معاملات پر گفتگو کے لئے بیٹھک کا کام دیتے تھے۔ اکثر بات عشق و محبت یا دوسرے کارناموں کے متعلق ہوتی۔ کبھی کبھی عشقیہ شاعری کی محفلیں بھی جمتیں اور شعروں پر بحث ہوتی۔ خصوصاً سہ پہر کے وقت اب تو سیاست کے علاوہ کوئی بات سوجھتی ہی نہیں تھی۔ تازہ مظالم کی باتیں۔ تبدیلی مذہب کے قصے۔ چرچ کو رشوتیں دینے کے تذکرے اور سب سے زیادہ وہ منحوس رات جو ان کے ذہنوں میں سلگ رہی تھی اور جس سے وہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے جو سیاست سے لاتعلق تھے۔ اب سب ہی ان باتوں پر غور کرنے پر مجبور تھے۔

زہیر کے حمام میں سیاسی جوش کچھ دبا ہوا تھا۔ دو روز پہلے تین اور فقیہہ تشدد سے ہلاک کر دیئے گئے تھے۔ خوف طاری ہوتا جا رہا تھا۔ سخت مایوسی اور بے بسی کا عالم تھا۔ زہیر جو اب تک مسلمان معزز گھرانوں کے فرزندوں کی باتیں سن رہا تھا ایک دم سے اونچی آواز میں بولا:

"ہمارے سامنے راستے بالکل واضح ہیں۔ مذہب تبدیل کریں۔ مارے جائیں یا لڑتے

لڑتے جان دیدیں"

ازابیلا اور فرڈی نینڈ کے شہر میں داخل ہونے سے پہلے جو افراتفری ہوئی اس میں موسیٰ بن علی کے دو بھائی مارے جا چکے تھے۔ اس کا باپ غرناطہ کے مغرب میں الحاما کی چوکی کا دفاع کرتے ہوئے کام آ گیا تھا۔ اس کی ماں موسیٰ سے اس بری طرح چمٹی ہوئی تھی کہ وہ برداشت نہیں کر سکتا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ وہ اپنی ماں کی طرف سے لاپروا نہیں ہو سکتا تھا اور پھر اس کی دو بہنیں بھی اس کی ذمہ داری تھیں۔ جب کبھی موسیٰ بولتا۔ اور وہ کم ہی بولتا تھا۔ تو اس کی بات کو سب سنجیدگی سے سنتے۔

"ہمارے برادر زہیر بن عمر نے جن راستوں کی بات کی ہے وہ ٹھیک ہیں لیکن وہ اپنی پریشانی میں یہ بھول گئے کہ ایک راستہ اور بھی ہے۔ وہی راستہ جو سلطان ابوعبداللہ نے اختیار کیا۔ ہم بھی اس کی طرح سمندر عبور کر کے مغرب میں پناہ ڈھونڈ سکتے ہیں۔ میری والدہ یہی چاہتی ہیں۔"

زہیر کی آنکھیں غصہ سے چمک اٹھیں۔

"ہم کیوں کہیں جائیں؟ یہ ہمارا گھر ہے۔ میرے خاندان نے الحزبل تعمیر کیا۔ ہمارے آنے سے پہلے یہ ایک بنجر علاقہ تھا۔ ہم نے گاؤں بسایا۔ ہم نے زمینوں کی آبیاری کی۔ ہم نے باغ لگائے۔ سنگترے، انار، لیموں اور بادام اور چاول اگائے۔ میں کوئی بربر نہیں ہوں۔ میرا مغرب سے کوئی واسطہ نہیں۔ میں اپنے گھر میں رہوں گا اور ہر اس کافر کو فنا کر دوں گا جو زبردستی مجھ سے یہ چھیننے کی کوشش کرے گا۔"

حمام میں گرما گرمی ہونے لگی پھر ایک نوجوان جس کے چہرے کے نقوش بہت باریک تھے۔ پیلا زیتونی رنگ تھا اور آنکھیں سبز مرمر کی طرح تھیں کچھ کہنے کے لئے کھنکارا وہ بمشکل اٹھارہ انیس برس کا ہو گا سب اس کی طرف متوجہ ہوئے وہ ابھی چند ہفتہ پہلے بلانسیہ سے آیا تھا اور کچھ دیر پہلے قاہرہ میں الازہر یونیورسٹی میں تھا۔ وہ اپنے پردادا ابن خلدون کی زندگی اور تحریروں پر تحقیق کرنے وہاں آیا تھا اور غرناطہ کی لائبریریوں میں کچھ مسودوں کا مطالعہ کرنا چاہتا تھا وہ اسی روز وہاں پہنچا تھا جس روز سیسنروس نے کتابوں کو جلانے کا حکم دیا تھا۔ یہ گہری آنکھوں والا نوجوان بہت دل شکستہ تھا۔ وہ خندق البدریہ کے اپنے چھوٹے سے کمرے میں رات بھر روتا رہا تھا۔ صبح ہوتے ہوتے اس نے اپنی زندگی کا لائحہ عمل طے کر لیا تھا۔ وہ بہت نرم آواز میں بولا لیکن اس کے لہجے میں قاہرہ کی گفتگو کی شیرینی کے ساتھ ساتھ اس کی باتوں نے سب کو بہت متاثر کیا۔

”جب میں نے باب الرملا میں صدیوں کے علمی خزانے کو جلتے دیکھا تو میں نے سوچا کہ اب سب کچھ ختم ہو چکا ہے۔ شیطان نے اپنا زہر سے بھرا ہوا پنجہ پہاڑوں میں گھونپ دیا ہے اور دھارے کا رخ بدل دیا ہے۔ ہم نے جو کچھ بویا سب بکھر گیا ہے۔ مرجھا گیا ہے۔ وقت خود دم بخود رہ گیا ہے اور یہاں اندلس میں ہم پہلے ہی جہنم سے گزر چکے ہیں۔ شاید بہتر یہی ہے کہ میں بوریا بستر اٹھا کر مشرق کی طرف لوٹ جاؤں...“

”اس پر آپ کو کوئی الزام نہیں دے گا“ زہیر نے کہا۔ ”آپ تعلیم کی خاطر آئے تھے اور یہاں اس کی کوئی صورت نہیں۔ صرف ایک خلاء ہے۔ آپ کے لئے بہتر یہی ہے کہ الازہر یونیورسٹی واپس چلے جائیں“ موسیٰ نے کہا ”ہمارا دوست آپ کو ایک معقول مشورہ دے رہا ہے ہم سب اس وقت بالکل ناکارہ ہو چکے ہیں ہم صرف ایک ہی بات پر فخر کر سکتے ہیں کہ ہمارے آباؤ اجداد عظیم تھے“

زہیر نے جواب دیا ”مجھے اس سے اتفاق نہیں ہے۔ صرف وہی جو چھاتی ٹھوک کر کہہ سکے کہ میں مرد ہوں میرے باپ دادا نہیں۔ وہی عظیم بھی ہے اور بہادر بھی“

سبز آنکھوں والا شخص مسکرایا۔

”میں زہیر بن عمر سے متفق ہوں۔ آپ لوگ جو خود نائٹ اور بادشاہ رہے ہیں آپ کیوں اپنے قلعے دشمنوں کے حوالے کر کے خود ان کے غلام بن جائیں؟ شکوک کے پردے چاک کر دیں اور عیسائیوں کا مقابلہ کریں۔ سیسنروس کا خیال ہے کہ اب آپ میں کوئی دم نہیں رہا وہ آپ کو پیچھے۔ اور پیچھے دھکیلتا جائے گا اور آخر صفحۂ ہستی سے مٹا دے گا“

”مجھے بلانسیا میں میرے دوستوں نے بتایا تھا کہ پورے ملک میں کلیسائی عدالتیں آخری وار کرنے کے لئے تیاری کر رہی ہیں۔ وہ جلد ہی ہماری زبان کو ممنوع قرار دیدیں گے۔ عربی ایک جرم قرار دیدی جائے گی جس کی سزا موت ہو گی۔ وہ ہمارے لباس بھی ہمیں نہیں پہننے دیں گے۔ یہ بھی باتیں ہو رہی ہیں کہ ملک بھر میں ہمارے حمام تباہ کر دیئے جائیں گے۔ ہماری موسیقی شادی بیاہ کی دعوتیں اور ہمارا مذہب سب ممنوع ہو جائیں گے۔ آئندہ چند برسوں میں اس سے بھی بہت کچھ زیادہ ہم پر مسلط ہونے والا ہے۔ ابو عبداللہ نے بغیر کسی مزاحمت کے یہ شہر ان کے حوالے کر دیا۔ یہ غلطی تھی۔ اس سے ان کے حوصلے بہت بڑھ گئے ہیں“

”اجنبی! آپ کیا مشورہ دیتے ہیں“ زہیر نے پوچھا۔

”انہیں بالکل یہ تاثر نہیں ملنا چاہئے کہ جو کچھ انہوں نے کیا ہے وہ ہمیں منظور ہے۔

ہمیں بغاوت کے لئے تیاری کرنی چاہئے“

ایک منٹ تک کوئی حرکت نہیں ہوئی وہ سب جیسے اس کی باتوں سے منجمد ہو گئے تھے۔ صرف حمام سے گرتے ہوئے پانی کی آواز ان کے خیالات اور خدشات میں مخل ہو رہی تھی۔ پھر موسیٰ نے براہ راست مصر کے نوجوان طالب علم کو للکارا۔

”اگر مجھے یقین ہو کہ سیسنروس کے خلاف ہماری جدوجہد کامیاب ہو جائے گی اور ہم اپنی تاریخ کا ایک ورق بھی واپس الٹ سکیں گے تو سب سے پہلے میں جان دینے کے لئے تیار ہوں گا لیکن آپ کی شیریں کلامی نے مجھے متاثر نہیں کیا' آپ جو کچھ فرما رہے ہیں وہ ایک بہت اعلیٰ جذبہ ہے جسے آنے والے زمانوں میں یاد کیا جائے گا لیکن کیوں؟ کس لئے؟ آخر اس کا نتیجہ کیا ہو گا؟ اعلیٰ جذبات اور بلند و بانگ دعوے شروع ہی سے ہمارے مذہب کی کمزوری رہے ہیں“

ان اعتراضات کا کسی نے کوئی جواب نہیں دیا اور موسیٰ نے یہ دیکھتے ہوئے کہ وہ قاہرہ کے نوجوان پر غالب آ گیا ہے اپنی بات پر زور دیا:

”عیسائی مختلف جانوروں کا مختلف موسموں کے مطابق اور مختلف طریقوں سے شکار کرتے ہیں لیکن وہ ہمارا سال کے ہر موسم میں شکار کرتے ہیں۔ میں اس بات سے متفق ہوں کہ ہمیں اپنی زندگیوں کو خوف کی وجہ سے خراب نہیں کرنا چاہئے لیکن ہمیں خود کو بے مقصد قربان بھی نہیں کرنا چاہئے۔ مشکل حالات میں کیسے زندہ رہنا چاہیے یہ بات یہودیوں سے سیکھنی چاہئے۔ مسلمان اب بھی بلانسیا میں رہتے ہیں اور اراگون میں بھی۔ میرے عزیزو! میں کسی حماقت کے حق میں نہیں ہوں“

”کیا تم عیسائی ہو جاؤ گے۔ موسیٰ! صرف زندہ رہنے کے لئے؟“

”کیا یہودیوں نے اپنے مفادات کی خاطر پورے ملک میں ایسا ہی نہیں کیا ہے؟ ہم ان کی پیروی کیوں نہ کریں؟ وہ جتنی چاہیں سختی کریں۔ ہم مزاحمت کے نئے طریقے سیکھیں گے۔ یہاں اپنے دماغ میں“

”اپنی زبان اور اپنی کتابوں کے بغیر؟“ ابن خلدون کے پڑپوتے نے پوچھا۔

موسیٰ نے اس کی طرف دیکھا اور ایک ٹھنڈا سانس لیا“۔ کیا یہ صحیح ہے کہ آپ استاد ابن خلدون کی نسل سے ہیں؟“

ابن داؤد مسکرایا اور اس نے ہاں میں سر ہلایا۔

”تو یقیناً“ موسیٰ نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”آپ ہم سے بہتر جانتے ہیں کہ

آپ کے لائق احترام بزرگ نے آپ جیسے لوگوں کے متعلق کس قسم کی تنبیہہ کی ہے۔ تمام لوگوں میں علماء سیاست اور اس کے طریقوں کے لئے سب سے کم موزوں ہیں"

ابن داؤد کینگی سے مسکرایا "شاید ابن خلدون اپنے تجربات کی روشنی میں بات کر رہے تھے جو اتنے خوشگوار نہیں تھے۔ بہرحال وہ کتنے بھی عظیم فلسفی کیوں نہ ہوں ہمیں ان کی بات کو حدیث کی طرح مقدس نہیں سمجھنا چاہئے۔ ہمارے سامنے جو سوال ہے وہ بالکل سیدھا ہے۔ ہم اپنے ماضی اور مستقبل کو کس طرح وحشیوں سے بچا سکتے ہیں؟ اگر آپ کے پاس اس سے زیادہ قابل عمل حل ہے تو بتائیں اور ہمیں قائل کریں"

"میرے پاس تمام جوابات نہیں ہیں۔ میرے عزیز! لیکن یہ مجھے معلوم ہے کہ آپ جو مشورہ دے رہے ہیں وہ غلط ہے"

یہ کہنے کے بعد موسیٰ حمام سے باہر آگیا اور اس نے تالی بجائی۔ ملازم تولئے لے کر دوڑتے ہوئے آئے اور اس کا بدن پونچھنے لگے۔ دوسرے نے بھی ایسا ہی کیا۔ پھر وہ برابر والے کمرے میں چلے گئے جہاں ان کے ملازم ان کی نئی پوشاکیں لئے کھڑے تھے۔ رخصت ہونے سے پہلے موسیٰ زبیر سے گلے ملا اور اس نے اس کے کان میں کہا۔ "بہترین شراب میں زہر مل ہی جاتا ہے"

زبیر نے اپنے دوست کی بات کو زیادہ سنجیدگی سے نہیں لیا۔ اسے معلوم تھا کہ موسیٰ بہت زیادہ دباؤ میں ہے لیکن اتنے خدشات کی موجودگی میں یہ بزدلی کا کوئی جواز نہیں ہے۔ زبیر اپنے دوست سے الجھنا نہیں چاہتا تھا اور وہ اپنے خیالات کا گلا بھی نہیں گھونٹ سکتا تھا۔ خاموش بھی نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ اجنبی سے مخاطب ہوا۔

"ہم آپ کو کس نام سے پکاریں؟"

"ابن داؤد المصری"

"میں آپ سے مزید گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ ہم آپ کی قیام گاہ نہ چلیں؟ وہاں میں سامان باندھنے میں آپ کی مدد کر دوں گا اور پھر کوئی گھوڑا لے کر آپ کے ساتھ الحزبل چلوں گا اللہ پر بھروسہ رکھیں۔ ہماری لائبریری میں آپ کو ابن خلدون کے کچھ مسودات بھی مل جائیں گے۔"

"آپ گھوڑے پر سواری کر لیتے ہیں؟"

"آپ کی بڑی عنایت۔ آپ کی دعوت میرے لئے بڑی مسرت کی بات ہے۔ ہاں میں سواری کر لیتا ہوں" باقی تمام دوستوں کو بھی زبیر نے تکلفاً" ایک دعوت عام دی۔ "تین دن

تک میرے گاؤں آیئے۔ وہاں ہم منصوبے بنائیں گے اور ان کے عملی پہلوؤں پر گفتگو کریں گے۔ کیا آپ متفق ہیں؟"

"رات کو یہیں کیوں نہ ٹھہریں اور ابھی گفتگو کر لیں؟" ہارون بن محمد نے پوچھا۔

"چونکہ میرے والد شہر میں ہیں اور انہوں نے اصرار کیا ہے کہ رات میں چچا کے ہاں گزاروں میں نے گھر واپس جانے کی اجازت چاہی تھی۔ یوں کھلے طور پر انہیں جل دینا کوئی سمجھداری نہیں۔ تین دن میں؟"

بات طے ہو گئی۔ زبیر نے ابن داؤد کا بازو تھاما اور گلی کے باہر تک لے آیا۔ وہ تیزی سے قیام گاہ کی طرف روانہ ہوئے۔ ابن داؤد کا سامان اکٹھا کیا اور اصطبل روانہ ہو گئے۔ زبیر نے اپنے چچا کا ایک گھوڑا اپنے نئے دوست کے لئے لیا اور پیشتر اس کے کہ ابن داؤد سانس بھی لے سکے وہ الحزبل کی طرف چل پڑے۔

زبیر کا چچا ابن حشام باب الرملا سے پانچ منٹ کے فاصلہ پر شہر کے ایک خوبصورت گھر میں رہتا تھا۔ اس کا دروازہ گلی کے دوسرے مکانوں سے مختلف نہیں تھا لیکن قریب سے دیکھنے سے اندازہ ہوتا تھا کہ دونوں پہلوؤں میں بنے ہوئے دروازے دراصل دروازے تھے ہی نہیں۔ فیروزے کے ٹائل جڑے ہوئے یہ نقلی دروازے دھوکہ دینے کے لئے بنائے گئے تھے۔ کوئی اجنبی یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ جالی دار دروازوں کے پیچھے ایک چھوٹا سا محل تھا۔ گلی کے نیچے سے ایک زمین دوز راستہ محل کے مختلف حصوں کو ملاتا تھا اور اس میں سے باب الرملا کی طرف ایک خفیہ راستہ بھی نکلتا تھا۔ سوداگر بہت چوکنے رہتے تھے۔

عبداللہ بن عمر بھی غرناطہ کے کیپٹن جنرل سے صبح کی پریشان کن ملاقات کے بعد اسی محل میں واپس آیا تھا۔

ابن حشام اور عمر عمزاد بھائی تھے۔ ابن حشام کا باپ حشام الزید ابن فرید کا بھانجا تھا۔ اپنے چچا ابن فرید کے انتقال کے بعد وہ شہر میں رہنے لگا تھا۔ اس کے والدین کی وفات کے بعد سے ابن فرید ہی اس کا سرپرست تھا۔ اس کے والدین اشبیلیہ جاتے ہوئے لٹیروں کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ ترقی کر کے وہ الحمرا میں سلطان کا اقتصادی مشیر بن گیا تھا اور اس نے اپنے اثر رسوخ اور ذہانت سے کافی دولت جمع کر لی تھی۔ چونکہ الحزبل کی جاگیر پر کوئی تنازع نہیں تھا دونوں بھائیوں کے تعلقات نہایت خوشگوار تھے۔ عمر کے باپ کی ناوقت وفات کی وجہ سے اس کے چچا حشام الزید نے اس دکھ میں اپنے بھتیجے کو بہت تسلی و تشفی دی۔ زیادہ اہم یہ بات تھی کہ اس نے عمر کو جاگیر کے انتظامات بھی سکھا دیئے تھے۔ اس نے

تجارت اور زراعت کے فرق کی ان الفاظ میں وضاحت کی:

"غرناطہ میں ہمارا معاملہ محض مال کی خرید و فروخت سے ہے لیکن یہاں الحزیل میں سب سے اہم یہ بات ہے کہ مزارعوں کے ساتھ رابطے اور ان کے مسائل کو سمجھنے کی صلاحیت ہونی چاہئے۔ اگلے وقتوں میں مزارعے جنگوں کی وجہ سے ابن فرید اور اس کے دادا سے وابستہ تھے۔ وہ ایک ہی جھنڈے کے نیچے لڑتے تھے۔ یہ اہم بات تھی۔ اب زمانہ بدل گیا ہے۔ ہمارے مال کے برخلاف تمہارے مزارعے اپنی سوچ بھی رکھتے ہیں اور اپنے طور پر عمل بھی کرتے ہیں۔ اگر یہ سیدھی سی بات تمہارے ذہن میں رہے تو تمہیں کبھی کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی"

شہر پر قبضہ کے ایک سال بعد حشام الزید کا انتقال ہو گیا۔ اسے کبھی کوئی بیماری نہیں ہوئی تھی۔ اور بازار میں لوگ یہی باتیں کرتے تھے کہ وہ اس صدمہ سے دل شکستہ ہونے سے مر گیا۔ شاید ایسا ہی ہو لیکن یہ بھی ہے کہ چند ہفتہ قبل ہی اس نے اپنی ۸۰ ویں سالگرہ بھی منائی تھی۔

الحمرا سے واپسی کے بعد سے عمر سخت مایوسی کے عالم میں تھا۔ اس نے غسل کیا اور کھانا کھایا لیکن رات کے کھانے پر اس کی خاموشی نے سب کو پریشان کر دیا۔ ابن حشام نے رقاصاؤں کو بلانے کی پیشکش بھی کی اور شراب بھی منگائی لیکن عمر نے فوراً انکار کر دیا۔ عمر کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس کے بھائی کے گھر کے لوگ اتنے بے فکر کیوں تھے۔ یہ صحیح ہے کہ لوگ مصیبتوں سے مانوس ہو جاتے ہیں لیکن اس کے اندر ایک احساس تھا کہ کہیں کچھ گڑبڑ ہے۔ جب اس نے انہیں ڈون ا لیگو سے اپنی ملاقات کے بارے میں بتایا تو انہوں نے کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا۔ جب اس نے حقارت کے ساتھ ڈون ا لیگو کے اس مشورہ کا ذکر کیا کہ تمام مسلمانوں کو فوراً عیسائیت قبول کر لینی چاہئے تو ابن حشام اور اس کی بیوی نیزہ نے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ عمر کو لگا کہ جیسے کوئی اندرونی طاقت انہیں اس سے دور کھینچ رہی تھی۔ اب جب یہ دونوں مرد ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے تو عمر کی آمد کے بعد سے پہلی دفعہ انہیں تنہائی میسر ہوئی۔ عمر بالکل پھٹ پڑنے کو تھا۔

ابھی اس نے منہ کھولا ہی تھا کہ دروازے پر زور سے دستک ہوئی۔ عمر نے دیکھا کہ ابن حشام کے چہرہ کے نقوش کچھ سخت ہو گئے۔ اس نے کچھ دیر انتظار کیا کہ ملازم آئے اور نووارد کی اطلاع دے۔ شاید ڈون ا لیگو نے اپنا ارادہ بدل دیا تھا اور اس کو فوراً الحمرا

سے واپس بلانے کے لئے قاصد بھیجا تھا لیکن ملازم کی جگہ ایک جبہ پوش مانوس چہرہ نمودار ہوا۔ فوراً ہی ساری بات عمر پر واضح ہو گئی۔

"محترم بشپ! مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ غرناطہ میں ہیں"

بزرگ نووارد نے ایک کرسی کے لئے اشارہ کیا اور نشست پر بیٹھ گیا۔ عمر کمرے میں چلنے پھرنے لگا۔ پھر اس کے چچا نے بولنا شروع کیا۔ اس کی آواز میں اس کے حلیہ کے برخلاف بڑا اعتماد تھا۔

"بیٹھ جاؤ۔ بیٹے مجھے پوری طرح علم تھا کہ آج تم غرناطہ میں ہو۔ اسی لئے میں یہاں آیا ہوں۔ خوش قسمتی سے میرے مرحوم بھائی حشام الزید کا بیٹا تم سے زیادہ سمجھدار ہے۔ تمہیں کیا پریشانی ہے عمر؟ کیا بنو حزیل کی سرداری کا بوجھ اتنا زیادہ ہے کہ تمہارا دماغ ہی ماؤف ہو گیا ہے؟ کیا جس وقت وہ کتابیں جلا رہے تھے میں نے تمہیں نہیں بتایا تھا کہ وہ اس پر اکتفا نہیں کریں گے؟ کیا میں نے تمہیں خبردار نہیں کیا تھا کہ اس مذہب سے چمٹے رہنے کا کیا انجام ہو گا جس کے دن اس جزیرہ نما میں پورے ہو چکے ہیں؟"

عمر غصہ سے کھول رہا تھا۔

"کیا سب کچھ ختم ہو گیا ہے۔ چچا؟ آپ ذرا اپنا یہ بھڑکیلا گاؤن تو اٹھایئے۔ ہم بھی دیکھیں کہ کیا وہ چھوٹی سی ایک بوٹی کٹی ہوئی ہے؟ آپ اس کھال کے چھوٹے سے ٹکڑے سے جڑے کیوں نہیں رہے۔ چچا؟ اور آپ کو اس عضو کے استعمال کرنے میں بھی کوئی شرم محسوس نہیں ہوئی۔ آپ کا بیٹا یوآن کتنا بڑا ہو گیا ہے؟ بیس سال کا؟ آپ کے پادری بننے کے پانچ سال بعد پیدا ہوا تھا۔ اس کی ماں کہاں ہے۔ ہماری وہ بے نام چچی؟ کیا انہوں نے اسے کونونٹ سے نکال دیا تھا یا مدر سپیریئر فارغ اوقات میں دائی کا کام بھی کرتی ہے؟ آپ کو روشنی کب ملی۔ چچا؟"

"بس کرو۔ عمر" اس کے عمزاد نے چلا کر کہا۔ "اب ان باتوں کا کیا فائدہ؟ بشپ تو صرف ہماری مدد کرنا چاہتا ہے۔"

"میں تم سے ناراض نہیں ہوں۔ عمر بن عبداللہ - میں تمہارے جذبات کی قدر کرتا ہوں۔ ان میں مجھے اپنے باپ کی جھلک نظر آتی ہے لیکن وہ جو سیاست میں قدم رکھتے ہیں ان کے لئے ایک قانون ہے۔ انہیں حقیقی زندگی پر بھی نظر رکھنی پڑتی ہے اور ان کے لئے یہ جاننا ضروری ہوتا ہے کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔ ہر واقعہ کے لواحق اور نتائج پر غور کرنا ضروری ہوتا ہے۔ جب میں یزید کی عمر کا تھا تو میرے استاد نے مجھے یہی تعلیم دی تھی۔ ہم

اسی صحن میں درس لیتے تھے جس کے درمیان سے پانی گزرتا تھا اور جو تمہارے گھر والوں کو بہت عزیز تھا۔ یہ درس سہ پہر کے وقت ہوتا تھا۔ جب ہر چیز دھوپ میں نہائی ہوتی تھی۔ "مجھے تعلیم دی گئی تھی کہ میں کبھی مفروضوں پر نظریات قائم نہ کروں۔ بلکہ خارجی دنیا کی حقیقتوں پر اپنی سوچ کی بنیاد رکھوں۔ غرناطہ کی بقاء ممکن نہیں رہی تھی۔ عیسائی صحرا میں ایک اسلامی نخلستان! تم ہی نے شکست سے تین مہینے پہلے مجھ سے یہ کہا تھا کیا تمہیں میرا جواب یاد ہے؟"

"بہت اچھی طرح" عمر نے بزرگ شخص کا منہ چڑاتے ہوئے کہا۔

"اگر جو کچھ تم کہہ رہے ہو سچ ہے۔ عمر بن عبداللہ! تو پھر یہ اس طرح نہیں چل سکتا صحرا کے جنگجو اس نخلستان پر قبضہ کر ہی لیں گے۔ مجھے یاد ہے۔ ایک بات بتاؤ..."

"نہیں۔ تم بتاؤ۔ کیا تم چاہتے ہو کہ ہماری جاگیریں ضبط کر لی جائیں؟ کیا تم چاہتے ہو کہ زہیر اور تم مارے جاؤ۔ زبیدہ اور تمہاری بیٹیاں تمہارے قاتلوں کے قبضے میں چلی جائیں۔ یزید کو کوئی پادری پکڑے اور اسے قربان گاہ کا خادم بنا دے؟ کہو۔ تم کیا چاہتے ہو۔؟"

عمر لرزنے لگا۔ اس نے پانی کا ایک گھونٹ لیا اور میگوئل کو گھورا۔

"ہاں" قرطبہ کا بشپ بولتا رہا۔ "تم بولتے کیوں نہیں؟ ابھی وقت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اپنی پوری کوشش سے آج صبح الحمرا میں تمہاری ملاقات کا انتظام کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے سیسنروس کو مجبور کیا کہ وہ تمہارے گاؤں میں آکر بپتسمہ کی رسم ادا کرے۔ بچاؤ کی یہی ایک صورت ہے۔ برخوردار کیا تمہارا خیال ہے کہ مجھے بصیرت مل گئی تھی اس لئے میں نے مذہب تبدیل کیا؟ مجھے ایک ہی بصیرت حاصل ہوئی تھی اور وہ تھی میرے خاندان کی تباہی۔ میرا فیصلہ سیاسی ہے۔ مذہبی نہیں۔"

"پھر بھی" عمر نے کہا "پادری کا گاؤن تم پر کتنا جچتا ہے۔ لگتا ہے کہ تم پیدائش سے ہی یہ پہنتے رہے ہو"

"جتنا چاہو مذاق اڑا لو۔ بھتیجے! لیکن صحیح فیصلہ کرو۔ یاد کرو پیغمبرؐ نے کیا کہا تھا۔ اللہ پر بھروسہ رکھو۔ لیکن پہلے اپنے اونٹ کو باندھ دو۔ میں تمہیں ایک اطلاع اور بھی دیتا ہوں۔ گو اگر یہ بات کھل گئی تو کلیسائی عدالت مجھے سزائے موت دیدیگی۔ میں اب بھی وضو کرتا ہوں اور روزانہ مکہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتا ہوں"

میگوئل کے دونوں بھائی چونک اٹھے جس پر وہ مزے لے کر ہنسا۔

"وحشیانہ دور میں وحشی بننے کا فن آنا چاہئے۔ اسی لئے میں کلیسائے روم میں داخل

ہو گیا۔ حالانکہ میرا ایمان ہے کہ ہمارا نقطہ نظر حقیقت سے نسبتاً بہت زیادہ قریب ہے۔ میں تمہیں بھی یہی صلاح دیتا ہوں۔ تمہارا یہ بھائی اور اس کے اہل خانہ اس پر پہلے ہی تیار ہو چکے ہیں۔ میں کل خود انہیں عیسایت میں داخل کروں گا۔ کیوں نہ تم بھی اس رسم کو دیکھنے کے لئے ٹھہرو! یہ بات کرنے میں تمام ہو جائے گی..."

"لاالہ اللہ محمد الرسول اللہ"

"بیشک! تم روز اپنے آپ اسے دہراتے رہنا"

"غلامی کی زندگی سے آزادی کی موت بہتر ہے"

"اسی طرح کی حماقتوں کی وجہ سے تمہارے دین کو اس جزیرہ نما میں شکست ہوئی ہے" عمر نے اپنے عمزاد کی طرف دیکھا لیکن ابن حشام نے منہ پھیر لیا۔

"کیوں؟" عمر اس پر چیخا۔ "تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا۔ یہ تو ایسا ہے جسے میرے دل میں چھرا گھونپ دیا ہو"

ابن حشام نے نظریں اٹھائیں۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھرا ہوا تھا۔ کتنی عجیب بات ہے۔ عمر نے سوچا۔ وہ اس قدر پریشان ہے جبکہ بچپنے میں وہ مجھ سے زیادہ پختہ ارادے کا مالک تھا۔ شاید اس کی وجہ نئی ذمہ داریاں ہیں لیکن ذمہ داریاں تو مجھ پر بھی ہیں اور اس سے زیادہ' اس کا مسئلہ تو صرف اس کا کاروبار اور اس کے گھر والے ہیں۔ مجھ پر دو ہزار جانوں کا بوجھ ہے۔ پھر بھی اسے اپنے عمزاد کی حالت پر دکھ ہوا۔ اور اس کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔

جب وہ ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے اور ان کی آنکھیں دکھ سے بھری ہوئی تھیں۔ ایک لمحہ کے لئے میگوئل کو ان کی جوانی یاد آئی۔ یہ دونوں یک جان دو قالب تھے۔ شادی کے بہت دیر بعد تک بھی ان کی دوستی برقرار رہی لیکن جیسے جیسے وہ بڑے ہوتے گئے اور گھریلو مسائل میں پھنستے گئے ان کا ملنا جلنا کم ہو گیا۔ گاؤں کے آبائی گھر اور غرناطہ کی شہری رہائش کے درمیان فاصلہ بڑھتا گیا۔ پھر بھی جب یہ دونوں بھائی ملتے تو ایک دوسرے سے دل کا حال کہتے۔ گھریلو مسائل پر گفتگو کرتے' اپنی دولت' اپنے مستقبل پر بات کرتے اور دنیا کے بدلتے ہوئے حالات پر غور کرتے۔ ابن حشام کو اس بات کا بہت دکھ تھا کہ اس نے عمر سے اپنے عیسائی ہونے کی بات کو چھپایا۔ یہ اس کی زندگی کا سنگین لمحہ تھا۔ اس نے تو یہی سوچا تھا کہ اس کے اس عمل سے اس کے خاندان اور اس کے بچوں کو تحفظ اور استحکام ملے گا۔

ابن حشام ایک دولتمند سوداگر تھا۔ اسے اپنی مردم شناسی پر فخر تھا۔ وہ شہر کے مزاج کو بھانپ لیتا تھا۔ عیسایت قبول کرنے کا اس کا فیصلہ ایسا ہی تھا جیسا کہ تیس برس پہلے اس نے اپنا تمام سرمایہ سمرقند سے بروکیڈ کی درآمد میں لگا دیا تھا۔ ایک سال کے اندر اندر اس کا سرمایہ تین گنا ہو گیا تھا۔

وہ عمر کو دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتا تھا لیکن اسے ڈر تھا کہ اس کا عمزاد جس کے فیصلہ اور حق پرستی کا پورے خاندان پر رعب بھی تھا اور احترام بھی۔ اسے قائل کر دے گا کہ وہ غلطی پر ہے۔ ابن حشام قائل ہونا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے اس امید پر سب باتوں کا اعتراف کر لیا کہ عمر اس کی مجبوری کو سمجھ جائے گا اور اسے معاف کر دے گا لیکن عمر غصہ سے اسے دیکھتا رہا اور ابن حشام نے محسوس کیا کہ یہ تیز تیز آنکھیں اس کے سر کے پار ہو جائیں گی۔ چند منٹ کے اندر اندر ان کے درمیان اتنی دوری ہو گئی کہ وہ ایک دوسرے سے بات بھی نہیں کر سکتے تھے۔

آخر میگوئل نے اس خاموشی کو توڑا۔ "میں کل الحزیل آؤں گا"

"کیوں؟"

"کیا تم مجھے اس گھر میں آنے کا حق بھی نہیں دو گے جہاں میں پیدا ہوا تھا؟ میں تو صرف اپنی بہن کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں تمہاری زندگی میں مخل نہیں ہوں گا"

عمر نے محسوس کیا کہ وہ خاندانی روایات کو نظرانداز کر رہا ہے۔ یہ ناممکن تھا اور اس نے فوراً تلافی کی۔ وہ جانتا تھا کہ میگوئل زبیدہ سے بات کرنے پر تلا ہوا ہے اور اسے تبدیلی مذہب کے لئے قائل کرنے کی کوشش کرے گا۔ اس مکار کا خیال تھا کہ اسے اپنی مکروہ تجویز پر قائل کرنا آسان ہو گا۔ پکا شیطان۔ اس کا کردار بالکل شیشہ کی طرح صاف ہے۔

"معاف کیجئے۔ چچا۔ میرا دھیان کہیں اور تھا' آپ کا گھر ہے جب چاہیں خوشی سے آئیں۔ ہم ایک ساتھ ہی صبح سویرے روانہ ہو جائیں گے۔ معاف کیجئے میں بھول گیا تھا کہ آپ کو بپتسمہ کی رسم ادا کرنی ہے۔ آپ خود ہی یہ کیجئے میں آپ سے ایک درخواست کرتا ہوں۔"

"کہو"۔ قرطبہ کے بشپ نے جواب دیا۔

"میں اپنے عمزاد سے اکیلے میں کچھ بات کرنا چاہتا ہوں"

میگوئل مسکرایا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ابن حشام نے تالی بجائی۔ ایک ملازم چراغ لئے

ہوئے آیا اور پادری کو اس کے کمرے کی طرف لے چلا۔

اس کے جانے کے بعد دونوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ عمر نے اپنے دوست کی طرف دیکھا لیکن اس کی آنکھیں کہیں دور کسی جگہ لگی ہوئی تھیں۔ اب ان میں غصہ کی جگہ دکھ تھا اور بیزاری تھی۔ یہ سوچتے ہوئے کہ شاید وہ اب ہمیشہ کے لئے جدا ہو جائیں ابن حشام نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ عمر نے ایک لمحہ کے لئے اس کا ہاتھ پکڑا اور چھوڑ دیا۔ دونوں اس قدر دکھی تھے کہ انہوں نے زیادہ بات نہیں کی۔

ابن حشام نے کہا "اگر تمہیں کوئی شک ہے تو میں یہ بتا دوں کہ میرے فیصلہ کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں"

"اسی کا مجھے زیادہ دکھ ہے۔ اگر تم نے واقعی مذہب بدلا ہوتا تو میں تم سے بحث کرتا اور مجھے دکھ ہوتا لیکن غصہ کوئی نہ ہوتا۔ کوئی تلخی نہ ہوتی لیکن فکر مت کرو۔ میں کوئی کوشش نہیں کروں گا کہ تم اپنا ارادہ بدلو۔ کیا باقی گھر والوں نے بھی تمہارا فیصلہ تسلیم کر لیا ہے؟"

ابن حشام نے ہاں میں سر ہلایا۔

"کاش وقت یہیں رک جائے"

عمر اس فقرہ پر زور سے ہنسا۔ اور ابن حشام کھسیانہ ہو گیا۔ یہ عجیب قسم کا قہقہہ تھا۔ جیسے کوئی دور کی گونج۔

"ابھی ہم ایک مصیبت سے نکلے ہیں" عمر نے کہا۔ "دوسری کے کنارے کھڑے ہیں۔"

"کیا اس سے بھی بری کوئی بات ہو سکتی ہے کہ انہوں نے ہماری تہذیب کو آگ میں جھونک دیا۔ اب وہ اور زیادہ دکھ نہیں دے سکتے۔ اس کے مقابلہ میں بانس پر باندھ کر سنگسار کرنا ہمارے لئے کم تکلیف دہ ہو گا"

"کیا اسی لئے تم نے مذہب بدلا؟"

"نہیں۔ ہزار بار نہیں۔ صرف اپنے خاندان کے لئے۔ ان کے مستقبل کے لئے"

"جب میں مستقبل کے بارے میں سوچتا ہوں" عمر نے اعتراف کیا۔ "تو مجھے آسمان مہربان نظر نہیں آتا۔ کوئی بات واضح نہیں رہی۔ صرف ایک گہری دھند ہے۔ ایک ابدی اندھیرا' جس نے ہمیں گھیرا ہوا ہے اور اپنے خوابوں کی آخری حد پر مجھے افریقہ کے ساحل دعوت دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس لئے کہ کل تم سب لوگوں کے اٹھنے سے پہلے میں

روانہ ہو جاؤں گا۔"

"تم اتنے ظالم نہیں ہو سکتے۔ کل ہم سب مل کر صبح کی نماز پڑھیں گے۔"

"اپنے عیسائی ہونے کے دن بھی!"

"خاص طور سے اس دن"

"تو صبح بخیر۔ سلام علیکم"

"و علیکم السلام"

ابن حشام ایک لمحہ کے لئے رکا۔

"عمر"

"ہاں"

وہ تیزی سے بڑھا اور عمر سے بغلگیر ہو گیا۔ عمر بے حس و حرکت ہاتھ لٹکائے کھڑا رہا۔ اور جب اس کا ہمزاد دوبارہ رونے لگا تو عمر نے اسے زور سے گلے لگا لیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کے رخساروں کو بوسے دیئے اور ابن حشام عمر کو اپنے کمرے میں لے گیا۔ یہ کمرہ عمر بن عبداللہ کے لئے مخصوص تھا۔

عمر سو نہیں سکا۔ اس کے دماغ میں تشویشناک آوازیں گونج رہی تھیں۔ مہلک زہر دن بدن پھیلتا جا رہا تھا گو بظاہر وہ لوگوں کے سامنے بہت پر اعتماد نظر آتا تھا شکوک و خدشات نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ کیا یہ مناسب تھا کہ وہ اپنے بچوں کو برسہابرس کی اذیتوں میں جھونک دے۔ ان پر جلا وطنی بلکہ موت تک مسلط کر دے؟ اسے کیا حق تھا کہ وہ ان پر اپنی مرضی ٹھونسے؟ کیا اس نے اپنے بچوں کو اس لئے پال پوس کر بڑا کیا تھا کہ انہیں قاتلوں کے حوالے کر دے؟

اس کے ذہن میں کسی زیر زمین نالے کا سا شور مچا ہوا تھا' بے رحم یادیں اسے جھنجھوڑ رہی تھیں۔ وہ بھولے ہوئے دنوں کا سوگ منا رہا تھا۔ اپنی زندگی کی بہار کے دنوں کا جب اس نے پہلی مرتبہ زبیدہ کو شانوں پر چادر ڈالے الحمرا کے باغات کے قریب بے خودی کے سے انداز میں گھومتے ہوئے پہلی بار دیکھا تھا تو ابن حشام اس کے ساتھ تھا۔ ساری زندگی وہ اس منظر کو نہیں بھول سکتا۔ درختوں میں سے چھن کر آتی ہوئی سورج کی ایک کرن نے اس کے سرخ بالوں کو سنہرا کر دیا تھا۔ جس چیز نے سب سے زیادہ اسے متاثر کیا وہ اس کی شگفتگی تھی۔ کوئی ڈھیلا ڈھالا پن نہیں جس سے اس کے خاندان کی بہت سی عورتیں خاصی بے ہنگم نظر آتی تھیں۔ اس کے حسن کے سحر سے وہ وہیں جم کر رہ گیا۔ اس کا جی چاہا کہ

اس کے بالوں کو چھوئے۔ اس کی باتیں سنے اور مسکراتے وقت اس کی آنکھوں کے بدلتے ہوئے رنگ دیکھے۔ لیکن اس نے خود پر قابو رکھا۔ پکتی ہوئی خوبانیوں کو توڑنا منع تھا۔ وہ تو شاید اسے جانے دیتا اور دوبارہ کبھی اس کو نہ دیکھتا لیکن حشام کے ہمت بڑھانے پر وہ اس کی طرف مائل ہوا۔ اور پھر مہینوں حشام ان کی چھپے چوری ملاقاتوں پر نظر رکھتا رہا۔

جب بالآخر عمر کو نیند آئی تو تکیہ دونوں طرف سے گرم ہو چکا تھا۔ سونے سے پہلے اس نے عزم کیا کہ وہ صبح سویرے ہی الحزیل کے لئے سوار ہو جائے گا۔ دوسری بار الوداع کہنے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ وہ رحم کی بھیک مانگتی ہوئی اپنے دوست کی خاموش آنکھوں کی تاب نہیں لا سکتا تھا۔

ایک وجہ اور بھی تھی وہ اپنی کھوئی ہوئی جوانی کے راستوں پر دوبارہ چلنا چاہتا تھا۔ وہ میگوئل کی بپتسمہ کی بے رنگ رسومات سے دور تازہ ہوا میں اپنے گھر کی طرف روانہ ہونا چاہتا تھا۔ وہ سورج کی پہلی شعاؤں کا لطف لینا چاہتا تھا جو پہاڑی کی چوٹیوں سے منعکس ہو کر آتی ہیں۔ وہ نیلے آسمان کے بے پناہ حسن سے آنکھوں کو سیراب کرنا چاہتا تھا۔ نیند کے غلبہ سے ذرا پہلے عمر کو شدت سے یہ احساس ہوا کہ اب وہ ابن حشام کو دوبارہ نہیں دیکھے گا۔

باب 5

"سچ کبھی سچ کی تردید نہیں کر سکتا۔ صحیح ہے یا غلط۔ زہیرا لفحل"

"صحیح۔ اس کے علاوہ ہو بھی کیا سکتا ہے؟ یہ قرآن میں ہے۔ ہے نا؟"

"کیا اس کے صحیح ہونے کی یہی ایک دلیل ہے؟"

"ہاں.... میرا مطلب ہے۔ اگر یہ قران میں ہے..... سنو بابا۔ میں یہاں کفر بکنے نہیں آیا ہوں۔"

"میں ایک اور سوال پوچھتا ہوں۔ کیا یہ جائز ہے کہ جو کچھ عقل کہے اور جو روایت بتائے ان دونوں کو ملا دیا جائے؟"

"میرے خیال میں یہ جائز ہے۔"

"تم ایسا سوچتے ہو! کیا وہ آجکل تمہیں کچھ اور نہیں پڑھاتے؟ بارلیش احمق!"

"میں ایک معمہ بتا رہا ہوں جس نے ہمارے علماء کو صدیوں سے الجھایا ہوا ہے اور تمہارا جواب صرف یہ ہے کہ میرے خیال میں جائز ہے۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں۔ میرے وقتوں میں نوجوانوں کی تعلیم زیادہ دقیق تھی۔ کیا تم نے کبھی ابن رشد کو نہیں پڑھا جو ہمارے عظیم دانشوروں میں سے ہے؟ وہ واقعی ایک عظیم انسان ہے۔ یورپ کے عیسائی اسے اویروس کے نام سے پکارتے ہیں۔ تم نے یقیناً اس کی کتابیں پڑھی ہوں گی۔ تمہارے والد کی لائبریری میں اس کی چار کتابیں ہیں۔"

زہیر کو بڑی شرمندگی ہوئی اور اس نے خود کو بہت چھوٹا محسوس کیا۔

"مجھے یہ کتابیں پڑھائی گئی تھیں۔ لیکن کچھ اس طرح کہ ان کا کوئی سر پیر ہی نظر نہیں آتا تھا۔ میرے استاد کہتے تھے کہ ابن رشد ہو سکتا ہے ایک عظیم انسان ہو لیکن وہ بے

دین تھا۔"

"جاہل کس طرح جہالت پھیلاتے ہیں۔ یہ الزام غلط تھا۔ ابن رشد ایک عظیم فلسفی تھا اور بہت ذہین تھا۔ میرے خیال میں وہ غلطی پر تھا لیکن اس کی وجہ وہ نہیں ہے جو اس جاہل نے تمہیں بتائی جو تمہیں پڑھانے کیلئے رکھا گیا تھا۔ روایت اور درائت کے تضاد کو حل کرنے کے لئے اس نے صوفیا کی تعلیمات کو اپنایا۔ معنی ظاہری بھی تھے اور باطنی بھی۔ یہ صحیح ہے کہ حقیقت اور ظہور ہمیشہ ایک نہیں ہوتے لیکن ابن رشد کا اصرار تھا کہ تمثیلی توجیہات سچائی کا لازمی نتیجہ ہیں۔ یہ واقعی قابل افسوس بات ہے لیکن میں نہیں سمجھتا کہ اس کی نیت میں کوئی خرابی تھی۔"

"تمہیں کیسے معلوم ہے؟" زہیر نے تلخی سے پوچھا۔ "ہو سکتا ہے کہ اس کے خیال میں علم کی توسیع و بقاء کا یہی ایک راستہ ہو"

"وہ نہایت مخلص تھا۔" زندیق نے بزرگانہ وثوق کے ساتھ کہا۔ "ایک مرتبہ اس نے کہا تھا کہ اسے سب سے زیادہ دکھ اس وقت ہوا جب وہ اور اس کا بیٹا جمعہ کی نماز پڑھنے گئے تو جاہلوں کے ایک مشتعل ہجوم نے انہیں باہر پھینک دیا۔ اس کی بے عزتی تو ہوئی تھی لیکن اسے اس کا دکھ نہیں تھا اسے زیادہ دکھ اس بات کا تھا کہ جاہلوں کے اس اشتعال کی وجہ سے دنیا کا جدید ترین مذہب برباد ہو رہا تھا۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں کہ ابن رشد ایسا کافر نہیں تھا۔ اس کا نظریہ تھا کہ کائنات مکمل طور پر خدا کے قبضہ قدرت میں ہے۔"

زہیر نے جھرجھری لی

"لڑکے تمہیں سردی لگ رہی ہے؟"

"نہیں۔ یہ تمہاری باتیں ہیں جن سے میں لرز گیا ہوں۔ میں یہاں فلسفہ پر بحث کرنے یا مذہب کے متعلق توہین آمیز باتیں سننے نہیں آیا تھا۔ اگر تم چاہتے ہو تو تمہارے اور امام مسجد کے درمیان ہمارے کھلے صحن میں مناظرہ کا انتظام کرایا جا سکتا ہے' لیکن ہم سب منصف کے فرائض سرانجام دیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ میری بہن ہند تمہاری حمایت کرے گی۔ لیکن محتاط رہنا۔ اس کا سہارا ایسا ہی ہے جیسے پھانسی پر لٹکے ہوئے شخص کو رسی کا سہارا۔"

زندیق ہنسا۔ "معاف کرنا۔ جیسے ہی تم اچانک بغیر اطلاع کے آدھمکے میں ایک مسودہ پر غور کر رہا تھا۔ یہ میری عمر بھر کی کمائی ہے جس میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ تمام مذہبی

تفرقات کو ایک رشتہ میں پرو دیا جائے۔ ان تمام مذہبی جھگڑوں کو جنہوں نے ہمارے دین کو خراب کیا ہوا ہے۔ میرے دماغ میں یہی خیالات بھرے ہوئے تھے جو میں نے تم پر داغ دیئے۔ اب مجھے اپنے غرناطہ کے سفر کے متعلق تفصیل سے بتاؤ۔"

زہیر نے اطمنان کا سانس لیا۔ اس نے گزشتہ چند دنوں کے تمام واقعات بے کم وکاست بیان کرنے شروع کر دیئے۔ جب اس نے یہ کہا کہ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ اب کسی ذلت کو خاموشی سے برداشت نہیں کریں گے تو زندیق کے کان میں ایک مانوس آواز گونجی۔ کتنی بار اس نے جوانوں کو یہ کہتے سنا تھا کہ وہ عزت کی خاطر اپنی جان تک دینے کو تیار ہیں وہ نہیں چاہتا تھا کہ ایک اور جان ضائع ہو جائے اس نے زہیر کی طرف دیکھا اور کفن میں لپٹی ہوئی لاش کی تصویر اس کی آنکھوں کے سامنے پھر گئی۔ زندیق کانپ اٹھا۔ زہیر نے اس ہلکی سی جنبش کو غلط معنے دیئے۔ اس نے محسوس کیا کہ ایک بار تو اس بزرگ دانا کو اس نے اپنے جذبہ سے متاثر کر دیا ہے۔

"کیا کرنا چاہئے۔ زندیق۔ تمہارا مشورہ کیا ہے؟"

زہیر اس دن اپنے دوستوں کی آمد کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ بابا کی حمایت کی خبر سن کر ان کے حوصلے بہت بڑھ جائیں گے۔ وہ ایک گھنٹہ سے بولے جا رہا تھا اس نے بتایا کہ ان کے منصوبہ کے متعلق ابن موسیٰ کے کیا اعتراض تھے اور ابن داؤد کا اس کم عقلی پر کیا ردعمل تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ زندیق ہی بولتا رہے۔

زہیر کو بابا کی اتنی ضرورت پہلے کبھی محسوس نہیں ہوئی تھی اس لئے وہ بظاہر پوری جرات مندی کے باوجود ابن فرید کا یہ پڑپوتا بہت سنگین وسوسوں میں گرفتار تھا۔ اگر اس کوشش میں وہ سب ختم ہو گئے تو؟ اگر ان کی موت سے مسلم غرناطہ کو نئی زندگی مل سکتی ہے تو ایک ایک جان دے کر بھی یہ مہنگی نہیں ہے۔ لیکن کیا ایسا ممکن ہے؟ اگر ان کی جلد بازی سے اس قدیم سلطنت کا ہر صاحب ایمان فنا ہو جائے؟ زمنس دی سینروس کے نائٹ سب کو قتل کر دیں؟ زہیر طے نہیں کر پا رہا تھا کہ کیا جان سے گذر جانے کا وقت آ گیا ہے۔

زندیق نے بظاہر ایک بے ضرر سے سوال کے ساتھ اپنا جوابی حملہ شروع کیا:

"تو ابن داؤد المصری کہتا ہے کہ وہ ابن خلدون کا پڑپوتا ہے؟"

زہیر نے وثوق کے ساتھ ہاں میں سرہلایا:

"تمہارے لہجہ میں اتنی بے یقینی کیوں ہے؟ تم اس پر کیسے شک کر سکتے ہو جبکہ ابھی

تم اس سے ملے بھی نہیں ہو؟"

"وہ بہت ضدی اور جذباتی لگتا ہے۔ اس کے پردادا نے کبھی ایسا مشورہ نہ دیا ہوتا۔ اس کی دلیل یہ ہوتی کہ مسلمانوں میں مکمل اتحاد کے بغیر فتح ممکن نہیں ہے۔ اندلس میں مسلمانوں کے زوال کی وجہ ہی یہ ہے کہ وہ متحد نہیں ہیں۔ جو جذبہ ہے ہی نہیں تم اسے کس طرح بیدار کر سکتے ہو؟ ان کی فوجیں تمہیں کچل کر رکھ دیں گی۔ یہ تو ایسا ہی ہو گا جیسے کوئی ہاتھی ایک چیونٹی کو روند ڈالے۔"

"ہمیں معلوم ہے۔ لیکن یہی ایک امید ہے۔ ابن داؤد کا کہنا ہے کہ جو قوم شکست کھا جاتی ہے اور دوسروں کی غلام ہو جاتی ہے وہ صفحۂ ہستی سے مٹ جاتی ہے۔"

"بالکل اپنے پردادا کی طرح لیکن کیا اسے یہ بات سمجھ نہیں آتی کہ ہم پہلے ہی شکست کھا چکے ہیں اور اب غلام بنائے جا رہے ہیں۔ اسے میرے پاس لاؤ۔ ان سب کو آج رات مجھ سے ملاؤ۔ ہم اس معاملہ پر سنجیدگی سے غور کریں گے۔ صرف تمہاری ہی زندگیاں خطرہ میں نہیں ہیں۔ خدشہ اس سے کہیں زیادہ ہے کیا تمہارے والد کو علم ہے؟"

زہیر نے نفی میں سر ہلایا۔

"میں انہیں بتانا چاہتا تھا لیکن بڑے چچا میگوئل دادی زہرہ سے ملنے آ گئے...."

زہیر نے خود کو سنبھالا۔ لیکن چوک ہو گئی تھی۔ ممنوعہ نام زبان پر آ گیا تھا۔ اس نے زندیق کی طرف دیکھا وہ مسکرایا۔ "میں سوچ ہی رہا تھا کہ تم کب اس خاتون کا نام لو گے۔ سارے گاؤں میں اور کوئی بات نہیں ہو رہی۔ اب اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ نوجوان۔ یہ بہت پرانی بات ہے۔ پچھلی مرتبہ میں تمہیں بتانے ہی لگا تھا کہ تمہارا ملازم آ گیا اور میں خاموش ہو گیا۔ اب تو تمہیں معلوم ہو گیا ہے کہ زندیق کو کیوں نکالا گیا تھا بلکہ اس کے کھانے پینے کا انتظام بھی کیا گیا تھا"

"اگر تمہیں اس سے محبت تھی تو تم نے قرطبہ جا کر اس کی تلاش کیوں نہیں کی۔ وہ تم سے شادی کر لیتی"

"ہمارے جسموں کی گرمی سردی ایک ہی سطح پر نہیں رہتی' ابن عمر! پہلے تو میں اس کے باپ سے خوف زدہ تھا۔ اس نے مجھے جان سے مار دینے کی دھمکی دی تھی اگر میں قرطبہ میں دیکھا گیا۔ لیکن کچھ اور وجہ بھی تھی۔"

"وہ کیا؟"

"شاید زہرہ اس تمام عرصہ مجھ سے محبت کرتی تھی۔ شاید اس کے اظہار محبت کے

انداز انوکھے تھے۔" زہیر کچھ الجھ گیا۔

"کیا مطلب ہے؟"

"قرطبہ میں تین مہینہ قیام کے بعد وہ ہر اس صاحب حیثیت عیسائی کی گرویدہ ہو گئی جس نے اس کی طرف مسکرا کر دیکھا۔ کئی سال اسی طرح چلتا رہا۔ بہت سال ہوئے۔ جب میں نے اس کے ایڈونچرز کی داستانیں سنیں تو میں کافی عرصہ علیل رہا لیکن پھر سنبھل گیا۔ رو بہ صحت ہو گیا۔ علالت ختم ہو گئی۔ مجھے پھر آزادی کا احساس ہوا۔ حالانکہ میرا دل دن کی روشنی سے محروم ہو گیا"

"اور تم دادی زہرہ کو بھول گئے؟"

"یہ تو میں نے نہیں کہا۔ کیوں؟ میں بھول کیسے سکتا تھا لیکن دروازے سختی سے بند کر دیئے گئے تھے۔ پھر میں نے اور لوگوں کے متعلق بھی ایسی ہی کہانیاں سنیں۔ اس کے بعد میں نے کانوں میں روئی ٹھونس لی۔ کئی سال بعد عمیرہ نے مجھے بتایا کہ بی بی غرناطہ کے میرستان میں ہے" "میرا خیال ہے کہ اس نے تمہیں یہ نہیں بتایا۔ کہ دادی زہرہ اتنی ہی صحیح الدماغ ہیں جتنے میں اور تم۔ انہیں وہاں ان کے باپ کے قطعی حکم کے تحت بھیجا گیا تھا۔ ان کے انتقال سے ایک سال پہلے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ انہیں جان بوجھ کر شادی سے منع کرنے کی سزا دے رہی تھیں۔ میری ماں نے مجھے یہی بتایا تھا"

"ابن فرید جیسے بڑے لوگ ہمیشہ خود کو ہی ہر چیز کا محور سمجھتے ہیں۔ کیا وہ نہیں دیکھ سکتے تھے کہ دادی زہرہ خود اپنے آپ کو سزا دے رہی تھیں۔؟"

"وہ اپنے بھائی سے بہت بے تابی سے ملی۔ حالانکہ اماں نے کہا تھا کہ وہ میگوئل سے نفرت کرتی ہے۔ جب ہم نے وجہ پوچھی تو اماں کا پتھر جیسا چہرہ سخت ہو گیا۔ کیا تمہارے نکالے جانے میں میگوئل کا بھی ہاتھ تھا۔ زندیق؟ مجھے یقین ہے کہ وہ ضرور تمہاری جاسوسی کرتا ہو گا۔"

زندیق دونوں ہاتھوں میں اپنے چہرے کو تھام کر زمین پر گھورنے لگا۔ پھر اس نے سر اٹھایا اور زہیر نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں سے بڑا دکھ جھلک رہا تھا۔ اس کے جھریوں سے بھرا ہوا چہرہ ایک دم سے لٹک گیا۔ زہیر نے سوچا کہ کیسی عجیب بات ہے کہ وہ بھی اماں کی طرح شکلیں بناتا ہے۔

"معاف کرنا بابا' میں تلخ یادوں کو تازہ نہیں کرنا چاہتا تھا میں شرمندہ ہوں" زندیق ایک عجیب سے لہجہ میں بولا۔

"تمہارے نزدیک میگوئل ایک مرتد ہے جس نے ان کے لکڑی کے بتوں اور ان کی دعاؤں کے لئے اپنا سبز رنگ چھوڑ دیا۔ تمہیں وہ قرطبہ کا بشپ بنا اترایا ہوا پھرتا نظر آتا ہے۔ تمہارے مذہب کو برا بھلا کہتا ہے اور تمہیں شرم آتی ہے کہ وہ تمہارا رشتہ دار ہے۔ کیا میں ٹھیک نہیں کہہ رہا؟"

زہیر نے وثوق کے ساتھ سر ہلایا۔

"لیکن اگر میں تمہیں بتاؤں کہ جب وہ ایک لڑکا تھا تو میکال الملک بہت پھرتیلا اور زندہ دل تھا میری جاسوسی کرنے اور باپ سے میری شکایتیں کرنے کے بجائے وہ تو میری اور زہرہ کی خوشی چاہتا تھا۔ وہ شطرنج اتنے شوق سے کھیلتا کہ اگر کچھ نہیں تو کم از کم اسے ان ابتدائی چالوں کی وجہ سے یاد رکھا جائے جن کا اس ملک میں کوئی مقابلہ نہیں تھا' میں بھی نہیں اور بونے کا باپ بھی نہیں۔ جو خاصا مشاق شطرنج باز تھا۔ وہ اکثر اپنے استادوں سے فلسفیانہ مسائل پر الجھتا رہتا اور اس میں وہ ایسی ذہانت کا اظہار کرتا کہ سب دم بخود رہ جاتے۔ خصوصاً اس کی والدہ۔ اس میں اتنی صلاحیتیں تھیں کہ ابن فرید بھی بی بی امی سے کہا کرتے کہ کنیزوں کو اس سے دور رکھا کرو۔ کہیں اسے ان کی نظر نہ لگ جائے اور بعد میں جب یہ واقعات ہوئے تو ہمیں اتنے برسوں پہلے کہی گئی ان کے باپ کی بات یاد آئی۔ میری ماں بی بی امی کی کنیز خاص تھی اور میگوئل کی خدمت پر مامور تھی۔ وہ اکثر ہمارے گھر آیا کرتا تھا مجھے وہ بہت اچھا لگتا تھا۔"

"پھر اس کا جہاز غرق کیوں ہو گیا؟" زہیر نے پوچھا۔ "اس میں کیا راز ہے؟ وہ بیمار کیسے ہوا؟ ہوا کیا' زندیق؟"

"تم واقعی جاننا چاہتے ہو؟ کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں چھیڑنا نہیں چاہئے۔"

میں ضرور جاننا چاہوں گا۔ اور تمہارے سوا مجھے اور کوئی نہیں بتا سکتا"

بوڑھے نے ایک ٹھنڈا سانس لیا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ سچ نہیں تھا۔ شاید عمیرہ کو اس سے کہیں زیادہ معلومات تھیں جو اس تک نہیں پہنچی تھیں لیکن یہ بھی کوئی یقینی بات نہیں تھی کہ ان دونوں میں سے کسی کو سب کچھ معلوم تھا۔"

دو عورتیں اور صرف وہی سب کچھ جانتی تھیں۔ ایک بی بی امی اور ایک ان کی وفادار کنیز' "میری ماں"_ بابا نے سوچا۔ ان دونوں کا انتقال ہو چکا تھا۔ واحد الزندیق کو یقین تھا کہ اس کی ماں کو زہر دیا گیا تھا۔ بنو حزیل مقدر کے قائل نہیں تھے۔ ان کا خیال تھا کہ راز صرف قبر میں ہی محفوظ رہ سکتا ہے۔ یہ فیصلہ کس نے کیا تھا۔؟ زندیق کو عمر کے باپ پر

قطعی شک نہیں تھا۔ یہ عبداللہ ابن فرید کا فیصلہ نہیں تھا۔ ایسی بات اس کے کردار اور مزاج کے خلاف تھی۔ شاید وہ غرناطہ کے حکام کا فیصلہ تھا' وہ معاملات کو طے کرنے کا قائل تھا۔ واقعات کی تمام تفصیلات مرنے والی کے ساتھ ہی دفن ہو گئیں۔

کئی برس بعد زندیق اور عمیرہ نے مل کر اس المیہ کے متعلق اپنی اپنی معلومات کا تجزیہ کر کے اصل واقعات کا کھوج لگانے کی کوشش کی تھی۔ ان کے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں تھا جس سے وہ اپنے خیالات کی تصدیق کر سکتے اور یہی وجہ تھی کہ زندیق بات کرتے ہوئے جھجک رہا تھا۔

"زندیق! تم نے وعدہ کیا ہے کہ تم مجھے سب کچھ بتاؤ گے۔"

"ٹھیک ہے! لیکن ایک بات یاد رکھنا۔ انفل! جو کچھ میں بتانے لگا ہوں ہو سکتا ہے کہ بالکل صحیح نہ ہو۔ میرے پاس حقیقت کے جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں۔"

"یہ فیصلہ مجھ پر چھوڑ دو"

"جب تمہارے پردادا کا انتقال ہوا تو تمہاری دونوں دادیاں بہت بے حال ہو گئیں _ بی بی مریم کے بہت عرصہ سے اس کے ساتھ ازدواجی تعلقات نہیں تھے۔ لیکن انہیں اس سے لگاؤ تھا۔ ابن فرید کا سوتے میں انتقال ہو گیا تھا۔ جب بی بی امی اس پاس آئیں تو انہوں نے معمول کے مطابق اس کے کندھے اور گدی کو دبایا لیکن وہاں کوئی اثر نہ ہوا۔ جب انہیں اندازہ ہو گیا کہ اس کی روح پرواز کر چکی ہے تو انہوں نے چیخ ماری۔ "مریم۔ مریم! ہم پر آفت آ پڑی ہے۔" میری ماں نے بتایا کہ یہ چیخ بہت ہی دلگداز تھی۔ دونوں بیویوں نے جیسا بھی ہو سکا ایک دوسرے کو دلاسہ دیا۔"

"ایک برس بعد بی بی مریم کا بھی انتقال ہو گیا۔ ان کی موت بہت آہستہ آہستہ اور نہایت بھیانک طریقہ سے واقع ہوئی۔ ان کی زبان پر سیاہی ابھر آئی تھی اور وہ سخت تکلیف میں تھیں۔ انہوں نے التجا کی کہ انہیں زہر دے دیا جائے۔ لیکن تمہارے دادا نے ایک نہ سنی۔ غرناطہ اور اشبیلیہ سے بہترین معالج بلائے گئے لیکن وہ منہ کی اس تکلیف کا کوئی علاج نہ کر سکے۔ اور بیماری ان کے پورے جسم میں پھیلتی گئی۔ ابن سینا نے کہا تھا کہ اس بیماری کے اسباب معلوم نہیں ہیں اور یہ لاعلاج ہے۔ اس کا خیال تھا کہ کچھ حالات میں یہ بیماری دماغ میں کچھ رطوبتوں کے جمع ہو جانے سے پیدا ہوتی تھی۔ میں نے کبھی ایسی بیماری پر غور نہیں کیا ہے اور میں اس پر کوئی تبصرہ نہیں کر سکتا۔ بہرحال وجہ کچھ بھی ہو۔ بی بی مریم ابن فرید کے پورے ایک سال بعد وفات پا گئیں۔ میری ماں کہا کرتی کہ شوہر کے مرنے سے

بیس برس پہلے سے ہی ان کا دل روتا رہتا تھا۔"

"اب بی بی اسمی تنہا رہ گئی تھیں۔ زہرہ میرستان میں تھیں۔ میکال لڑکپن کی عمر سے گزر رہا تھا اور گھر میں ٹھہرتا ہی نہیں تھا۔ تمہارے دادا رحمدل انسان تھے۔ لیکن اتنے ہوشیار نہیں سمجھے جاتے تھے۔ ان کی بیوی۔ تمہاری دادی بھی ان ہی کی طرح تھیں۔ بی بی اسمی تمہارے والد کے ساتھ بہت زیادہ وقت گزارتی تھیں۔ وہ اس وقت آٹھ برس کے تھے۔ تمہارے والد نے ان کے دل میں ان کے شوہر کی محبت کی جگہ لے لی تھی۔ خاندان سے باہر ان کی عزیز ترین دوست میری ماں تھی۔ ان کی اپنی ماں ڈوروتھیا پرانی باورچن بے حد اصرار کے باوجود وہاں آکر رہنے پر رضامند نہیں ہوئی لیکن جب بھی کبھی وہ یہاں آئی تو کھانے بہت اچھے پکنے لگتے۔ وہ بہت مختصر عرصہ کے لئے آتی لیکن اس کا آنا بہت اہم تھا جو ہمیشہ یاد رہتا اس لئے کہ وہ بادام کے چھوٹے چھوٹے ایسے کیک بناتی تھی جو منہ میں آتے ہی گھل جاتے تھے۔ وہ واقعی بہت اچھے کھانے بناتی تھی اور یونے کے باپ نے اس سے بہت کچھ سیکھا۔ وہ اس کے عشق میں بھی مبتلا ہو گیا اور اس پر بہت باتیں بھی بننے لگیں۔ خیر۔ مجھے ادھر ادھر کی بات نہیں کرنی چاہئے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ابن فرید کے انتقال کے بعد ڈوروتھیا آجاتی اور اسمی کے ساتھ رہنے لگتی تو یہ المیہ کبھی پیش نہ آتا۔"

زہیر کہانی میں اس قدر کھویا ہوا تھا کہ اب تک اس نے اپنی حیرانی کو چھپائے رکھا۔ بچپن میں اور اب جوان ہوتے ہوئے کبھی ختم نہ ہونے والی خاندانی داستانیں سن سن کر وہ اکثر اپنے والد کو پریشان کرتا کہ اشارتاً ہی کچھ واقعات پر روشنی ڈالے۔ ڈوروتھیا نے پرانے مالک کو نہیں چھوڑا اور اپنی بیٹی کے پاس الحزیل میں نہیں آئی۔ وہ کافی عرصہ سے اس معمہ کو حل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ چنانچہ اس نے زندیق کو ٹوکا۔

"زندیق۔ یہ بات مجھے عجیب لگتی ہے۔ پتہ نہیں کیوں؟ میرا مطلب ہے۔ ڈون الویرو کے ہاں تو وہ صرف باورچن تھی۔ یہاں وہ اپنی تمام زندگی بڑے آرام سے گزارتی۔"

"مجھے نہیں معلوم ابن عمرو وہ ایک بہت ہی نفیس عورت تھی۔ غالباً اسے یہ کچھ اچھا نہیں لگتا تھا۔ کہ وہ ابن فرید جیسے معزز شخص کی ساس تھی۔ شائد اتنے عرصہ کے بعد یوں اچانک مرتبہ میں یہ اضافہ اس کے لئے اتنا پریشان کن نہیں تھا۔ اس کے وہاں رہنے سے انکار پر ابن فرید بھی بہت ناخوش تھا۔ میری ماں ہمارا نوکروں والا کمرہ خالی کر دیتی تھی اور وہ وہیں ٹھہرتی۔"

"المیہ کیا تھا زندیق؟ ہوا کیا تھا؟ مجھے لگتا ہے کہ وقت پھر ہمیں چوٹ دے جائے اور

میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔"

تمہارا مطلب ہے کہ بی بی اسمی کی موت کیسے واقع ہوئی اور میری ماں کو کس نے اسمی مارا؟"

"ہاں۔ اسمی بی بی اتنی عمر کی تو نہیں تھیں!"

"نہیں! اور یہی معمہ ہے۔ وہ ابھی جوان تھیں ان میں زندگی کا ولولہ تھا اور انہیں جسمانی خدوخال پر ناز بھی تھا ان کے دو ہی بچے ہوئے تھے۔"

"بڑے چچا میگوئل اور ولید۔"

"ہاں' ولید کی موت ہمارے لئے ایک بہت بڑا صدمہ تھی۔ ذرا سوچو تمہارے یزید کو بخار ہو اور وہ اچانک مر جائے۔ دیکھا صرف یہ خیال ہی کتنا تکلیف دہ ہے۔ اسمی بی بی تو ابھی اور بہت سے بچے پیدا کرتی لیکن تمہارے پردادا نے دنیا سے کنارہ کشی کر لی۔ میری ماں نے بتایا تھا کہ ابن فرید کی بیوہ کے لئے بہت سے رشتے آئے لیکن انہوں نے سب کو انکار کر دیا۔ تمہارے دادا عبداللہ یہ برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ ان کے والد کی بیوی کو عام عورتوں کی طرح سمجھا جائے۔ چنانچہ بی بی اسمی سب کے درمیان گھر میں ہی تنہا رہیں۔

"تمہارے چچا ابن حشام نے ابن فرید کے انتقال سے کچھ ہی پہلے شادی کی تھی اور غرناطہ میں اپنا کاروبار پھر سے جما لیا تھا۔ سوائے اس کی ماں کے کوئی بھی اسکے کام کو اچھا نہیں سمجھتا تھا۔ اس لئے کہ بنو حزیل کے کسی فرد کا یوں بازار میں بیٹھنا بڑی ذلت کی بات تھی۔ یہ خاندان کے نام پر ایک دھبہ تھا یہ تو شاعروں' فلسفیوں' مدبروں اور بہادروں کا خاندان تھا جن میں ایک سرپھرا مصور بھی تھا جس کی رومانوی تصویروں کو لوگ کہتے تھے کہ قرطبہ میں خلیفہ پسند بھی کرتا تھا لیکن ان سب کا انحصار زمین پر تھا۔ اب ابن فرید کا ایک بھتیجا سوداگروں سے لین دین کرنے لگا تھا ملاحوں سے سودے بازی کرتا تھا اور بڑے عیش کی زندگی گذار رہا تھا۔ اگر حشام اپنے کاروبار سے بد دلی کا اظہار کرتا بھی تو قابل معافی تھا۔ ابن فرید کو بھی بڑا غصہ تھا۔ لیکن وہ ایک بچے کو گھر سے نکال چکا تھا اور اب دوسرے کو کھونا نہیں چاہتا تھا اور پھر بی بی اسمی بھی ایسی کوئی حماقت نہ ہونے دیتی۔"

"لیکن یہ تو پاگل پن لگتا ہے کیا بنو حزیل خود بدو جنگجوؤں کی اولاد نہیں تھے وہ خود بھی تجارت کرتے تھے اور روزانہ کاروانوں سے سودے بازی کرتے تھے' مغرب میں آنے سے پہلے یہی ان کی زندگی تھی کیوں' تم نہیں جانتے؟"

"اچھی طرح ذرا سوچو' عزیزی الفمل۔ بدو سپاہیوں کی اولاد جو عرب سے مغرب میں

آئے اور سفر سے بے زار ہو کر زمین سے چمٹ کر بیٹھ گئے اور اس حد تک کہ جس نے ایسا نہیں کیا اسے لائق مذمت سمجھنے لگے۔"

زہیر جو حشام کے بچوں سے بہت مانوس تھا اسے اس بات سے بہت دکھ پہنچا کہ اسکے دادا کو اتنے ناخوشگوار حالات کا سامنا کرنا پڑا۔

"مجھے پتہ نہیں لیکن میں تم سے اتفاق نہیں کرتا۔ صحرا نشینی میں بھی ہمارے بزرگ شہر والوں کو اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ مجھے یاد ہے۔ اماں کہا کرتی تھی کہ شہر والے نکمے اور مفت خورے ہوتے ہیں۔"

زندیق ہنسا۔ "ہاں وہ یہی کہے گی۔ عمیرہ دوسروں کے تعصبات کو اپنانے کی عادی تھی۔ لیکن عزیزی الفحل ذرا سوچو۔ شہروں کی ایک سیاسی اہمیت ہوتی ہے جو گاؤں کی نہیں ہوتی۔ جیسے تمہارے اس گاؤں کی۔ تمہاری پیداوار کیا ہے؟ ریشم۔ ان کی پیداوار کیا ہے؟ قوت ابن خلدون نے ایک جگہ لکھا....."

زہیر کو ایک دم سے احساس ہوا کہ یہ چالاک لومڑ اسے تاریخ کے فلسفہ کی طویل بحث میں الجھانا چاہتا ہے اور شہری اور دیہاتی زندگی کا مقابلہ کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ اس نے اسے ٹوک دیا۔

"زندیق۔ بی بی امی کا انتقال کیسے ہوا؟ مجھے یہ سوال دہرانا اچھا نہیں لگتا"

بوڑھے کی آنکھوں میں چمک تھی اور اسکے چہرے پر جھریاں پڑی ہوئی تھیں۔ وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں مسکرایا اور پھر فوراً ہی اس کی آنکھوں کا رنگ بدلا اور ان میں کسی بڑی مصیبت کے آثار نظر آنے لگے۔ وہ موضوع کو بدلنا چاہتا تھا۔ لیکن زہیر اسے گھور رہا تھا۔ اس کے باریش چہرے کی نرمی پر ایک سنجیدگی طاری ہو گئی تھی جس نے زندیق کو چونکا دیا۔ وہ تیز تیز سانس لینے لگا۔

"ابن فرید کی وفات کے چھ سال بعد بی بی امی حاملہ ہو گئی"

"کیسے؟ کون؟" زہیر نے رندھے ہوئے گلے سے بڑے کرب کے عالم میں سرگوشی کے سے لہجہ میں کہا۔

"تین لوگوں کو حقیقت کا علم تھا۔ میری ماں اور دو اور' میری ماں اور امی بی بی کا انتقال ہو چکا ہے صرف ایک شخص باقی ہے۔"

"مجھے معلوم ہے بڈھے' بے وقوف" زہیر کو غصہ آگیا

"ہاں' ہاں' نوجوان زہیر الفحل۔ تم پریشان ہو گئے تم ان میں سے کسی کو نہیں جانتے

لیکن پھر بھی تمہاری حمیت کو دھکا لگا ہے۔"

تعجب ہے۔ زندیق نے سوچا اس لڑکے پر کتنا اثر ہوا ہے۔ اس سے اس بات کا کیا تعلق؟ کل کے افریتوں کی مہلک آگ آج بھی ان کے جذبات کو بھڑکاتی ہے اب بات چھپائی نہیں جا سکتی۔ اس نے زہیر کے چہرے کو تھپتھپایا اور اس کی پیٹھ کو تھپکا اور پانی کا گلاس پیش کیا۔

"تم اندازہ کر سکتے ہو کہ اس بات کے کھلنے سے کتنا ہنگامہ بپا ہوا ہو گا۔ خاندان کی بزرگ خواتین جن میں سے اکثر زیادہ کھانے کی وجہ سے خیال تھا کہ مر چکی تھیں۔ قرطبہ بلانسیا۔ اشبیلیہ اور غرناطہ سے گھر پر نازل ہونے لگیں۔ بری خبر ہمیشہ تیزی سے پھیلتی ہے۔ بی بی امی اپنے کمرے سے باہر نہیں آئیں۔ میری ماں ان کے اور ان چڑیلوں کے درمیان رابطے کا کام دیتی رہی۔ غرناطہ کی ایک بوڑھی' جو اپنے کام میں بہت ماہر سمجھی جاتی تھی' نے ناجائز بچے کو نکالنے کی کوشش کی۔ میری ماں بھی اس کے ساتھ وہاں موجود تھی۔ آپریشن کامیاب رہا۔ پریشانی ختم ہو گئی۔ ایک ہفتہ بعد بی بی امی کی وفات ہو گئی۔ خون میں زہر چلا گیا تھا۔ صرف اتنا ہی نہیں تھا جب تمہارے دادا اور دادی انہیں ملنے گئے تو بی بی امی نے کمزور سی آواز میں کہا کہ وہ مرنا چاہتی ہیں۔ ان میں زندہ رہنے کی خواہش ختم ہو چکی تھی۔ یہ ذلت ناقابل برداشت تھی۔ حشام اور اس کی بیوی اپنے بیٹے کے ساتھ۔ جو بی بی امی کا زبردست چہیتا تھا اور ہفتوں وہاں آکر رہتا تھا گھر میں موجود تھے۔ اس طرح ابن حشام تمہارے والد کے بہت قریب آ گیا اور رہا میکال۔ تو وہ خود بہت بیمار ہو گیا اور بستر مرگ پر پڑی اپنی ماں سے ملنے بھی نہیں گیا نہ انہوں نے ہی اسے بلایا"

لیکن وہ تھا کون' زندیق؟ صاف پانی کیسے ایک دم گندہ ہو گیا؟"

"میری ماں نے ان واقعات کو ہوتے تو نہیں دیکھا لیکن بی بی امی نے اسے ہر مناسب بات بتا دی۔ تین ہفتہ بعد میری ماں بھی مر گئی۔ وہ زندگی بھر کبھی بیمار نہیں ہوئی تھی۔ میں گاؤں میں آیا اور بی بی امی کے جنازے میں شرکت کی اجازت چاہی اسے نامناسب سمجھا گیا۔ لیکن میں نے اپنی ماں سے ملنے کا راستہ نکال لیا۔

"وہ معموں میں بات کرتی رہی وہ اس شخص کا نام لینا نہیں چاہتی تھی لیکن اس کی باتوں سے اور جو کچھ عمیرہ نے دیکھا تھا اس سے میں نے اندازہ لگا لیا کہ یہ سب کچھ کیا تھا۔ کم از کم ہمیں یقین تھا۔"

زہیر کا سانس تیز تیز چلنے لگا اور جب زندیق پانی پینے کے لئے رکنے لگا تو زہیر کے چہرہ

کا رنگ سرخ ہو گیا۔

"بتاؤ' بڈھے' بولو!"

"تم اس گھر سے اچھی طرح واقف ہو' زہیر بن عمر۔ بی بی امی ان ہی کمروں میں رہتی تھیں جو اب تمہاری والدہ کے پاس ہیں۔ تم ہی بتاؤ کہ کبھی کوئی اجنبی یا مرد ملازم تک بھی وہاں پھٹک سکا ہے؟"

زہیر نے انکار میں سر ہلایا۔

"تمہارے والد کے علاوہ اور کون سے مرد وہاں آجا سکتے ہیں؟"

"شاید یزید اور میں"

"بالکل ٹھیک"

کچھ دیر تک زہیر کی سمجھ میں نہیں آیا کہ بات کیا ہو رہی ہے۔ اسے جیسے اچانک سر پر ایک گھونسا لگا۔ اس نے بڑی دہشت کے ساتھ داستان گو کو دیکھا

"تمہارا یہ مطلب تو نہیں..... یہ نہیں ہو سکتا......" لیکن نام اس کی زبان پر نہ آ سکا۔ آخر زندیق کو ہی نام بتانا پڑا

"میکال' میگوئل۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"تمہیں یقین ہے؟"

"یقین کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ صرف مفروضہ ہے۔ حمل کے ظاہر ہونے سے ہفتوں پہلے سب نے دیکھا کہ میکال کا رویہ کچھ عجیب سا تھا۔ وہ اب گاؤں کے حمام میں جا کر ننگی عورتوں کو نہیں جھانکتا تھا۔ اس نے ہنسنا چھوڑ دیا تھا۔ اس کے بغیر داڑھی کا چہرہ بھاری اور اداس ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھیں بے خوابی کی وجہ سے بھاری ہو گئی تھیں۔ غرناطہ سے معالج بلائے گئے لیکن وہ مجبور تھے۔ مرض لاعلاج تھا۔ چنانچہ انہوں نے سمندری ہوا' تازہ پھل اور جڑی بوٹیوں کے علاج کی تجویز پیش کی۔ تمہارے بڑے چچا کو ایک مہینہ کے لئے ملاکا بھیج دیا گیا۔ گھر سے دور رہنے کا یقیناً اچھا اثر ہوا ہو گا۔

واپسی پر وہ بہت بہتر لگتا تھا۔ لیکن جنہیں اندرونی کرب کا اندازہ نہیں تھا۔ انہیں اس بات پر بہت تعجب تھا کہ وہ اپنی ماں کے کمرے کے قریب کبھی نہیں گیا۔ میرا خیال ہے کہ ایک مرتبہ اس کی ماں نے اس سے بات کی۔ جنازے پر اسے قرار آتا ہی نہیں تھا۔ وہ چالیس دن تک روتا رہا۔ اس کے بعد وہ لمبے عرصہ تک بیمار رہا۔ وہ پھر صحت یاب نہیں ہوا۔ وہ میکال جسے میں جانتا تھا مر گیا تھا۔ اس المیہ نے تین جانیں لے لیں۔ قرطبہ کا بشپ

تو ایک زندہ لاش ہے۔"

"لیکن یہ ہوا کیسے' زندیق؟"

"یہ کوئی راز نہیں۔ جب وہ گود میں تھا اسی وقت سے میکال بہت چہیتا تھا۔ وہ اپنی ماں اور دوسری عورتوں کے ساتھ نہایا کرتا تھا۔ عمیرہ نے مجھے بتایا کہ وہ سولہ سال کا ہو گیا تھا پھر بھی جب بی بی امی نہا رہی ہوتیں تو حمام میں چلا جاتا بلکہ کپڑے اتار کر حمام میں کود پڑتا۔ وہ ابھی جوان ہی تھی۔ مجھے معلوم نہیں کہ شروعات کس نے کی _ لیکن میں اس کی مشکل کو سمجھ سکتا تھا۔ وہ بھی عورت تھی اور اسے بھی اس لذت کی ضرورت محسوس ہوتی تھی جس سے وہ ابن فرید کی وفات کے بعد محروم ہو گئی تھی۔ جس وقت یہ سب کچھ ہوا تو اتنا گداز اتنا وجدانی اور اتنا راحت انگیز تھا کہ وہ بھول گئی وہ کون تھی۔ وہ کون تھا اور وہ کہاں تھے۔ پھر فوراً ہی یہ ایک تلخ یاد بن گئی اور اس کے پاس موت کے علاوہ اس کا کوئی چارہ نہیں تھا۔ ہم کون ہوتے ہیں اس پر الزام لگانے والے۔ زہیر؟ ہم کس طرح سمجھ سکتے ہیں کہ اسے یہ سب کیسا لگتا تھا؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ میں جاننا بھی نہیں چاہتا۔ لیکن یہ تھا پاگل پن۔"

"ہاں' ایسا ہی تھا اور اس کے قریب جو لوگ تھے ایک دم سے ان کا رویہ سخت ہو گیا اور وہ کسی طرح کی رعایت کرنے کو تیار نہیں تھے۔ مجھے تو شک ہے کہ بوڑھی دائی کو بھی ماں اور بچے کی موت پر اکسایا گیا تھا۔"

"بی بی امی کو ہمارا مذہب قبول کرنے کا بہت افسوس ہوا ہو گا"

"تم ایسا کیوں سمجھتے ہو؟"

"اس لئے کہ اگر وہ مورتیوں کو ہی پوجتی رہتی تو وہ یہ بہانہ بنا سکتی تھی کہ اس کے جسم میں بچہ کا ظہور ایک معجزہ تھا۔"

"تمہارے لہجہ میں تلخی آتی جا رہی ہے۔ بہتر ہے اب تم گھر چلے جاؤ۔"

"میرے ساتھ چلو' زندیق۔ تمہیں خوش آمدید کہا جائے گا۔"

بوڑھا اس اچانک دعوت پر بوکھلا یا۔

"شکریہ! میں زہرہ سے ملنا چاہتا ہوں مگر کسی اور دن۔"

"تم روز روز کی اس تنہائی کو کیسے برداشت کرتے ہو؟"

"میں اب اسے دوسری طرح دیکھتا ہوں۔ یہاں میں طلوع آفتاب کا وہ منظر دیکھتا ہوں جو کوئی اور نہیں دیکھتا۔ اور یہاں سے غروب آفتاب کا منظر بھی ایسا ہے کہ کم ہی لوگ

دیکھتے ہوں گے۔ اس وقت یہ منظر دیکھو۔ کیا یہ بالکل جنت کا ساسماں نہیں ہے؟ اور پھر میرے مسودے بھی ہیں جو سال بہ سال بڑھتے رہتے ہیں۔ تنہائی کا اپنا ایک مزہ ہے۔ دوست"

"لیکن اس کے دکھ؟"

"چوبیس گھنٹوں میں سے ایک ساعت ہمیشہ دکھ خود ترسی' الجھن اور دوسروں سے ملنے کی تمنا سے پر ہوتی ہے۔لیکن ایک ساعت جلد ہی گزر جاتی ہے۔ اب دوڑ جاؤ' دوست۔ آج رات تمہیں بہت اہم کام کرنے ہیں اور وہ جو خود کو ابن خلدون کا پوتا کہتا ہے اسے میرے پاس لانا نہ بھولنا۔"

"تم اتنے شکی کیوں ہو؟"

"اس لئے کہ ابن خلدون کا سارا خاندان ٹیونس سے قاہرہ جاتے ہوئے جہاز کے ساتھ ڈوب گیا تھا۔ اب جاؤ' سلام علیکم"

باب 6

"بونے جب میں بڑا ہوں گا تو میں بھی تمہاری طرح باورچی بنوں گا۔"

بڑے باورچی نے جو ایک بہت بڑے تھال پر بیٹھا ہوا ایک بڑے سے لکڑی کے ہاون دستہ میں گوشت' دال اور گیہوں کا مسالہ بنا رہا تھا چھوٹے سے سٹول پر بیٹھے ہوئے لڑکے کی طرف دیکھا اور مسکرایا۔

"یزید ابن عمر"_ قیمہ کوٹتے ہوئے اس نے کہا۔ "یہ بہت مشکل کام ہے۔ کہیں نوکری حاصل کرنے کے لئے تمہیں سینکڑوں کھانے بنانے سیکھنے پڑیں گے۔"

"میں سیکھ لوں گا' بونے۔ میں وعدہ کرتا ہوں"

"تم نے حریسہ کتنی مرتبہ کھایا ہے؟"

"سینکڑوں ہزاروں بار۔"

"ٹھیک ہے۔ چھوٹے آقا! لیکن کیا تمہیں معلوم ہے یہ کیسے بنتا ہے اور گوشت میں کون سے مصالحے ڈالے جاتے ہیں؟ نہیں۔ تمہیں معلوم نہیں۔ صرف اس ایک کھانے بنانے کے ساٹھ طریقے ہیں۔ میں اسے بڑے استاد بغدادی کے بتائے ہوئے طریقہ کے مطابق بناتا ہوں لیکن میں اس میں مصالحے اپنی مرضی کے ڈالتا ہوں۔"

"یہ صحیح نہیں ہے۔ اماں نے مجھے بتایا تھا کہ تمہارے باپ نے تمہیں کھانے بنانا سکھائے ہیں۔ وہ اسے باورچیوں کا بادشاہ کہتی تھی۔"

اور اس کو کس نے سکھایا تھا؟ تمہاری وہ اماں سٹھیاتی جا رہی ہے۔ صرف اس لئے کہ وہ مجھے بچپن سے جانتی ہے وہ سمجھتی ہے کہ میرے اندر کوئی صلاحیت ہی نہیں ہے۔ میرا باپ یقیناً مٹھائی بنانے میں بڑی جدتیں دکھاتا تھا۔ اس کی سویوں اور کھجوروں کی کھیر جو وہ

دودھ میں ہلکی آنچ پر پکاتا تھا تمام اندلس میں بے مثال تھی۔ تمہارے دادا کی شادی پر سلطان اندلس یہاں آیا تھا۔ کھیر کھانے کے بعد اس نے میرے باپ کو الحمرا لے جانا چاہا۔ لیکن ابن فرید مرحوم نے کہا "بالکل نہیں"۔

لیکن کھانوں کی دنیا میں میرے دادا سے اس کا کوئی مقابلہ نہیں تھا۔ اور اسے خود بھی یہ اچھی طرح معلوم تھا۔ چھوٹے آقا! آپ جانتے ہیں کوئی بھی فن کار دوسروں کے نسخوں پر بھروسہ نہیں کرتا۔ کتنا نمک ڈالا جائے؟ کتنی کالی مرچ؟ کون کون سی جڑی بوٹیاں؟ یہ صرف سیکھنے کی بات نہیں گو یہ بھی اہم ہے۔ یہ تو فطری صلاحیت کا معاملہ ہے۔ یہی ہمارے فن کا راز ہے۔ یوں سمجھو کہ تم کوئی اپنی دل پسند چیز پکانے لگے ہو اور گھر میں پیاز نہیں ہے۔ تم لہسن' ادرک' انار دانہ اور فلفل کا مصالحہ بناتے ہو اور پیاز کی جگہ اسے ڈال لیتے ہو اس میں تھوڑا سا انگور کا رس جوش دے کر ڈال لو تو بہت اچھا کھانا تیاز ہو جائے گا۔ بی بی زبیدہ جن کی فراخدلی مشہور ہے۔ شام کے کھانے پر اسے تھوڑا سا لیتی ہیں۔ ان کے سامنے کوئی چالاکی نہیں چلتی۔ ایک منٹ کے لئے بھی نہیں۔ فوراً وہ سمجھ جاتی ہیں کہ یہ کوئی بالکل ہی نئی چیز ہے۔ کھانے کے بعد مجھے ان کے سامنے بلایا جاتا ہے۔ وہ مجھے شاباش دیتی ہیں اور پھر کچھ تفصیلات پوچھتی ہیں۔ ظاہر ہے میں انہیں اپنا راز بتا دیتا ہوں۔ لیکن بتاتے بتاتے ہی میں بھول جاتا ہوں کہ کون سی چیز کتنی ڈالی تھی۔ ہو سکتا ہے میں پھر کبھی ایسا نہ پکا سکوں۔ لیکن جنہوں نے ایک دفعہ اسے چکھا ہے وہ اس کا ذائقہ کبھی نہیں بھولیں گے۔ ایک اچھا کھانا ایک اچھی نظم کی طرح دوبارہ تیار نہیں کیا جا سکتا۔ اگر تم باورچی بننا چاہتے ہو تو میری ان باتوں کو یاد رکھنا۔ یزید پر بہت رعب پڑا

"بونے کیا تمہارا خیال ہے کہ تم جینئس ہو؟"

"بے شک چھوٹے آقا! ورنہ میں اور کس لئے تمہیں یہ سب کچھ بتا رہا ہوں؟ یہ حریسہ ہی لو جو میں اس وقت پکا رہا ہوں یہاں آؤ اور غور سے اسے دیکھو۔"

یزید اپنا سٹول باورچی کے قریب لے آیا اور اس نے پتیلی میں جھانکا۔

"یہ رات بھر پکتا رہا ہے۔ پرانے زمانہ میں صرف بھیڑ کا گوشت ہی استعمال ہوتا تھا لیکن میں اکثر بچھڑے' مرغ یا گائے کا گوشت استعمال کرتا ہوں تاکہ ذائقہ میں کچھ فرق آ جائے۔ ورنہ تمہارے گھر والے میرے پکانے سے اکتا جائیں گے اور یہ میرے لئے بڑی پریشانی کی بات ہو گی۔"

"تم نے حریسے میں ڈالا کیا ہے؟"

"پورے بچھڑے کا گوشت' تین پیالے چاول جس میں نشاستہ ملا ہوا تھا۔ سرخ دال کا ایک پیالہ اور ایک پیالہ میں چھوٹے مٹر' پھر میں نے پانی ڈال کر اسے رات بھر پکانے کے لئے رکھ دیا۔ لیکن جانے سے پہلے میں نے اس میں ثابت دھنیا بڑی الائچی ایک چھوٹے سے باریک کپڑے میں باندھ کر ڈال دی۔ صبح تک گوشت اچھی طرح گل گیا تھا اور اب میں اس کو گھوٹ رہا ہوں۔ لیکن جمعہ کے دوپہر کے کھانے تک میں اب کیا کروں گا؟"

"کچھ پیاز اور مرچیں صاف مکھن میں تل لو اور حریسے پر بھگار دے دو۔"

"بہت خوب چھوٹے آقا! لیکن بھنے ہوئے پیاز صاف مکھن میں تیرتے نظر آنے چاہئیں۔ شاید اگلے ہفتہ میں اس کھانے میں کچھ اور ملاؤں۔ شاید کچھ انڈے جو مکھن میں تلے ہوئے ہوں اور ان پر کالی مرچ اور پودینہ وغیرہ چھڑکا ہوا ہو حریسے میں ملا دئے جائیں۔ لیکن جمعہ کی نماز سے پہلے ایسی غذا معدہ کے لئے ذرا بھاری ہو گی۔ ایسا نہ ہو کہ جب وہ نماز پڑھتے ہوئے جھکیں تو پیچھے سے ان کی ریح نکل جائے اور جو اس کی زد میں ہوں انہیں بہت برا لگے"

یزید کی ہنسی کچھ ایسی بے ساختہ تھی کہ بونا بھی دانت دکھانے لگا۔ پھر لڑکے کے چہرے پر بہت سنجیدگی طاری ہو گئی۔ اس کی کشادہ پیشانی پر ایک بل پڑ گیا۔ آنکھیں گہری ہو گئیں۔ اس کے ذہن میں دفعتاً" کوئی خیال آ گیا تھا۔

"بونے!"

"ہاں؟"

"کیا تم کبھی یہ نہیں سوچتے کہ تم بونے نہ ہوتے ایک لمبے چوڑے مرد ہوتے جیسے زہیر؟ پھر تم سارا دن اس باورچی خانہ میں گھسے رہنے کے بجائے ایک نائٹ ہوتے؟"

"اللہ تمہیں خوش رکھے یزید بن عمر۔ میں تمہیں ایک کہانی سناتا ہوں۔ ایک زمانہ میں جب ہمارے نبیؐ حیات تھے ایک بندر ایک مسجد میں پیشاب کرتا ہوا پکڑا گیا۔"

یزید ہنسنے لگا۔

"ہنسو نہیں یہ ایک بہت غلط حرکت تھی۔ چوکیدار بندر کی طرف بڑھا اور چلایا! کافر' بدمعاش تمہیں خدا کا خوف نہیں ہے۔ وہ تمہیں سزا دے گا اور تمہاری جون بدل دے گا۔ بندر پر اس لعنت ملامت کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ گستاخ جانور نے کہا کہ اگر اسے ہرن بنا دیا گیا تو یہ واقعی ایک سزا ہو گی۔ تو آپ سمجھے چھوٹے آقا! میں تو یہی چاہوں گا کہ باورچی خانہ میں میں رہوں اور نئے سے نئے کھانے بناتا رہوں نہ کہ ایک نائٹ بن جاؤں جس کی

جان کے پیچھے دوسرے نائٹ لگے ہوں۔"

"یزید! یزید! وہ چھوٹا شیطان کہاں ہے۔ عمیرہ؟ اسے ڈھونڈو۔ اس سے کہو کہ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں"

صحن میں میگوئل کی آواز گونجی اور باورچی خانہ تک پہنچی۔ یزید نے بونے کی طرف دیکھا اور منہ پر انگلی رکھ لی۔ سوائے گوشت کے پکنے اور ابلنے کے باقی مکمل خاموشی تھی۔ پھر وہ اس چبوترے پر کھڑا ہو گیا جو بونے کے الماریوں تک پہنچنے کے لئے بنایا گیا تھا۔ مگر اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اماں وہاں پہنچ گئی اور اسے پکڑ لیا۔

"واللہ۔ باہر آؤ اور اپنے بڑے چچا سے ملو۔ اگر تم نے کوئی بدتمیزی کی تو تمہاری والدہ سخت ناراض ہوں گی"

یزید باہر آیا۔ بونے نے ہمدردی سے اس کی طرف دیکھا۔

"بونے" لڑکے نے پوچھا "بڑے چچا میگوئل میں سے اتنی بدبو کیوں آتی ہے؟ اماں کہتی ہے...."

"مجھے معلوم ہے اماں کیا کہتی ہے۔ مگر ہمیں کوئی معقول جواب چاہئے۔ دیکھو چھوٹے آقا! اگر کوئی پیاز کے چھلکوں میں گھس جائے گا تو اس میں سے سخت بو آنے لگے گی۔"

اماں نے گھور کر باورچی کو دیکھا اور یزید کا ہاتھ پکڑ کر اسے باہر لے گئی۔ وہ ہاتھ چھڑا کر گھر کی طرف بھاگ گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ صحن سے بچ کر نکل جائے اور خفیہ راستہ سے غسل خانہ میں گھس جائے۔ لیکن میگوئل اس کی تاک میں تھا اور لڑکے نے ہار مان لی۔

"السلام علیکم۔ بڑے چچا"

"اللہ خوش رکھے میرے بچے۔ میں نے سوچا کہ کھانے سے پہلے شطرنج کی ایک بازی ہو جائے"۔ یزید خوشی سے اچھل پڑا۔ پہلے جب بھی کبھی اس نے شطرنج کھیلنے کی بات کی تو بڑوں نے اسے ٹال دیا۔ میگوئل جو کبھی کبھی آتا تھا اس سے بات تک نہیں کرتا تھا۔ لڑکا دوڑ کر اندر گیا اور شطرنج لے آیا۔ پھر بشپ کی طرف پیٹھ کر کے اس نے دونوں ہاتھوں میں ایک ایک ملکہ پکڑی اور بند مٹھیاں بڑے چچا کی طرف بڑھا دیں۔ میگوئل نے کالی ملکہ والی مٹھی پکڑ لی۔ یزید نے دل ہی دل میں اسے ملامت کی۔ اب میگوئل نے شطرنج کے مہروں کو دیکھا۔ وہ ایک ایک مہرے کو غور سے دیکھنے لگا۔ جب وہ بولا تو اس کی آواز خوف سے بھری ہوئی تھی۔

"یہ تم نے کہاں سے لی؟"

"والد نے سالگرہ پر تحفہ میں دی تھی"

"یہ کس نے بنائی ہے؟"

ابھی یوآن کا نام اس کی زبان پر آنے ہی لگا تھا کہ یزید کو یاد آیا کہ اس کے سامنے جو شخص بیٹھا تھا وہ چرچ کا خادم تھا۔ اماں کی کہی ہوئی ایک بات یاد آنے پر وہ محتاط ہو گیا۔ اب اس کی ذہانت نے کام دکھایا۔

"میرا خیال ہے کہ اشبیلیہ میں کسی دوست نے بنائی تھی"

"مجھ سے جھوٹ مت بولو لڑکے۔ میں نے اتنے لوگوں کے اعتراف سنے ہیں کہ میں لہجے سے ہی سمجھ جاتا ہوں کہ کوئی جھوٹ بول رہا ہے یا سچ۔ مجھے سچ سچ بتاؤ"

"میرا خیال تھا کہ آپ بازی لگانا چاہتے تھے"

میگوئل نے لڑکے کے پریشان چہرے کو دیکھا۔ اسے اپنا بچپن یاد آ گیا۔ وہ اسی صحن میں اسی فرش پر شطرنج کھیلتا تھا۔ تین مرتبہ اس کا مقابلہ قرطبہ کے ایک استاد سے ہوا تھا۔ میگوئل کو یاد آیا کہ سارا خاندان میز کے گرد اکٹھا ہو گیا تھا اور سب بڑے چھوٹے خوش ہوتے جب استاد بار بار ہارتا تھا اور جب اس کے بھائی نے اسے خوش ہو کر گود میں اٹھایا تو سب تالیاں بجانے اور داد دینے لگے۔ سب سے زیادہ خوش اس کی ماں اسمی تھی۔ ان یادوں نے اسے ہلا دیا اور اس نے سر اٹھا کر ہند، کلثوم اور قاہرہ کے نوجوان مہمان ابن داؤد کی طرف دیکھا وہ سب مسکرا رہے تھے۔ ہند نے دور سے دیکھ کر اندازہ لگا لیا تھا کہ یزید مشکل میں تھا۔ یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ اس پریشانی کا سبب یہ شطرنج تھی۔ خیالوں میں گم میگوئل نے کالی ملکہ کو اپنی مٹھی میں بھینچا ہوا تھا۔

"یزید تم نے بازی لگالی ہے؟ اس نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔

"شرم کریں بڑے چچا میگوئل" ہند نے بھائی کو بازوؤں میں لیتے ہوئے کہا۔ "آپ اتنے ظالم ہیں!"

میگوئل اس کی طرف مڑا۔ اس کی عقاب جیسی ناک ہلکی سی تلخ ہنسی کی وجہ سے ذرا چڑھ گئی۔

"یہ مہرے کس نے بنائے ہیں۔ یہ کہاں سے آئے ہیں؟"

"اشبیلیہ سے! بات کیا ہے؟"

یزید نے حیرانی سے اپنی بہن کی طرف دیکھا اور میگوئل کی مٹھی سے کالی ملکہ کو لے لیا۔ ہند ہنسنے لگی۔

بڑے چچا میگوئل اس سے کھیلیں۔ آپ جیت نہیں سکیں گے۔"

میگوئل نے لڑکے کی طرف دیکھا۔ اب یزید ڈرا ہوا نہیں تھا۔ اس کے چہرے پر ایک شریر سی مسکراہٹ لوٹ آئی تھی۔ اس کی تمام تر کوشش کے باوجود بچپن کی یادیں اس کے ذہن میں اُمڈتی چلی آ رہی تھیں۔ یہ ماحول' یہ صحن اور نو برس کا یہ شریر بچہ جس کی آنکھوں سے گستاخی جھلکتی تھی میگوئل کو یاد آیا کہ کس طرح ہر عیسائی معزز مہمان سے جو اس کے باپ سے ملنے آتا وہ بحث کیا کرتا تھا اکثر وہ ہتھیار ڈال دیتے اور کس طرح سارا گھر اس کی جیت پر خوش ہوتا۔

کتنی عجب بات تھی کہ وہ دنیا جو کب سے اس کے لئے مرچکی تھی ابھی تک اس گھر میں سانس لے رہی تھی۔ میگوئل کا جی چاہا کہ وہ یزید کے ساتھ بازی لگا ہی لے۔ وہ ابھی کھیل شروع کرنے والے ہی تھے کہ اماں نے اطلاع دی کہ کھانا لگا دیا گیا ہے۔

"تم نے ہاتھ دھولئے ہیں میگوئل؟" زہرہ کی تیز آواز سے عمر ابن عبداللہ کا سارا گھر چونک گیا۔ لیکن بھائی نے مسکرا کر بہن کی طرف دیکھا وہ اس آواز کو پہچانتا تھا۔

"میں کوئی دس برس کا بچہ نہیں ہوں زہرہ"

"مجھے اس سے کوئی مطلب نہیں کہ تم دس برس کے ہو یا نوے برس کے جاؤ ہاتھ دھوؤ"

یزید نے دیکھا کہ ہند اپنی ہنسی ضبط کرنے کی کوشش کر رہی ہے اور بے ساختہ اس کی گھگھی سی بندھ گئی ہے۔ ہنسی روکنے کی کوشش میں اس کے آنسو نکل آئے تھے۔ جب زبیدہ پر بھی ہنسی کا دورہ پڑنے لگا تو میگوئل نے سوچا کہ پیشتر اس کے کہ کھانے کی میز سرکس کا تماشہ بن جائے اسے کچھ کرنا چاہئے وہ ہلکے سے ہنسا۔

" عمیرہ تم نے زہرہ کی بات سنی۔ چلو آؤ"

عمیرہ پانی لے کر آئی اور ایک نوجوان ملازم سلپچی لے کر آیا اور پیچھے پیچھے ایک لڑکا تولیہ لئے ہوئے تھا۔ میگوئل نے ہاتھ دھوئے' سب خاموشی سے دیکھتے رہے' جب وہ ہاتھ دھو چکا تو اس کی بہن نے اسے شاباش دی۔

"بچپن میں بھی تم ایسے ہی تھے میں آنکھیں بند کروں تو اب بھی تم مجھے چیختے چلاتے نظر آؤ گے اور ام زیدون اور تمہاری مرحومہ ماں تمہارے سر اور بدن پر صابن لگاتی دکھائی دیں گی۔ وہ اسی طرح تمہیں اچھی طرح نہلا کر حمام میں ڈال دیتی تھیں۔"

بی بی امی کا نام آنے پر زہیر کچھ چونک گیا۔ اس نے زہرہ اور میگوئل کی طرف

دیکھا۔ لیکن ان کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ میگوئل نے اپنی بہن کی طرف دیکھ کر سر کو ہلایا۔

"تمہیں اس گھر میں دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی ہے بہن"

دوپہر کا کھانا بڑے ذوق شوق سے کھایا گیا۔ بونا جو برابر کے کمرے سے چھپ چھپ کر باتیں سن رہا تھا' کھانے کی تعریف پر بہت خوش تھا۔ تعریفی جملے سارے کمرے میں گونج رہے تھے۔ بونے کی تعریف اس وقت انتہا کو پہنچ گئی جب زہرہ اور میگوئل نے ایک ساتھ کہا کہ اس کا حریسہ اس کے باپ کے حریسہ سے کہیں زیادہ لذیذ تھا۔ اس پر یہ ماہر باورچی اپنے کمال پر خوش ہو کر اپنے باورچی خانہ کی طرف لوٹ گیا۔

زہرہ نے اپنے بھائی سے پوچھا۔ "مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم قرطبہ میں بشپ کے محل میں بڑی شان سے رہتے ہو اور تمہارا موٹا بیٹا بھی تمہارے ساتھ رہتا ہے۔ تمہارا یہ انجام کیوں ہوا؟"

میگوئل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ زہیر انہیں کھانا کھاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ زہرہ کو یقیناً معلوم ہو گا کہ میگوئل نے کیوں تمام پرانے طریقوں کو خیرباد کہا۔ پھر عمر نے اعلان کیا کہ اب مردوں کے رخصت ہونے کا وقت آگیا ہے۔ ابن داؤد' یزید اور زہیر فوراً کھڑے ہو گئے اور انہوں نے اجازت چاہی۔ وہ جمعہ کی نماز کی تیاری کے لئے اپنے کمروں میں گئے۔

زہرہ اور میگوئل نے ہاتھ دھوئے اور صحن کی طرف چلے۔ جہاں سردیوں کی دھوپ میں آرام کرنے کے لئے ایک تخت رکھا ہوا تھا جس پر قالین بچھا تھا۔ اماں ایک ٹرے لے کر آئی جس کے مختلف خانوں میں بادام' اخروٹ' کھجوریں اور کشمش رکھے ہوئے تھے اور ان کے سامنے رکھ دی۔

"الحمداللہ! تم دونوں کو یہاں دیکھ کر میرے دل کو بہت خوشی ہوئی۔"

" عمیرہ" میگوئل نے کھجور میں سے بیج نکال کر اس میں بادام رکھتے ہوئے ہدایت کی " میری بھتیجی سے کہو کہ ذرا ہمارے پاس آئے۔"

عمیرہ لنگڑاتی ہوئی گھر کے اندر جانے لگی تو زہرہ نے اس کی بات دہراتے ہوئے بھائی سے پوچھا۔

"کیوں' میگوئل کس لئے؟"

میگوئل کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس کا چہرہ جسے اب ضبط کی بہت عادت ہو چکی تھی۔ ایک دم جذبات سے بھر گیا۔

"تمہیں واقعی معلوم نہیں، بالکل نہیں؟"

زہرہ نے انکار میں سر ہلایا۔ انہوں نے زبیدہ کو آتے ہوئے دیکھا اور میگوئل جو کچھ کہنا چاہتا تھا یا نہیں چاہتا تھا اس کے دل میں ہی رہ گیا۔

"بیٹھ جاؤ بیٹی" میگوئل نے کہا۔ "مجھے تم سے ایک اہم بات کرنی ہے اور بہتر ہے کہ مردوں کی غیر موجودگی میں یہ بات کی جائے۔"

زبیدہ اس کے برابر بیٹھ گئی۔

"آپ نے مجھے پریشان کر دیا۔ چچا میگوئل! میں ہمہ تن گوش ہوں۔"

"میرا خطاب تمہارے ذہن سے ہے۔ یزید کی شطرنج تمہارے گھر میں ایک بہت خطرناک ہتھیار ہے۔ اگر غرناطہ کے آرچ بشپ کو اس کی اطلاع ہو جائے تو وہ کلیسائی عدالت تک یہ بات پہنچا دے گا۔ خاص طور سے اگر یہ اشبیلیہ میں بنائی گئی ہے۔"

"آپ سے کس نے کہا کہ یہ اشبیلیہ میں بنی ہے؟"

"یزید اور ہند نے۔"

زبیدہ اس بات سے بہت متاثر ہوئی کہ اس کے بچوں نے یو آن کو بچانے کی کوشش کی ہے۔ گاؤں میں رہنے کی وجہ سے وہ کچھ لاپروا ہو گئی تھی اور اس کا پہلا ردعمل یہ تھا کہ وہ میگوئل کو سب کچھ صاف صاف بتا دے۔ لیکن تھوڑا سا غور کرنے کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ یزید کی حکمت عملی کو اپنائے۔

"یقیناً انہیں معلوم ہو گا"

"تم بیوقوف ہو زبیدہ۔ یہاں میں اپنے ہی گھر پر جاسوسی کرنے نہیں آیا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم شطرنج کے ان مہروں کو جلا دو۔ اس سے بچہ کی جان جا سکتی ہے۔ اس خوبصورت گاؤں میں گنگناتا ہوا پانی ہمیں لوریاں دے کر سلا دیتا ہے۔ لاپروائی آسان ہے بہت آسان۔ میں سوچتا تھا کہ ہم یہاں ہمیشہ محفوظ رہیں گے۔ میں غلطی پر تھا۔ وہ دنیا جس میں تم نے آنکھ کھولی تھی مر چکی ہے۔ بنی جلد یا بدیر تباہ کن آندھیاں ان پہاڑوں کو روندتی ہوئی اس گھر تک پہنچ جائیں گی۔ بچوں کو باخبر کر دینا چاہئے۔ ان میں تحمل نہیں ہوتا، جو شیلے ہوتے ہیں۔ اس بچے کی آنکھوں میں مجھے اپنی بہت پہلے زمانہ کی بغاوت جھلکتی نظر آتی ہے۔ ہند بہت سمجھ دار لڑکی ہے۔ مجھے احساس ہے کہ تم میرے یو آن سے اس کی شادی پر کیوں تیار نہیں ہو۔ ناراض مت ہوؤ زبیدہ۔ میں بوڑھا ہو گیا ہوں لیکن سٹھیایا نہیں ہوں۔ تمہاری جگہ ہوتا تو میں بھی یہی کرتا۔ میری نیت یہ نہیں کہ میں اپنے بیٹے کی

بہتری کے لئے سوچ رہا ہوں۔ مجھے تمہارے بچوں کے تحفظ کا فکر ہے اور شاید یہ جذباتی بات ہے کہ یو آن خاندان میں ہی شادی کرے"

چونکہ بشپ اسے مکروہ لگتا تھا اس لئے نہ چاہنے کے باوجود بھی وہ اس کی بات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ وہ جانتی تھی کہ بشپ ٹھیک کہتا تھا۔

"آج رات آپ ان سب سے بات کیوں نہیں کرتے چچا میگوئل؟ میری بات کی نسبت اس کا کہیں زیادہ اثر ہو گا۔ پھر ہم یزید کے شطرنج کے بارے میں بھی سوچیں گے۔ بچہ کا دل ٹوٹ جائے گا۔"

"میں خوشی سے آج رات آپ سب سے بات کروں گا کہ یہی میرے یہاں آنے کا مقصد بھی ہے۔"

"میرا خیال تھا تم مجھ سے ملنے آئے ہو۔ مقدس ماب! عیار بڈھے! زہرہ طنزاً" ہنسی۔ ان دونوں کو دیکھ کر زبیدہ کو اپنی ماں کی بات یاد آئی۔ بچپن کی اس یاد پر اسے ہنسی آگئی۔

زہرہ نے اصرار کیا۔ "ہمیں بھی بتاؤ۔ ہنسی کی بات کیا ہے؟"

"نہیں چچی۔ مجبور نہ کریں۔ یہ بہت ہی چھچھوری بات ہے۔"

میگوئل نے زور دے کر کہا "اس کا فیصلہ ہم پر چھوڑ دو۔ کہو۔"

زبیدہ ان کی طرف دیکھ کر پھر ہنسنے لگی۔ اسے یہ سب کچھ بہت احمقانہ لگا۔ لیکن اب اس کے پاس بات بتانے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔

"یزید کی بڑی چچی مقدس ماب کا کچھ ایسا ہی استعمال کرتی تھی مجھے بچپن کے کچھ اشعار یاد آگئے ہیں۔"

"سوئی اور چھلنی میں زبردست جھگڑا تھا۔ سوئی نے کہا: یہ جو رنگین دھاگہ مجھے نظر آرہا ہے۔ یہ کوئی زیور نہیں ہے۔ بلکہ تمہارے سر میں سے گزر رہا ہے۔۔۔"

زبیدہ نے دیکھا کہ ان کی سنجیدگی قہقہے میں بہہ گئی۔

"کیا یہ سوئی تھا؟"

زبیدہ نے ہاں میں سر ہلایا۔

"اور وہ چھلنی تھی؟"

زبیدہ نے پھر سر کو جنبش دی۔ کچھ دیر تک دونوں تحمل سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ پھر دونوں کے اندر سے ہنسی کی ایک لہر اٹھی اور ایک ساتھ ہی ان کے منہ پر آئی۔ جیسے ہی قہقہہ ہلکا پڑا اماں جو انار کے نیچے بیٹھی تھی اپنے چہرے پر آنسوؤں کو محسوس

کرنے لگی۔ آج پہلی مرتبہ اپنی ماں کے انتقال کے بعد میگوئل ہنسا تھا۔

بنو حزیل کے اس آبائی گھر میں آج جتنی اطمنان کی فضا تھی اسی قدر تشویش گاؤں میں اس جمعہ کے دن مسجد پر طاری تھی۔ گو نماز کے دوران کوئی خاص بات نہیں ہوئی تاہم عمر کو یہ بات سخت ناگوار گزری کہ آدھی درجن صفیں سب سے آگے اس کے خاندان کے لئے مخصوص کر دی گئی تھیں۔ یہ سب ان کے احترام میں تھا۔ اگلے وقتوں میں لوگوں کو جہاں جگہ ملتی تھی کھڑے ہو جاتے تھے۔ مذہب خاندانی امتیازات کو نہیں مانتا۔ اللہ کے نزدیک عبادت کے مصلے پر سب برابر تھے۔

ابن فرید کا اصرار تھا کہ پہلی صف اس کے خاندان کے لئے مخصوص ہونی چاہئے۔ چرچ میں عیسائی امرا کے لئے نشستوں کا اہتمام اسے بہت اچھا لگا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ یہ بات اسلام میں ناپسندیدہ سمجھی جاتی ہے۔ پھر بھی وہ مسجد میں شرفا کی حیثیت کا اظہار ضروری سمجھتا تھا۔

عمر خاص طور سے بونے اور دوسرے گھریلو ملازموں کے پیچھے جا کر کھڑا ہو گیا۔ لیکن زہیر اور یزید کو لوگوں نے زبردستی آگے کی طرف بڑھا دیا۔ ابن داؤد بھی انہیں کے ساتھ تھا۔

نماز ختم ہو چکی تھی۔ نیلی آنکھوں والے امام نے جو کہ نیا نیا گاؤں میں آیا تھا جمعہ کے خطبہ کے لئے تیاری شروع کی۔ اس کا پیشرو بہت بڑا عالم تھا اور بحیثیت انسان بھی اس کا بہت احترام تھا۔ غریب کسان کے اس بیٹے نے غرناطہ کے مدرسہ میں تعلیم حاصل کی تھی بہت علم حاصل کیا تھا۔ لیکن وہ اپنی اصل کو بھولا نہیں تھا۔ اس کا جانشین چالیس برس کے قریب قریب تھا۔ اس کے گہرے بھورے رنگ کی داڑھی اس کے سفید عمامہ اور گورے رنگ پر بہت پھبتی تھی۔ خطبہ شروع کرنے سے پہلے وہ کچھ گھبرایا ہوا تھا۔ ابھی غیر مسلم لوگوں کے آکر بیٹھنے کا انتظار ہو رہا تھا۔ گاؤں کی مختصر عیسائی اور یہودی آبادی کو جمعہ کی نماز کے بعد خطبہ میں شامل ہونے کی اجازت تھی۔ یزید یو آن بڑھئی کو مسجد میں دیکھ کر بہت خوش ہوا اور ابن حسد کو بھی۔ ان کے ساتھ ایک بزرگ شخص تھا جس نے گہرے سرخ رنگ کا چوغہ پہنا ہوا تھا۔ یزید حیران تھا کہ یہ کون ہے اور اس نے بھائی کو کہنی ماری۔ زہیر نے واجد الزندیق کو پہچان لیا اور ایک جھرجھری لی لیکن کہا کچھ نہیں۔

یکلخت یزید کی تیوری پر بل آ گئے۔ عبداللہ جو الحزیل کا مہتمم تھا اور اس کی بڑی ہیبت تھی۔ سرک کر زہیر کے بالکل پیچھے آ گیا۔ اماں نے اس کی بدچلنی اور بے ایمانیوں کے اتنے

قصے سنائے ہوئے تھے کہ بچہ کے دل میں اس کی طرف سے سخت نفرت بیٹھ گئی تھی۔ زہیر سے مصافحہ کرتے ہوئے مہتمم مسکرایا۔ یزید نے غصہ سے گھورا۔ وہ یو آن کو یہ بتانے کے لئے بیتاب تھا کہ بڑے چچا میگوئل شطرنج کے بارے میں پوچھ رہے تھے لیکن زہیر نے زور سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا کہ وہ زیادہ ہل جل نہ کرے۔

"سلیقہ کے ساتھ بیٹھو اور یہ نہ بھولو کہ لوگ ہمیں دیکھ رہے ہیں" اس نے غصہ سے یزید کے کان میں کہا۔

"بنو حزیل کی عزت کا معاملہ ہے۔ کل ہو سکتا ہے کہ جنگ میں ہمیں ان لوگوں کی قیادت کرنی پڑے۔ ان کی نظروں میں ہماری عزت کم نہیں ہونی چاہئے۔"

"بکواس"! یزید زیر لب بڑبڑایا۔ لیکن پیشتر اس کے کہ زہیر کوئی جواب دیتا مولوی نے کھنکار کر اپنا گلہ صاف کیا اور خطبہ شروع کر دیا۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ السلام علیکم۔ برادران..."

وہ اندلس اور اس کے مسلمان حکمرانوں کی عظمت کے گن گانے لگا۔ وہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ مغرب کا اسلام ہی سچا اسلام تھا۔ قرطبہ کے اموی خلیفہ اور اس کے جانشینوں نے رسولؐ اور ان کے صحابہ کی پیروی کرتے ہوئے دین کی حفاظت کی تھی۔ بغداد کے عباسی اخلاقی طور پر بہت پست ہو گئے تھے۔

جب سے اس نے جمعہ کی نماز میں شریک ہونا شروع کیا تھا یزید ایسی باتیں سنتا رہا تھا۔ سارے واعظ اسے اماں کی طرح لگتے فرق صرف یہ تھا کہ وہ اماں کو کوئی سوال کر کے روک سکتا تھا یا اس کی بلند بانگ باتوں کا رخ بدل سکتا تھا۔ مسجد میں ایسا ممکن نہ تھا تنہا یزید ہی واعظ کی باتوں سے بددل نہیں تھا مسجد میں پیچھے بیٹھے ہوئے پرانے نمازی بھی سرگوشیاں کرنے لگے تھے۔ ایسے مجمع میں جہاں متبدیوں یا نووردوں کا کوئی لحاظ نہیں کیا جاتا تھا اس نوجوان واعظ کی حالت قابل رحم تھی۔ عمر ابن عبداللہ نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر گڑ بڑ پھیلانے والوں کو گھورا۔ سب خاموش ہو گئے۔ اس سے بھوری داڑھی والے مولوی کی ہمت بڑھی اور وہ کھل پڑا۔ اس میں ایک نیا جوش پیدا ہوا جس کی وجہ سے وہ بڑی محنت سے تیار کی ہوئی تقریر کو چھوڑ کر اور رات بھر رٹی ہوئی قرآنی آیات کو بھول کر اپنے دل کی بات کہنے لگا۔

"دور سے ہمیں گرجو ں کی گھمبیر گھنٹیوں کی آوازیں آ رہی ہیں جن کی آواز اتنی دہشتناک ہے کہ اس نے میرے اندر ہلچل مچا دی ہے۔ انہوں ے پہلے ہی ہمارے کفن تیار

کر لئے ہیں اور اسی وجہ سے میرے دل پر بہت بوجھ ہے۔ میری روح مضمحل ہو گئی ہے اور میرا ذہن مستقل پریشان رہتا ہے۔ ابھی غرناطہ کو فتح کئے ہوئے انہیں صرف آٹھ برس ہوئے ہیں لیکن کتنے مسلمان ابھی سے سکتے میں آ گئے ہیں' مر گئے ہیں۔ کیا قیامت آ گئی ہے؟ ہمارے شاندار ماضی کی سب باتیں ٹھیک ہیں۔ لیکن آج ہمیں ان کا کیا فائدہ ہے؟ یہ کیسے ہوا کہ وہ جزیرہ نما جو ہمارے ہاتھ میں تھا یوں ہاتھ سے نکل گیا ہے۔

"اکثر میں نے بزرگوں کو کہتے سنا ہے کہ رسولؐ پر اس سے بھی سخت وقت آئے لیکن انہوں نے ان پر فتح پائی۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ لیکن اس وقت ان کے دشمنوں کو ان کے پیغام کی حقیقت کا اندازہ نہیں تھا۔ ہمیں اس بات کی سزا مل رہی ہے کہ ہمارا مذہب آفاقی ہے۔ عیسائی بادشاہ تنہا ہم سے خوفزدہ نہیں۔ لیکن جب وہ یہ سنتے ہیں کہ سلطان ترکی ہماری مدد کے لئے بیڑہ بھیجنے کے متعلق سوچ رہا ہے تو وہ کانپنے لگتے ہیں۔ یہی خطرہ کی بات ہے اور بھائیو! میرے خدشے بدترین ہیں۔ زمینیس اپنے مشیروں سے کہتا ہے کہ ہمیں شکست دینے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ ہر چیز کو تباہ کر دیا جائے...."

اس کے ایک ایک لفظ کو خاموشی سے سنا گیا۔ یہاں تک کہ یزید بھی جو ایسے اعترافات کے سخت خلاف تھا۔ واعظ کے خلوص سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ لگتا تھا کہ وہ دل سے بول رہا ہے۔ البتہ اس کا بھائی اتنا متاثر نہیں ہوا۔ زہیر ان مایوسی کی باتوں سے جھلا رہا تھا۔ کیا اس شخص کے پاس اس مسئلہ کا کوئی حل بھی تھا یا وہ صرف لوگوں کی ہمتیں توڑ رہا تھا؟

"مجھے اپنے ماضی کا خیال آتا ہے۔ ہمارے جھنڈے ہوا میں لہرا رہے تھے۔ ہمارے امرا (نائٹ) جنگ پر جانے کے لئے تیار تھے۔ مجھے اپنے امرا (نائٹس) کی بہادریوں کے قصے یاد آ رہے ہیں۔ جیسے ابن فرید مرحوم دشمنوں کو للکارتے ہوئے اور ایک ہی حملہ میں سب کا خاتمہ کرتے ہوئے۔ میں ان تمام باتوں کو یاد کرتا ہوں اور خدا سے مدد کی دعا کرتا ہوں۔ اگر مجھے یقین ہو کہ سلطان ترکی جہاز اور سپاہی بھیج رہا ہے تو میں اس جسم کا ایک ایک انچ اپنے مستقبل کے لئے قربان کرنے کو تیار ہوں لیکن میرے بھائیو! مجھے ڈر ہے کہ یہ سب کھوکھلی امیدیں ہیں۔ ہمارے پاس صرف ایک ہی حل ہے۔ اللہ پر بھروسہ!"

زہیر کو غصہ آ رہا تھا۔ بغیر کسی پیغام کے یوں خطبہ کو ختم کرنا اچھے حالات میں بھی کچھ اتنا مناسب نہیں تھا اور موجودہ حالات میں تو یہ ایک مذہبی فریضہ سے روگردانی تھی جس کی کوئی مثال نہیں تھی۔ شاید وہ سوچنے کے لئے کچھ دیر رکا تھا۔ نہیں اس نے واعظ ختم کر

دیا تھا۔ وہ پہلی صف میں یزید سے ذرا دور بیٹھ گیا۔

عموما "خطبہ کے بعد مجمع اٹھ جاتا تھا لیکن آج تو لگتا تھا جیسے اسے سکتہ ہو گیا ہے۔ کوئی اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔ نہ معلوم کب تک وہ اسی طرح خاموش اور سہمے ہوئے بیٹھے رہے۔ لیکن عمر بن عبداللہ نے محسوس کیا کہ کچھ کرنا چاہئے۔ چنانچہ وہ اٹھا اور کسی چٹان پر کھڑے ہوئے ایک تنہا نگران کی طرح اس نے اپنے گردو پیش کا جائزہ لیا۔ کوئی اس کے پیچھے نہیں آیا۔ بلکہ سب نے ایک ساتھ جیسے یہ کوئی پہلے سے سوچی ہوئی بات ہو اس کے لئے راستہ بنا دیا۔ آہستہ آہستہ وہ راہداری میں چلتا رہا۔ جب وہ سامنے پہنچا تو مڑا اور ان سے مخاطب ہوا۔ یزید نے اپنے باپ کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں فخر اور کسی متوقع فیصلہ کے خیال سے چمک اٹھیں۔ زہیر کے چہرے پر بظاہر کوئی تاثر نہیں تھا لیکن اس کا دل تیز تیز دھڑک رہا تھا۔

ایک لمحہ عمر بن عبداللہ اپنے خیالات میں گم رہا۔ اسے احساس تھا کہ ایسی صورت میں جب مصیبت سر پر کھڑی ہو تو ایک ایک حرف ایک ایک فقرہ بے انتہا اہم ہو جاتا ہے۔ اس لئے ہر بات کو اچھی طرح تولنا پھٹکنا ضروری ہے اور لہجہ کو لفظوں کے مطابق بنانا ہے۔ خطابت کے اپنے اصول ہیں اور اس کا اپنا ایک سحر ہے۔ یہ شخص جو آبائی جاگیر کے پر سکون ماحول میں پلا تھا جو سنگتروں کے عرق سے معطر پانی میں غسل کرتا تھا' جس کے ہر طرف پہاڑی خوشبوئیں بکھری رہتی تھیں' جس نے بچپن ہی سے مردوں اور عورتوں کی زندگیوں پر حکومت کرنی سیکھی تھی' وہ جانتا تھا کہ لوگ اس سے کیا توقع رکھتے ہیں۔ اس کے ذہن پر یادوں کی یلغار تھی۔ لیکن ان میں کوئی ایک بات بھی ایسی نہیں تھی جو اس کے سامنے بیٹھے ہوئے لوگوں کو کسی طرح کی کوئی تسلی دے سکے۔

عمر نے بولنا شروع کیا۔ اس نے غرناطہ میں عیسائیوں کے تسلط کے دوران ہونے والے واقعات دہرائے۔ بڑی تفصیل کے ساتھ آگ کی دیوار کا نقشہ کھینچا۔ بولتے بولتے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور مجمع بھی اس کے دکھ میں شریک ہو گیا۔ اس نے بتایا کہ کس طرح ہر مسلمان گھرانے پر خوف کے سائے منڈلا رہے ہیں' کس طرح بے یقینی کی تاریک فضا سارے شہر پر چھائی ہوئی ہے۔ اس نے بتایا کہ کتوں کے بھونکنے سے بادل نہیں چھٹتے۔ اس نے کہا کہ اندلس کے مسلمان ایک ایسی ندی کی طرح تھے جس کا عیسائی عدالت رخ بدل رہی تھی۔

عمر ایک گھنٹے تک بولتا رہا اور وہ اس کے ایک ایک لفظ کو غور سے سنتے رہے۔ وہ کسی

حساب سے بھی کوئی مقرر نہیں تھا۔ اس کی دھیمی آواز اور اس کا متکبرانہ لہجہ اس شور و غل سے بہت مختلف تھا' جو اکثر واعظوں کی گھن گرج میں ہوتا ہے اور جو تلاوت بھی بڑے بناوٹی انداز میں کرتے ہیں۔ اس طرح نہ صرف چند منٹ میں ہی ان کے سامعین اکتا جاتے ہیں بلکہ یزید اور ان کے دوستوں کو ان پر ہنسنے کا موقع بھی مل جاتا ہے۔

عمر کو احساس تھا کہ وہ زیادہ دیر تک تباہیوں کی داستانیں بیان نہیں کر سکتا۔ اسے کوئی لائحہ عمل دینا تھا۔ گاؤں میں اپنی امتیازی حیثیت کے سبب یہ اس کا فرض تھا ۔ لیکن وہ رک رہا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ عمر ابن عبداللہ ابھی طے نہیں کر سکا تھا کہ اسے کون سا راستہ اختیار کرنا چاہئے۔ وہ رکا اور اس کی آنکھوں نے اس مجمع میں بزرگوں کو تلاش کرنا شروع کیا۔ ادھر سے اسے کوئی امید نظر نہیں آئی چنانچہ عمر نے فیصلہ کیا کہ سچ سچ بات کرنے میں ہی بہتری ہے اور وہ انہیں اپنے خدشات سے آگاہ کرے گا۔

"بھائیو! میں ایک اعتراف کرنا چاہتا ہوں۔ میں مشیئت ایزدی سے تو براہ راست رابطہ نہیں کر سکتا ۔ تمہاری طرح مجھے بھی کوئی راستہ نہیں سوجھتا۔ اس لئے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہمارے مسائل کا کوئی آسان حل نہیں ہے۔ ہمارے ایک عظیم مفکر استاد ابن خلدون نے بہت پہلے ہمیں آگاہ کیا تھا کہ جو قوم شکست کھا جائے اور غلام ہو جائے وہ زیادہ دیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ قرطبہ اور اشبیلیہ کی شکستوں سے بھی ہم نے کوئی سبق نہیں سیکھا تیسری بار وہی غلطی کرنے کا کوئی جواز نہیں۔ ہم میں سے جو لوگ سلطان کے سائے میں پناہ ڈھونڈتے تھے وہ احمق تھے۔ اس لئے کہ یہ سہارا جلد ہی ٹوٹ گیا۔

"اس الجھن سے نکلنے کے تین راستے ہیں۔ پہلا تو وہ راستہ ہے جو ہمارے بھائیوں نے دوسری جگہوں میں اختیار کیا۔ خود کو یہ تسلی دینا کہ ایک عقلمند دشمن جاہل دوست سے بہتر ہے اور ان کا مذہب اختیار کر لینا لیکن دلوں میں اپنے عقیدہ پر قائم رہنا۔ اس حل کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟"

چند لمحوں کے لئے سب پر سکتہ چھا گیا۔ یہ بڑا خطرناک کافرانہ خیال تھا اور گاؤں غرناطہ سے بلکہ پورے جزیرہ نما سے اس قدر کٹا ہوا تھا کہ وہ اس کی بات کو سمجھ نہ سکے۔ جلد ہی وہ اپنے حواس میں لوٹ آئے اور زمین سے ایک بے ساختہ نعرہ بلند ہوا جو آسمان سے ٹکرا گیا:

لااللہ الاالہ محمد رسول اللہ

عمر کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ اس نے ان کے ساتھ سر ہلایا اور پھر بولنا شروع کیا:

"میں جانتا تھا آپ کا یہی جواب ہو گا۔ لیکن میں آگاہ کر دینا چاہتا ہوں کہ عیسائی حکمران ہمیں زیادہ دیر تک آزادی کے ساتھ عبادت نہیں کرنے دیں گے۔ پھر بھی فیصلہ آپ کے ہاتھ ہے۔

"دوسری ممکن صورت یہ ہے کہ ہم مدافعت کریں اور آخری دم تک مقابلہ کریں۔ موت تک۔ آپ کی موت میری موت سب کی موت اور ماؤں' بہنوں' بیویوں اور بیٹیوں کی بے حرمتی۔ یہ ایک باعزت فیصلہ ہے لیکن اگر آپ اسی پر متفق ہیں تو میں آپکے ساتھ ہوں۔ لیکن میں بے ٹوک بات کروں گا۔ جنگ سے پہلے میں اپنی عورتوں اور بچوں کو کسی محفوظ جگہ بھیج دوں گا اور تمہیں بھی یہی مشورہ دوں گا۔ اس معاملہ میں آپ کی کیا رائے ہے؟ آپ میں سے کتنے لوگ لڑتے ہوئے مرنے کو تیار ہیں؟"

ایک مرتبہ پھر خاموشی چھا گئی لیکن اس میں اب کوئی جھلاہٹ نہیں تھی۔ بزرگوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر مجمع میں کہیں سے پانچ نوجوان اٹھے۔ پہلی صف میں سے زہیر الفحل تیزی سے اٹھا۔ چھوٹے مالک کے اس مقصد پر جان قربان کر دینے کے عزم نے مجمع میں ایک ہلکی سی سنسنی سی دوڑا دی۔ اور بہت سے نوجوان بھی اٹھے۔ لیکن ابن داؤد نہیں اٹھا۔ وہ ہند کے متعلق سوچنے لگا جس کا قہقہہ اس کے دماغ میں گونج رہا تھا۔ یزید کبھی اپنے باپ کی طرف دیکھتا کبھی بھائی کی طرف۔ چند لمحے وہ اسی کرب میں مبتلا رہا اور پھر اٹھ کر اس نے زور سے زہیر کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس جذبہ نے سب کو متاثر کیا لیکن اٹھ کر کھڑے ہونے والے تھوڑے ہی تھے۔ عمر کو بہت تسلی ہوئی۔ وہ خود کشی کے حق میں نہیں تھا۔ اس نے اپنے بیٹوں کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ جس کے بعد سب بیٹھ گئے۔ عمر نے گلا صاف کیا۔

"آخری صورت یہ ہے کہ ہم اس ملک کو چھوڑ دیں یہاں اپنے وہ گھر چھوڑ دیں جو ہمارے آباؤ اجداد نے اس وقت تعمیر کئے تھے جب یہاں کچھ نہیں تھا صرف چٹانیں تھیں اور ان پر جمی ہوئی مٹی۔ انہوں نے زمین کو صاف کیا انہوں نے پانی تلاش کیا اور بیج ڈالے۔ زمین سے اچھی فصلیں اٹھائیں۔ میرا دل کہتا ہے کہ یہ سب سے مشکل فیصلہ ہے لیکن میرا دماغ کہتا ہے کہ ہماری بقا اسی طرح ممکن ہے۔ ہو سکتا ہے ایسا نہ کرنا پڑے۔ لیکن ہمیں الحزیل کو چھوڑنے کے لئے تیار رہنا چاہئے۔"

ایک گھٹی ہوئی سی چیخ نے عمر کو روک دیا۔

"اور جائیں کہاں؟ کہاں؟ کہاں؟"

عمر نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

"ایک ایک قدم بڑھنا زیادہ محفوظ ہو گا- میرے پاس ابھی آپ کے سوالوں کے جواب نہیں ہیں- میں صرف یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ اپنے ایمان پر قائم رہنے کی قیمت ہمیں اپنی جانوں سے ادا کرنی ہو گی- ہمارے سامنے سوال یہ ہے کہ کیا یہاں کافروں کی طرح رہیں یا ایسی کوئی جگہ تلاش کریں جہاں ہم بے فکری سے اللہ کی عبادت کر سکیں- مجھے اب اور کچھ نہیں کہنا لیکن اگر آپ میں سے کوئی بولنا اور کوئی زیادہ قابل قبول تجویز پیش کرنا چاہے تو اس کے لئے یہی موقع ہے- جب تک بولنے کی آزادی ہے بولیں-

ان الفاظ کے ساتھ عمر یزید کے برابر آ کر بیٹھ گیا- اس نے اپنے بیٹے کو گلے لگایا اور اس کی پیشانی کو چوما یزید نے باپ کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا اور اسے اس طرح پکڑے رکھا جس طرح کوئی ڈوبتا ہوا شخص کسی تیرتی ہوئی چیز کو پکڑ لے-

عمر کی باتوں کا بہت اثر ہوا- کچھ دیر تک کوئی نہیں بولا- پھر ابن زیدون جو خود کو واجد الزندیق کہتا تھا اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا اور بولنے کی اجازت چاہی- عمر نے پیچھے منہ کیا اور زور سے سر ہلایا- وہاں موجود معمر لوگوں کے ماتھوں پر بل آ گئے اور وہ اپنی داڑھیوں پر ہاتھ پھیرنے لگے- انہیں معلوم تھا کہ ابن زیدون ایمان سے بھٹکا ہوا ہے اور اس نے بہت سے نوجوان ذہنوں میں زہر بھر دیا ہے- لیکن انہوں نے سوچا کہ یہ ایک بہت ہنگامی صورت حال ہے اور بے دینوں کو بھی بات کرنے کا حق ہے- زہیر الفحل کی جانی پہچانی آواز غصہ سے کانپ رہی تھی-

"میں بیس برس سے آپ کو یہ بتانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ احتیاطی تدابیر ضروری ہیں- آنکھیں بند کر کے محض ایمان پر بھروسہ کر کے بیٹھ جانا کافی نہیں- آپ سمجھتے تھے کہ سلاطین قیامت تک حکومت کرتے رہیں گے- میں آپ کو آگاہ کرتا رہا ہوں کہ جو بھی سلطان کے گرم گرم کھانوں پر پڑا رہتا ہے بالاخر اپنے ہونٹ جلا لیتا ہے- آپ نے میرا مذاق اڑایا- مجھے بے دین کہا' کافر کہا' پاگل کہا-

"اور اب بہت دیر ہو چکی ہے- تمام کنوؤں میں زہر ڈال دیا گیا ہے- پورے ملک میں کہیں صاف پانی نہیں ہے- پچھلے ایک گھنٹہ سے عمر بن عبداللہ آپ کو یہی بتانے کی کوشش کر رہے ہیں- مستقبل کی طرف دیکھنے کے بجائے ہم مسلمان ہمیشہ ماضی کی طرف لوٹتے ہیں- ابھی ہم اس زمانہ کے قصیدے پڑھ رہے ہیں جب پہلے پہل ان وادیوں میں ہمارے خیمے نصب ہوئے تھے- جب ہم بے جگری سے اپنے ایمان کے دفاع کے لئے متحد ہو گئے تھے- جب ہمارے سفید پرچم میدان جنگ سے لوٹتے تو ان کے رنگ بدل چکے ہوتے- وہ

دشمن کے خون میں رنگ جاتے- اور صرف اس ایک گاؤں میں ہم نے اپنی فتوحات کے جشن منانے کے لئے کتنے ہی جام لنڈھائے ہیں-

"ستر برس کے بعد اب میں زندگی سے بیزار ہوں- جب موت بھٹکتی ہوئی میری سمت بڑھے گی تو میں اندھے اونٹ کی طرح اس کے راستہ سے نہیں ہٹوں گا- بہتر ہے کہ آدمی اپنے پورے ہوش وحواس میں مرے' بجائے اس کے کہ مرنے سے پہلے ہی اس کا دماغ ماؤف ہو جائے اور جو بات ایک فرد کے لئے صحیح ہے وہ ایک قوم کے لئے بھی صحیح ہے...."

"بوڑھے بابا"! زہیر نے ایک اذیتناک چیخ ماری- "تم یہ کیسے سمجھتے ہو کہ ہم مرنے کے لئے تیار ہیں؟"

"زہیر بن عمر" بوڑھے نے نپی تلی آواز میں جواب دیا- "میں اشاروں میں بات کر رہا تھا- تمہارے اور تمہارے بچوں- اور تمہارے بچوں کے بچوں کے لئے ان علاقوں میں جن پر کاسٹیلین حکمرانوں نے قبضہ کر لیا ہے اب بقا کی ایک ہی صورت ہے کہ تم اس بات کو تسلیم کر لو کہ یہاں تمہارے آباؤاجداد کے مذہب کے آخری دن آ گئے ہیں- ہمارے تابوت پہلے ہی تیار کئے جا چکے ہیں-"

اس بات پر اہل ایمان بھڑک اٹھے- کچھ چہرے غصہ سے بھرے ہوئے تھے اور انہوں نے ایک زبردست نعرہ بے دین کے منہ پر مارا

لاالہ اللہ محمد الرسول اللہ

"ہاں"- بوڑھا بولا- "صدیوں سے ہم یہی کلمہ پڑھتے آ رہے ہیں- لیکن ازابیلا اور اس کا پادری وہ ہمارے حق میں نہیں ہیں- اگر تم اس کا ورد کرتے رہے تو عیسائی اپنے تیز اور سخت نیزوں سے تمہارے دل چیر دیں گے-"

"الزندیق" ابن حسد مسجد کے پیچھے سے چلایا- "شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو- لیکن اس گاؤں میں ہم پانچ سو برس سے امن کے ساتھ رہ رہے ہیں- عیسائی بھی ان ہی حماموں میں نہاتے رہے ہیں جہاں مسلمان اور یہودی نہاتے ہیں- ہو سکتا ہے کہ اگر ہم انہیں کچھ نہ کہیں تو یہ کاسٹیلین بھی ہمیں کچھ نہیں کہیں گے-"

"ایسا ممکن نہیں ہے- میرے دوست" اس دانا نے کہا- "جو چیز جگر کے لے اچھی ہوتی ہے وہ تلی کے لئے اچھی نہیں ہوتی- ان کے آرچ بشپ کی دلیل یہ ہو گی کہ اگر ایک بھی بچ گیا تو سب کی ہمتیں بڑھیں گی- پھر بھی اگر ہمیں اپنی جاگیروں پر اسی طرح رہنے دیا

گیا تو کبھی نہ کبھی جب کسی اور ملکہ یا بادشاہ کی حکومت ہو گی تو ہو سکتا ہے کہ وہ حضرت محمدؐ اور حضرت موسیٰؑ کے ماننے والوں پر پابندیاں نرم کر دیں۔ وہ ہمارا کچھ بھی باقی نہیں چھوڑیں گے۔ بس میں یہی کہنا چاہتا ہوں۔ آپ کا شکریہ! عمر بن عبداللہ' کہ آپ نے مجھے اپنی بات کہنے کا موقع دیا۔"

جب زندیق باہر جانے لگا تو عمر نے یزید کو اپنی گود میں بٹھا کر اسے اپنے پاس آنے کو کہا۔ جب وہ اس کے برابر جائے نماز پر بیٹھ گیا تو عمر نے اس کے کان میں کہا' آج رات کھانا ہمارے ساتھ کھاؤ۔ ابن زیدون یہ میری پھوپھی کی خواہش ہے۔"

زندیق حیرت میں رہ گیا۔ لیکن اس نے اپنے جذبات پر قابو رکھتے ہوئے سر ہلایا۔ عمر ایک بار پھر کھڑا ہوا۔

اگر کسی اور کو کچھ نہیں کہنا تو پھر محفل برخواست ہوتی ہے۔ لیکن یاد رکھیں فیصلہ آپ ہی کو کرنا ہے۔ آپ آزاد ہیں جیسے چاہیں کریں۔ میں جیسے بھی ہو گا آپ کی مدد کروں گا۔ السلام علیکم"

"وعلیکم السلام۔" سب نے ایک ساتھ جواب دیا۔

اب نوجوان واعظ اٹھا اور اس نے قرآن کی ایک سورۃ کی تلاوت کی جسے وہاں موجود عیسائیوں اور یہودیوں نے بھی سب کے ساتھ دہرایا۔ سوائے زندیق کے سب نے:

"کہہ دو اے کافرو! جن کو تم پوجتے ہو میں نہیں پوجتا اور جس کی میں عبادت کرتا ہوں اس کی تم عبادت نہیں کرتے اور جن کی تم پرستش کرتے ہو ان کی میں پرستش کرنے والا نہیں اور نہ تم اس کی بندگی کرنے والے معلوم ہوتے ہو۔ جس کی میں بندگی کرتا ہوں تم اپنے دین پر میں اپنے دین پر"

جیسے ہی مجلس برخاست ہوئی زندیق نے کچھ کفر بکا جو ابن داؤد نے سن لیا اور مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ "مرتد کی سزا موت ہے"

"ہاں"۔ زندیق نے جوان کی سبز آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "لیکن آج کوئی قاضی ایسا فتویٰ نہیں دے سکتا۔ کیا تم ہی ہو جو خود کو ابن خلدون کا پوتا کہتے ہو؟"

"ہاں۔ میں ہی ہوں" ابن داؤد نے مسجد سے نکلتے ہوئے جواب دیا۔

"تعجب ہے"۔ زندیق نے سوچا "اس کا کنبہ تو طوفان کی نذر ہو گیا تھا۔"

"بعد میں وہ دوسری کے ساتھ رہتا تھا۔ میری دادی کے ساتھ"

"دلچسپ بات ہے۔ آج رات اس پر گفتگو ہو جائے۔ کھانے کے بعد؟"

زہیر نے مجھے بتایا ہے کہ تم نے ان کی کتابیں پڑھی ہیں اور بہت کچھ اور بھی۔ میں تم سے الجھنا نہیں چاہتا اور نہ تمہاری علمیت سے مقابلہ کرنا چاہتا ہوں۔ میں تو ابھی خود علم حاصل کر رہا ہوں"

ابن داؤد نے سلام کیا اور تیزی سے اس جگہ کی طرف چلا جہاں گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔ وہ اپنے میزبان کو انتظار میں رکھنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن جب وہ پہنچا تو وہاں صرف زہیر اور یزید تھے۔ چھوٹا لڑکا مسکرا رہا تھا۔ زہیر کے چہرے پر خود فراموشی کے آثار تھے اور اس نے غصہ سے ابن داؤد کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے نئے دوست سے ناراض تھا۔ غرناطہ میں حمام کے اندر ابن داؤد نے مسلح مدافعت کی بات کر کے اس میں جوش پیدا کیا تھا۔ کیا وہ ہوا کے رخ پر چل پڑا تھا۔ زہیر نے قاہرہ کے اس نوجوان کی طرف لاتعلقی کے سے انداز میں دیکھا۔ وہ صاحب ایمان تھا بھی کہ نہیں۔

"آپ کے والد بزرگوار کہاں ہیں؟" اجنبی نے کسی قدر گھبراہٹ سے پوچھا۔

"اپنے کام میں مصروف ہیں" زہیر نے چلتا سا جواب دیا۔

عمر کو گاؤں کے بزرگوں نے گھیر لیا تھا۔ وہ مستقبل کے بارے میں تفصیل سے گفتگو کرنا چاہتے تھے اور رازداری کے خیال سے گھر کے اندر گفتگو کرنا چاہتے تھے۔ اسی لئے وہ ابن حسد کے گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ موچی نے باداموں کے کیک اور کافی سے ان کا استقبال کیا۔

زہیر مسجد کے واقعات سے سخت پریشان تھا۔ اسے اپنے آپ پر غصہ آ رہا تھا۔ پہلی دفعہ اسے احساس ہوا تھا کہ حالات کس قدر سنگین تھے اور کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔ اب اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ غرناطہ میں کسی بغاوت کی کامیابی کی کوئی صورت نہیں۔ اسے مسجد کے اندر مایوس اور لٹکے ہوئے چہرے دیکھ اتنا کچھ معلوم ہو گیا تھا جتنا کہ میگوئل یا حشام کی باتوں سے بھی ظاہر نہیں ہوا تھا.... تاہم ہر بات منظم طریقہ سے ہو رہی تھی۔ اب وقت گزر چکا تھا۔

زہیر کو جیسے یاد ہی نہیں رہا تھا کہ مہمان بھی اس کے ہمرکاب ہے۔ اس نے گھوڑے کو ہلکی سی ایڑھ لگائی اور وہ تیزی سے دوڑنے لگا جس پر یزید کو بہت حیرانی ہوئی۔ پہلے اسے خیال ہوا کہ شاید اس کا بھائی گھر تک اس کے ساتھ دوڑ لگانا چاہتا ہے۔

"الفحل۔ الفحل۔ رکو" اس نے دانت نکالے۔ اور وہ اس کے پیچھے دوڑنے ہی کو تھا کہ ابن داؤد نے اسے روک دیا۔

"میں تمہارے بھائی کی طرح سواری نہیں کر سکتا۔ اور مجھے رہنمائی کی ضرورت ہے"
یزید نے لمبی سانس لی اور گھوڑے کی لگام کھینچی وہ سمجھ گیا کہ زہیر تنہائی چاہتا ہے۔ غالبًا وہ ان جوانوں سے ملنے جا رہا تھا جو لڑنا چاہتے تھے۔ یزید نے اپنے بھائی کی جگہ لے لی۔ ورنہ ابن داؤد سمجھتا کہ جان بوجھ کر اس کی تذلیل کی جا رہی ہے۔

"بہتر ہے میں آپ کے ساتھ گھر جاؤں۔ اگر آپ گم ہو گئے تو ہند مجھے کبھی معاف نہیں کرے گی۔

"تمہاری بہن۔ ہند؟"------ "ہاں۔ وہ تمہیں چاہتی ہے۔"

باب 7

ہمارے خدا یسوع مسیح کے نام سے:

اعلیٰ حضرت عظیم عیسائی اور مرد میدان شاہ اور ملکہ سپین:

محمدؐ کے ماننے والوں کے آخری قلعہ کو مقدس باپ کے نام پر فتح کئے ہوئے اور الحمرا سے ہلال کو اتارے ہوئے آٹھ برس مکمل ہو چکے ہیں۔ اعلیٰ حضرت نے مجھے حکم دیا تھا کہ میں ان شرائط کا احترام کروں جو آپ کے اور مفتوح سلطان کے درمیان فتح کے موقع پر طے پائی تھیں۔ ملکہ معظمہ کو یاد ہو گا کہ انہوں نے اپنے نہایت ہی تابعدار خدمت گذار خادم کو یہ ہدائت فرمائی تھی۔ "ہمارے سب سے زیادہ قابل اعتماد بشپ کی حیثیت سے آپ کی حیثیت صرف چرچ کے خادم کی نہیں ہے بلکہ غرناطہ میں آپ ہماری اور بادشاہ کی آنکھ اور کان سمجھے جاتے ہیں آپ کے ہر عمل میں یہ امر مدنظر رہے کہ آپ کوئی ایسا اقدام نہیں کریں گے جس سے ہمارے نام پر حرف آئے۔" اس سے میں نے سمجھا کہ آپ چاہتی ہیں کہ جھوٹے نبی کے ماننے والوں کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کیا جائے اور انہیں اپنے طریقہ پر عبادت کرنے کی اجازت دی جائے۔ میں نے کبھی آپ کو ایک غلطی کے متعلق نہیں بتایا۔ میں سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں نے میرے پیشروؤں کی نرمی کو غلط معنی دیئے۔ انہوں نے ہمارا مذہب اختیار کرنے کی کوئی خواہش ظاہر نہیں کی۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے فیصلہ کیا کہ ان پر واضح کر دیا جائے کہ اب بے دینی اور باطل پرستی کے دن گزر گئے۔ ملکہ معظمہ کو ٹولیڈو میں ہماری گفتگو مد نظر ہو گی۔ جہاں میں نے قرآن کی اصلیت واضح کی تھی۔ میں نے اس بات پر زور دیا تھا کہ اس مذہب کی کتب اور رسومات و توہمات ایک اتھاہ سمندر کی طرح ہیں۔ ہر گھر میں ایک ایک کمرے کو وہ اپنے نبیؐ کے احکامات سے شعروں کی صورت

میں مزین کرتے ہیں۔ جنابہ عالیہ یہ آپ ہی تھیں کہ جنھوں نے اس بات پر زور دیا تھا کہ ایسی شر انگیز کتابیں اور زہر آلود نظریئے آگ کی نذر کر دینے چاہئیں میں نہیں سمجھتا کہ غرناطہ میں کوئی اور شخص اس طرح قرآن اور اس سے متعلقہ کتب کے برسرعام جلائے جانے کا اس طرح انتظام کر سکتا تھا۔

میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ اعلیٰ حضرات اور مقدس چرچ نے جو کام میرے سپرد کیا تھا اس کے لئے میرا ہونا ناگزیر تھا۔ ایک فرد واحد کس طرح ہمارے چرچ کے لئے یوں لازمی ہو سکتا ہے؟ تاہم میں نے عہد کیا۔ جب میں ٹولیڈو کا آرچ بشپ مقرر ہوا تو میں نے قسم کھائی کہ میں محمدؐ کے ہر ماننے والے کو حضرت عیسیٰ کے مذہب پر لے آؤں گا۔ میں درخواست کرتا ہوں کہ اس عہد کو پورا کرنے میں آپ میری اعانت فرمائیں اور مجھے اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے تمام ضروری اختیارات دیئے جائیں۔

ٹنڈیلا کا لائق احترام امیر کیپٹن جنرل' جس کے خاندان نے کارڈینل مینڈوزا جیسے عظیم انسان پیدا کئے۔ میرا پیشرو' اس بات پر مصر ہے کہ اب جب آپ کو فتح حاصل ہو گئی ہے تو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مسلمان ہماری زبان ثقافت اور مذہب کو اختیار کر لیں گے۔ جب میں نے اسے بتایا کہ تین مسلمان عورتوں کو چرچ میں سے ہٹائی ہوئی صلیبوں پر پیشاب کرتے ہوئے دیکھا گیا ہے تو اس نے جواب دیا۔ "آپ ان سے اور کیا توقع رکھتے ہیں آرچ بشپ؟ آپ نے بھی تو ان کی کتابیں جلوائی ہیں۔ یہ ان کا انتقام ہے۔ یہ بڑی توہین آمیز حرکت ہے۔ لیکن یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ بیچ بازار میں آپ کو خسی کر دیں۔"

خود ہمارے اپنے درمیان ایسے رویے سننے میں آتے ہیں۔ امیر کے دربار میں عیسائی ضرور ہیں۔ لیکن وہاں موجود لوگ کھلے عام ہمارے چرچ کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اس پر بدعنوانی کا الزام لگاتے ہیں۔ ہنستے ہیں کہ بہت سے پادری گناہ کی زندگی گزار رہے ہیں۔ وہ بچے پیدا کرتے ہیں اور انہیں اپنی جگہ چرچ میں متعین کر دیتے ہیں۔ خود ڈون پیڈرو گونزالیز ڈی مینڈوزا نے بستر مرگ پر حضور والا کو یہ مشورہ دیا تھا کہ مجھے اس کی جگہ مقرر کیا جائے۔ اس شخص نے جس نے آپ کے تخت نشین ہونے سے پہلے آپ کی حمایت کی۔ ہمارے بہادر کیپٹن جنرل کا محترم مورث اعلیٰ۔ خود اس مقدس شخص کے دو خاندانی خواتین سے سات بچے تھے۔ ڈون پیڈرو' جیسا کہ حضور والا کو علم ہے' ہمارا "تیسرا بادشاہ" کہلایا جاتا تھا اور وہ اپنے ہی خدمتگاروں کے سامنے کوئی غلط حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ اگلے روز ہی ایک مسلمان محل کے قریب باغ میں مجھ سے الجھ پڑا اور بڑے ادب سے اس نے مجھ سے

پوچھا۔ "تقدس ماب! آپ کے بچے خیر وعافیت سے ہیں؟ اور آپ کے کتنے بچے ہیں؟" غالباً اس کی نیت نیک ہی تھی لیکن میرا جی چاہا کہ میں اس کی گستاخ زبان کھینچ لوں اور اسے دوزخ کی آگ میں جھونک دوں۔

بیشک میں جانتا ہوں یہ بہت پرانا مرض ہے جسے ہمارے عظیم ترین عالم بشپ تورس کے گریگری نے بہت ہوا دی۔ جس کا خاندان حضرت عیسیٰ کے چھ سو برس بعد وسطی فرانس میں برسوں چرچ پر قابض رہا۔

ہمارے کارڈینل اور بشپ اور ان کے ماتحت کام کرنے والے ان چھ صدیوں سے اس گناہ کے سمندر میں غوطے کھا رہے ہیں۔ اب جبکہ ہم نے اپنے زیادہ تر علاقے واپس لے لئے ہیں۔ غرناطہ ایک ایسا نخلستان بن گیا ہے جہاں مسلمان دن رات ہوس پرستی میں مشغول رہتے ہیں۔ وہ جانوروں کی طرح کھلے پھرتے ہیں۔ یہ وہ مستقل بے راہروی ہے جس کی وبا ہمارے چرچ کو لگ گئی ہے اور جو ہمارے مقصد کو زبردست نقصان پہنچا رہی ہے۔ یہ دوسری وجہ ہے کہ ہمیں اس ملک میں سے ایسی حرکتوں کو ختم کر دینا چاہئے۔ میں اعلیٰ حضرات سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اس سلطنت میں ہمارے عقائد کے قیام کا اعلان کر دیں اور ایک کلیسائی محتسب کا تقرر کریں جو ان لوگوں میں کام کرنا شروع کر دے تاکہ پھر کوئی بھی شخص ہمیں اطلاع دے سکے کہ فلاں شخص' چاہے وہ زندہ ہو یا مر چکا ہو' مذہب کے خلاف' یا مخرب اخلاق' یا بہتان طرازی یا گستاخی کرتے ہوئے دیکھا یا سنا گیا ہے۔

اگر ایسا نہیں تو پھر' میں اعلیٰ حضرات کی خدمت میں گزارش کروں گا کہ شہر کے تمام حمام مسمار کر دیئے جائیں۔ یہ بہت بری بات ہے کہ مسلمان ہماری ہی آنکھوں کے نیچے عیاشیاں کرتے رہیں۔ آپ کو یاد ہو گا کہ کس طرح ہمارے سپاہیوں نے' جب انہیں پتہ چلا کہ پورے علاقہ میں الحمرا کا شہر سب سے زیادہ حماموں سے بھرا ہوا ہے' فیصلہ کیا کہ شہر کو بچانے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس کے حمام تباہ کر دئے جائیں اور مسیح کا کلمہ پڑھتے ہوئے لوگوں نے یہ کام سرانجام دیا۔ حمام کی دیواروں پر بنی ہوئی فحش تصویریں جذبات کو اور بھی ابھارتی تھیں۔ یہی حالات تھے جن کی وجہ سے ہمارے صلیبی سپاہیوں نے گناہ کی تمام نشانیوں کو مٹا دیا۔

غرناطہ کے معاملات اس سے بھی زیادہ سنگین ہیں اور صرف روحانی سطح پر ہی منحصر نہیں' یہ حمام ان ملعونوں کے اکٹھے ہونے کی جگہیں بھی ہیں جہاں وہ بغاوتوں اور سازشوں کے منصوبے بناتے ہیں۔ شہر میں بہت زیادہ گڑ بڑ ہے۔ روزانہ میرے مخبر یہ خبریں لاتے ہیں

کہ البائسین میں اور دوسرے مسلمان دیہات میں جو بیماری کی طرح سارے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں اور البوجاراز میں مسلمان کیسی کیسی باتیں کرتے ہیں۔

میرا خیال یہ ہے کہ ان کے اہم لیڈروں کو گرفتار کر کے اور زندہ جلا کر بد اطمینانی کو ختم کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے چرچ پر تو اس دی تو رکیمادا کی موت سے کیسی آفت آئی تھی۔ لیکن محترم کاؤنٹ کا نقطہ نظر قطعی مختلف ہے۔ اس کے نزدیک تو رکیمادا ایک یہودی تھا جو عیسائی ہو گیا تھا اور ہر قیمت پر اپنی وفاداری ثابت کرنا چاہتا تھا۔ کاؤنٹ ہمارے درمیان رہنے والے بے دینوں پر سختی کا مخالف ہے۔ اس کا خیال ہے کہ ان کی زبان اپنا کر اور ان کا لباس پہن کر ہم انہیں اپنے راستہ پر لا سکتے ہیں۔ ملکہ عالیہ محسوس کر سکتی ہیں کہ نہ مجھے یہ منطق سمجھ میں آتی ہے نہ میں اسے پسند کرتا ہوں۔ ہمارے بہت سے نائٹ جو الحمرا پر قبضہ کے لئے شیروں کی طرح لڑے مستقلاً" غرناطہ میں عیش و عشرت کی زندگی گزار رہے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ان کی جنگ ختم ہو چکی ہے۔ وہ نہیں سمجھتے کہ ہماری جنگ کا فیصلہ کن مرحلہ ابھی شروع ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں اعلیٰ حضرت سے گزارش کرتا ہوں کہ مندرجہ ذیل اقدامات کے اختیارات دیئے جائیں اور غرناطہ کے کیپٹن جنرل۔ ڈون اینگولوپیرڈی مینڈورزا کو یہ بتا دیا جائے کہ وہ چرچ کے کسی اقدام کے راستہ میں رکاوٹ نہیں ڈالے گا۔

ہم مورز کو ہدایت کرتے ہیں کہ عربی زبان چھوڑ دیں۔ آپس میں بھی اور خرید و فروخت کے نجی کاروبار میں بھی۔ ان کی علمی کتابوں کے جلانے سے اس حکم پر بہتر عمل ہو سکے گا۔

ان کے لئے قید میں پروان چڑھنے والے غلاموں کے رکھنے پر پابندی لگا دی جائے۔

انہیں عربی لباس پہنے کی ممانعت کر دی جائے۔ اس کے بجائے انہیں کاسٹیلن طرز کے لباس پہننے پر مجبور کیا جائے۔

ان کی عورتوں کے چہرے کسی حالت میں بھی پردے میں نہیں ہونے چاہئیں۔

انہیں ہدایت کیا جائے کہ وہ اپنے گھروں کے بڑے دروازے کھلے رکھیں۔

ان کے حمام تباہ کر دیئے جائیں۔

ان کے تہواروں، شادی بیاہ کے جشن اور بے حیائی کے گیتوں اور موسیقی پر پابندی لگا دی جائے۔

ہر کنبہ جو تین سے زیادہ بچے پیدا کرے اسے تنبیہ کی جائے کہ زائد بچوں کو

کاسٹیلن اور آراگون کے چرچ کی تحویل میں دے دیا جائے گا اور ان کی عیسائیوں کی حیثیت سے پرورش کی جائے گی

اس ملک میں اغلام کی لت بہت زیادہ ہے اور اس کو ختم کرنے کے لئے ہمیں بہت سختی سے کام لینا پڑے گا۔ عام حالات میں اس کی سزا موت ہونی چاہئے اور جہاں یہ ظلم جانوروں کے ساتھ کیا جائے وہاں جہازوں پر ۵ سال کی سزا کافی ہوگی۔

ہو سکتا ہے کہ یہ اقدامات شکست کے شرائط نامہ کے مطابق نہ ہوں۔ لیکن ہماری روحوں میں جو بیماری گھر کر گئی ہے یہی اس کا مستقل علاج ہے، اگر آپ بلند درجات میری تجاویز سے اتفاق فرمائیں تو میں عرض کروں گا کہ بغیر کسی تاخیر کے ایک کلیسائی عدالت غرناطہ میں قائم کی جائے اور اس کے کارندوں کو فوری طور پر اس شہر کے کوائف حاصل کرنے پر مقرر کیا جائے۔ کلیسائی عدالت کی طرف سے دی ہوئی دو یا زیادہ سے زیادہ تین سخت سزائیں کافی ہوں گی اور انہیں پتہ ہو جائے گا کہ وہ خدا کی طرف سے عطا کئے ہوئے اقتدار کو کوئی مذاق نہیں سمجھ سکتے۔

میں آپ کے فوری جواب کا منتظر رہوں گا۔

اعلیٰ حضرات کا انتہائی تابعدار خادم، فرانسکو زی منس ڈی سینروس۔

زی منس نے خط بند کر کے اپنی مہر لگائی۔ پھر اس نے اپنے سب سے زیادہ قابل اعتماد پادری ریکارڈو ڈی کارڈوا کو بلایا جو اپنے آقا میگوئل کے ساتھ ہی مسلمان سے عیسائی ہوا تھا اور جسے چرچ کی نذر کر دیا گیا تھا۔ وہ خط اس کو دیا۔ "صرف بادشاہ یا ملکہ ہی پڑھیں اور کوئی نہیں سمجھ گئے!"

ریکارڈو مسکرایا۔ گردن ہلائی اور باہر چلا گیا۔

زی منس سوچ رہا تھا۔ وہ کیا سوچ رہا تھا؟ اسے اپنی کمزوریوں کا خیال آ رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ نہ اس کی تحریر صاف ہے نہ تقریر۔ وہ کبھی بھی آگ اور پانی کو ملانے میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔ اس نے بچپن میں اسلاف میں جو گرامر پڑھی تھی وہ بڑی دقیانوسی تھی۔ بعد میں سلامانکا کی یونیورسٹی میں اس نے دینی اور عمرانی قوانین پر توجہ مرکوز کی۔ نہ وہاں نہ روم میں نہ اسے ادب سے کوئی شغف ہوا نہ مصوری سے۔

مائیکل اینجیلو کی تصویریں اسے قطعی متاثر نہیں کرتی تھیں۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ سلامانکا اور ٹولیڈو کی مجرد اقلیدسی شکلوں سے بہت متاثر ہوا تھا۔ وہ جب بھی کبھی ایسے معاملات پر غور کرتا اور ایسا اکثر ہوتا تھا تو وہ اعتراف کرتا کہ خدا کی ایک تصور کے طور پر

ہی عبادت فطرت سے زیادہ قریب ہے۔ اسے مجسموں کا یہ ہتھکنڈا جو بت پرستوں سے لیا گیا تھا اور جس پر عیسائیت کا رنگ چڑھا دیا گیا تھا۔ اچھا نہیں لگتا تھا۔

کاش اسے بھی اپنے پیشرو کارڈینل مینڈوزا کی طرح خطوط لکھنے کی مہارت ہوتی! پھر ازابیلا اور فرڈ نینڈ کے نام اس کا خط بڑی متفہ اور مسجہ زبان میں ہوتا۔ اس کی تحریروں سے حکمران اس قدر خوش ہوتے کہ وہ لفظوں میں چھپے ہوئے خنجر کو ان کا لازمی جزو سمجھتے۔ لیکن وہ زی منس۔ ابھی ملکہ کو فریب نہیں دے سکتا' نہ دے گا۔

جب تلویرا کو غرناطہ کا آرچ بشپ بنا کر بھیجا گیا تھا تو وہ ملکہ کا کنفر مقرر ہوا تھا اور اسے تعجب تھا کہ جب وہ ملکہ کے سامنے پیش ہوا تھا وہ بالکل گھبرایا ہوا یا پریشان نہیں تھا اور جب وہ اس کی طرف بڑھا تو ملکہ نے بھی اس کے چہرے پر کوئی غلامانہ کیفیت نہیں دیکھی۔ اس کا احساس تفاخر تقدس جو اس کے پور پور سے ٹپکتا تھا اس میں کوئی بناوٹ نہیں تھی۔

ازابیلا کو علم تھا کہ اس کا پادری بڑے جذبہ والا انسان ہے۔ سخت مزاجی میں وہ اسی کی طرح تھا۔ تلویرا اس کا احترام کرتا تھا لیکن ملکہ کے لالچ اور تعصب کے لئے اپنی حقارت کو چھپا نہیں سکتا تھا۔ اس نے ہمیشہ اسے تحمل اور مسلمان رعایا کے ساتھ بقائے باہمی کی اہمیت سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ زی منس سخت مٹی کا بنا ہوا تھا۔ ایک پادری جس کا دل لوہے کا تھا اور اس سے بھی زیادہ ایک ذہن جو اسی جیسا تھا' ازابیلا نے اسے اپنے ضمیر کا نگران بنا لیا تھا۔ ملکہ نے اس کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا۔ فرڈ نینڈ کی بے وفائیاں۔ اس کا اپنا گناہ کی طرف رجحان' اس بیٹی کا خوف جس کا دماغ کسی وقت بھی خراب ہو سکتا تھا پادری نے یہ تمام باتیں بڑی ہمدردی سے سنیں۔ صرف ایک مرتبہ وہ اس کے انکشافات سے اس قدر چونک گیا تھا کہ اس کا ذہن جذبات پر قابو نہ رکھ سکا اور چہرہ دہشت زدہ ہو گیا۔ ازابیلا نے اسکے سامنے اعتراف کیا تھا کہ غرناطہ پر فتح سے کوئی تین برس پہلے اس نے ایک ناتمام شہوانی خواہش محسوس کی تھی اور اس کا سبب قرطبہ کا ایک مسلمان شریف زادہ تھا۔

زی منس کو وہ بات یاد آئی تو اس کے جسم میں ایک جھرجھری دوڑ گئی اور اس نے یسوع مسیح کا شکر ادا کیا کہ سپین ایک بڑی آفت سے بچ گیا۔ اگر ملکہ کی خوابگاہ میں ایک مسلمان کو باریابی حاصل ہو جاتی تو کون کہہ سکتا ہے کہ تاریخ کیا رخ اختیار کرتی۔ اگر ازابیلا کی صلاحیتیں کند ہو جاتیں تو پھر اس سے بھی کسی زیادہ تیز خنجر کی ضرورت ہوتی۔

زی منس سپین کا پہلا صحیح معنوں میں مجرد آرچ بشپ تھا۔ سلامانکا میں ایک رات جب وہ یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھا۔ اس نے وہ آوازیں سنی تھیں جو ان ہنگامہ خیز دنوں میں لڑکوں کے ایک کمرے سے آ رہی تھیں اور وہ سمجھ گیا تھا کہ اس کے ہم جماعت بپھرے ہوئے جانوروں کی نقلیں اتار رہے تھے۔ لڑکوں کے کچھ جوڑے ایک دوسرے کو جو لطف دے رہے تھے وہ سب لوگ سن رہے تھے۔ زی منس نے بھی ایک کھچاؤ سا محسوس کیا۔ یہ عجیب سی کیفیت سے سلا دینے کے لئے کافی تھی۔ لیکن جب اگلی صبح وہ سو کر اٹھا تو اس نے دیکھا کہ اس کی شب خوابی کا لباس اس کے اپنے ہی خمیر میں ڈوبا ہوا تھا۔ ساتھ ہی ایک اور بھی گناہ آلود اتفاق یہ ہوا کہ گیلا دھبہ کاسٹیل اور آراگون کے نقشے بنا رہا تھا۔

پورے دو روز زی منس خوف اور دہشت سے پریشان رہا اس ہفتہ کے آخر میں چرچ کے اندر اپنے کنفسر کو اس نے یہ بات بتائی۔ جو ہونے والے آرچ بشپ کی ناخوشی کے باوجود بڑے زور سے ہنسا اور اتنی بلند آواز میں بولا کہ زی منس شرمندگی سے کانپنے لگا۔

"اگر میں..." پادری نے ہنستے ہوئے کہنا شروع کیا لیکن پھر پیلے پڑتے ہوئے کانپتے ہوئے آدمی کو دیکھ کر اس نے کوئی زیادہ سنجیدہ فقرہ سوچنا شروع کر دیا۔ "اگر چرچ اغلام کو ناقابل معافی جرم قرار دے دیتا تو سپین کا ہر پادری جہنم میں جاتا۔"

ہوسٹل کے کمرے میں ہونے والے واقعات سے بھی زیادہ اعتراف کے اس تجربہ نے زی منس کو مجبور کیا کہ وہ مجرد زندگی گزارنے کا عہد کرے۔ جب وہ سیگونزا میں کارڈینل مینڈوزا کی جاگیر پر کام کر رہا تھا۔ جب پادری کسی بھی دیہاتی لڑکے یا لڑکی کو بہ آسانی حاصل کر سکتا تھا تب بھی زی منس نے اپنے آپ پر قابو رکھا۔ وہ کوئی نامرد بھی نہیں تھا کہ اپنے آقا کی مردانگی پر فخر کرتا۔ اس کے بجائے اس نے مجرد رہنے کا فیصلہ کیا اور فرنسکن عقائد اختیار کئے تاکہ اس کا تقدس اور پاکبازی مجروح نہ ہو۔

کارڈینل مینڈوزا کو جب اپنے پادری کی اس قدر غیر معمولی پاکبازی کا علم ہوا تو اس نے اپنی ناراضگی کا اظہار یوں کیا۔ "اتنی غیر معمولی خوبیاں"۔ عام اتفاق تھا کہ یہ اشارہ زی منس کی ذہنی صلاحیتوں کی طرف تھا۔ کانونٹ کی دیواروں کے سائے میں دفن ہونے کے لئے نہیں ہیں"۔

زی منس اپنے کمرے میں ٹہلتا رہا۔ اپنی محرابی کھڑکی سے وہ اس کیتھیڈرل کو دیکھ رہا تھا جسے مستری ایک پرانی مسجد کے کھنڈرات پر تعمیر کر رہے تھے۔ جو محل کے بالکل سامنے تھی۔ اس کے ذہن میں بڑے بڑے خیالات آ رہے تھے۔ لیکن کبھی کبھی غیر مرئی اور ناقابل

قبول تصویریں بھی ابھر آتیں اور اس کے اعلیٰ ترین خیالات میں مخل ہوتیں۔ زی منس کو ایک ماہ پہلے تولیدو میں ہونے والی ایک بے ادبی کے بارے میں بتایا گیا تھا جس میں اسلام کے ایک ماننے والے نے اس خیال سے کہ کوئی اسے دیکھ نہیں رہا ہے مقدس پانی کے بپتسمائی برتن کو پلید کر دیا تھا۔ جب چند مستعد پادریوں نے اسے پکڑا تو اس نے نہ جرم سے انکار کیا نہ رحم کی درخواست کی نہ ہی اپنی اس حرکت پر کسی شرمندگی کا اظہار کیا۔ بلکہ اس نے دعویٰ کیا کہ اس نے حال ہی میں مذہب تبدیل کیا ہے اور اس کے عیسائی دوست نے اسے ہدایت کی تھی کہ کیتھیڈرل میں عبادت سے پہلے وہ اس طرح خود کو پاک کر لے۔

مجرم نے اپنے دوست کا نام بتانے سے انکار کر دیا۔ اس پر تشدد کیا گیا۔ لیکن اس کے ہونٹ نہیں کھلے۔ کلیسائی عدالت کو اس کی کہانی صحیح نہیں لگی اور سزا کے لئے اسے حکام کے سپرد کر دیا گیا۔ کچھ روز پہلے اسے زندہ جلا دیا گیا تھا۔ اس مکروہ گستاخی کا خیال زی منس کو پریشان کرتا رہا۔ اس نے طے کر لیا کہ وہ اس مخصوص معاملہ سے متعلق کلیسائی عدالت کے کاغذات منگوا لے گا۔

زی منس بے ضمیر انسان نہیں تھا۔ وہ شخص جو آج مسلم غرناطہ پر اتنے ظلم ڈھا رہا تھا خود بھی کبھی مظلوم رہا تھا۔ آنجہانی کارڈینل کریلو کے حکم پر وہ کلیسائی جیل میں قید رہا تھا۔ کارڈینل نے بعد میں جس کی جگہ آرچ بشپ مینڈوزا کا تقرر ہوا۔ زی منس سے کہا تھا کہ وہ ہسپانوی کلیسا کے ایک معمولی سے عہدہ سے دست بردار ہو جائے جس پر روم سے اسے تعینات کیا گیا تھا اور کریلو کے ایک منظور نظر کے لئے جگہ خالی کر دے۔ زی منس اس پر راضی نہیں ہوا۔ اسے چھ ماہ قید تنہائی کی سزا دی گئی۔ اس تجربہ کا اس کے ذہن پر بہت اثر ہوا جس نے اسے گناہ اور جرم کے فرق پر غور کرنے پر مجبور کیا اور یہی وجہ تھی کہ وہ تولیدو میں سزائے موت پانے والے اس شخص کے متعلق سوچ رہا تھا جس نے متبرک پانی کے ساتھ بے ادبی کی تھی۔ شاید وہ بے گناہ ہی ہو۔ لیکن کوئی کیتھولک اسے اس طرح کی بات بتا کر چرچ میں نہیں بھیج سکتا تھا۔ یہ یقیناً کسی ایسے فرانسیسی بے دین کا کام ہو گا جو سزا سے بچ گیا ہو پادری کی آنکھیں اس خیال سے چمک اٹھیں کہ اس نے اصلی بات کو سمجھ لیا ہے۔ اس نے طے کیا کہ وہ تمام معاملہ کا بغور مطالعہ کرے۔

دروازے پر دستک ہوئی۔

"آجاؤ"

ایک سپاہی نے اندر آ کر اس کے کان میں کچھ کہا۔

"اندر بھیج دو"

ابن حشام کمرے میں داخل ہوا۔ وہ سیدھا آرچ بشپ کی طرف بڑھا جس نے مصافحہ کے لئے ہاتھ آگے کیا۔ ابن حشام نے گھٹنوں کے بل جھک کر انگوٹھی کو بوسہ دیا۔ زی منس نے اس کو اٹھایا اور بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"میرے چچا میگوئل نے مجھے تاکید کی ہے کہ میں عالی جناب سے ملوں اور آداب بجا لاؤں" زی منس نے اس شخص کی طرف دیکھا جو غرناطہ کے امراء میں سے تھا اور تازہ تازہ عیسائی ہوا تھا اور اپنے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ لانے کی کوشش کی۔

"کارڈوا کے بشپ نے آپ کو کس نام سے عیسائی بنایا"

"پیڈرو ڈی غرناطہ"

"یعنی آپ کا مطلب ہے۔ پیڈرو ڈی گریناڈا۔" پیڈرو نے سر ہلایا۔ اس کی آنکھوں سے دکھ اور ہزیمت جھلکتی تھی۔ اس نے اس شخص کی طرف دیکھا جس کے چہرے پر کچھ فخر کا احساس تھا اور کسی قدر حقارت ٹپکتی تھی اور جس کے ہاتھ پر ابھی اس نے بوسہ دیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کاش اسے موت ہی آ گئی ہوتی۔ لیکن وہ ہلکے سے مسکرایا اور اپنی اس تذلیل پر اپنے اوپر لعنت بھیجی۔

زی منس نے اس کی طرف دیکھا اور گردن ہلائی۔

"آپ کو آنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے آپ کے چچا کو اطلاع دے دی ہے کہ آپ کو نیا کاروبار کرنے کی اجازت دے دی گئی ہے۔ میں اپنے کہے پر قائم رہتا ہوں۔ مجھے ایک بات بتائیں! پیڈرو! کیا آپ کی بیٹی نے بھی ہمارا مذہب قبول کر لیا ہے؟"

پیڈرو ڈی گریناڈا کو پسینہ آ گیا۔ اس شیطان کو سب کچھ معلوم تھا۔

"وہ اشبیلہ..... معاف کیجئے۔ سیویلہ سے واپسی پر مذہب قبول کر لے گی! جناب عالی۔ ہم اس کی واپسی کا انتظار کر رہے ہیں۔"

"اللہ تمہیں خوش رکھے بیٹے۔ اب مجھے اجازت دیں۔ شام کی دعا کا وقت ہو گیا ہے اور اس کے بعد مجھے اور مصروفیات ہیں۔ ایک بات اور پچھلے ہفتہ ہولی کمیونین پر جاتے ہوئے ہمارے سات پادریوں کو گھیر لیا گیا تھا اور ان کے سروں پر انسانی فضلے کی بالٹیاں انڈیل دی گئی تھیں۔ کیا آپ کو ان نوجوانوں کے نام معلوم ہیں جنہوں نے یہ حرکت کی تھی۔؟"

پیڈرو نے نفی میں سرہلایا۔

"نہیں۔ میرا بھی یہی خیال تھا۔ اگر آپ کو معلوم ہوتا تو آپ فوراً اس کی اطلاع کر دیتے۔ اگر ہو سکے تو معلوم کرنے کی کوشش کریں۔ ایسی گستاخی پر کوئی سزا سے نہیں بچ سکتا۔"

نئے نئے عیسائی ہونے والے پیڈرو نے ان خیالات سے مکمل اتفاق کیا۔

"جب خدا چیونٹی کو سزا دینا چاہتا ہے جناب عالی! تو اس کے پر نکل آتے ہیں۔"

جب پیڈرو آداب بجا لا کر رخصت ہو گیا تو زی منس کو بڑی بدمزگی کا احساس ہوا

"قابل نفرت' بزدل' پراگندہ ذہن' بے وقوف" اس نے سوچا۔ "یہ روزانہ مجھ سے ملنے آتے ہیں۔ کچھ خوف سے کچھ تحفظ کی خاطر۔ یہ اپنی ماؤں کو بیچ دیں گے اگر... اگر... ہمیشہ ایک اگر... چرچ ان کی املاک کی ضمانت دے دے۔ اگر چرچ ان کے کاروبار میں مداخلت نہ کرے۔ اگر چرچ کلیسائی عدالت کو غرناطہ میں نہ آنے دے۔ اس صورت میں وہ خوشی کے ساتھ ہمارا مذہب قبول کر لیں گے اور اپنے ساتھ اپنی تمام تر حرص کو بھی لے کر آئیں گے۔ ہمارے چرچ کو ایسے گھٹیا بے ضمیروں کی ضرورت نہیں۔ پیڈرو ڈی گریناڈا مرتے دم تک مسلمان رہے گا۔ خدا اس پر اور اس جیسوں پر لعنت کرے۔"

پہاڑوں کی ڈھلوانوں سے دور اس فاصلے پر گاؤں کے سفید گھر تو نظر نہیں آ رہے تھے لیکن ان کے باہر جلتے ہوئے تیل کے چراغ یوں جھلملا رہے تھے کہ یزید کو یہ بالکل کسی جادو کی سی دنیا لگتی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ جب تک اس کے ارد گرد جمع مرد اور عورتیں لوٹ نہیں جائیں گے یہ چراغ جلتے رہیں گے۔

گھر کا بیرونی احاطہ آنے والوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ گھاس پر بچھے ہوئے دبیز قالینوں پر دائرے کی شکل میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی چراغ کی روشنی زندیق یا میگوئل کے چہرے پر پڑتی۔ وہ بھی اسی دائرے میں تھے۔ انگیٹھیوں میں سلگتے ہوئے کوئلے انہیں گرمی پہنچا رہے تھے۔ جب بات چیت شروع ہوئی تو کوئی دو سو لوگ وہاں موجود تھے۔

یہ خاندان جسے دو سو برس سے شکار کے علاوہ اور کوئی مشغلہ نہیں تھا آج اس کا تاریخ سے سامنا تھا۔ انہیں اس وقت یہ احساس بھی نہیں تھا کہ باورچی نے بھنتے ہوئے دنبے پر کون سے عرق ڈالے ہیں اور نہ یہ خیال تھا چین سے کون سے نئے ریشمی کپڑے غرناطہ میں آئے ہیں۔

اس شام میگوئل کا زور تھا۔ شروع میں وہ کافی بددل اور جھلایا ہوا رہا تھا۔ وہ کہہ رہا

تھا کہ رومن کیتھولک چرچ کی جیت اس بات میں ہے کہ اس نے اپنے ارادوں کی تلخیوں کو چھپانے تک کی کوشش نہیں کی ہے۔ اس نے کسی غلط فہمی کی گنجائش نہیں چھوڑی۔ اسے اپنی ساکھ کی کوئی پروا نہیں۔ اس نے اپنے ماننے والوں کو مرعوب کرنے کے لئے اپنے چہرے پر کوئی نقاب نہیں ڈالا۔ اس کے عزائم مکروہ حد تک واضح تھے۔ اس نے کندھوں کے جھٹکے دے دے کر بڑے زور سے کہا تھا:

"تم غلاظت میں پیدا ہوئے ہو اور اسی میں رہو گے۔ لیکن ہم تمہاری اس گندگی کو معاف کر دیں گے' اگر تم دوزانو ہو کر روزانہ اپنے گناہوں سے توبہ کرو گے۔ تمہارا قابل رحم وجود تمہیں اسے بڑی عاجزی اور انکساری سے برداشت کرنا پڑے گا۔ زندگی ایک عذاب ہے اور رہے گی۔ تم صرف اپنی نجات کی کوشش کر سکتے ہو اور اگر تم ایسا کرو اور اپنی مصیبتوں پر واویلا نہ کرو تو ہو سکتا ہے تمہیں نجات مل جائے۔ صرف یہی ایک صورت ہے کہ تمہاری دنیاوی زندگی کی غلاظت ذرہ بھر کم ہو سکے۔ صرف ٹھکرائے ہوئے لوگ ہی دنیاوی خوشی کے پیچھے بھاگتے ہیں"

یہاں میگوئل رک گیا اور اس نے سامعین پر نظر کی۔ ان پر جیسے کوئی جادو ہو گیا تھا اور وہ بڑی حیرانی کے ساتھ اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اپنی دھیمی اور پرسکون آواز میں وہ انہیں ان کے ماضی میں لے گیا تھا۔ اس نے انہیں صرف مسلمانوں کے کارنامے ہی نہیں بلکہ ان کی شکستیں بھی یاد دلائیں۔ اس نے اس بدنظمی' محلاتی جبر اور آپس کی لڑائیوں کے متعلق بتایا جو اس تباہی کی ذمہ دار تھیں۔

"اگر ہمارے خلیفہ اور سلطان چاہتے کہ حالات ویسے کے ویسے ہی رہیں تو انہیں حکومت کے طور طریقے بدلنے چاہئیں تھے۔ کیا اپ سمجھتے ہیں میں تبدیلی مذہب پر خوش ہوں؟ آج ہی میں نے اپنے عزیزوں کو ناراض کیا ہے جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں۔ لیکن میں اب عمر کے اس حصہ میں ہوں جہاں سچائی سے آنکھیں نہیں چرائی جا سکتیں۔

"اس گھر سے اس گاؤں سے مجھے بڑا لگاؤ ہے۔ کیونکہ میں چاہتا ہوں کہ سب یہیں رہیں اور خوشحالی کی زندگی گزاریں اس لئے میں آپ سے ایک مرتبہ پھر اس مسئلہ پر غور کرنے کی درخواست کرتا ہوں۔ پہلے ہی کافی وقت گزر چکا ہے۔ لیکن اگر آپ چاہیں تو اب بھی آپ کو بچایا جا سکتا ہے۔ آخر کار آپ مذہب بدل ہی لیں گے۔ لیکن اس وقت تک کلیسائی عدالت یہاں آ چکی ہو گی اور وہ آپ سے پوچھے گی کہ تبدیلی مذہب کا کونسا طریقہ صحیح ہے او رکون سا غلط۔ اس لئے کہ ان کا مقصد یہ بھی ہے کہ وہ چرچ اور حکومت کے

لئے آپ کی زمینوں پر قبضہ کریں۔ میں زبردستی نہیں کر سکتا۔ لیکن میرے بعد جو لوگ آئیں گے وہ اتنا لحاظ نہیں کریں گے۔"

گو کہ جو کچھ اسنے کہا وہ سخت ناپسندیدہ تھا۔ اکثر لوگ محسوس کرتے تھے کہ بہت حد تک ٹھیک بات کہہ رہا ہے۔ کم از کم ان سرپھرے لوگوں سے زیادہ جو جنگ کی باتیں کرتے ہیں۔ اس لئے کہ اس سرکردہ گھر کے بظاہر سکون کی تہہ میں زبردست اضطراب تھا۔

کچھ لوگ جن کے ساتھ چھوٹے بچے تھے پہلی ہی تقریر کے بعد چلے گئے۔ لیکن یزید پوری طرح جاگ رہا تھا اور ہر بات میں دلچسپی لے رہا تھا۔ وہ اپنی ماں کے پاس اس کے لمبے اونی چوغے میں بیٹھا تھا۔ برابر میں اس کی بہن ہند بیٹھی تھی جس میں' اپنی ماں کی طرف سے ورثہ میں ملا ہوا' ایک بربر جوش تھا جس پر سب حیران تھے۔ لیکن یزید حیران نہیں تھا۔ اس نے اپنے بڑے چچا کو کئی مرتبہ ٹوکا۔ اس کے چبھتے ہوئے فقروں پر طنز سے ہنسی اور چپکے چپکے گالیاں بھی دیتی رہی۔ لیکن رات کی خاموشی نے اس کی آواز کو بکھیر دیا اور گاؤں کی عورتوں نے اسے داد دی۔ میگوئل نے برا نہیں منایا۔ وہ دل ہی دل میں ہند کی جرات کو سراہتا رہا اور اس نے بلند آواز میں کہا کہ وہ اس سے بہت پیار کرتا ہے۔ بڑے چچا کے اس اظہار محبت پر بھی اس کا ردعمل منفرد تھا۔ لیکن اس مرتبہ وہ حد سے بڑھ گئی اور کسی نے اس کو پسند نہیں کیا۔

"جب کوئی سانپ کہے کہ مجھ سے محبت کرتا ہے تو میں اسے گلے کا ہار بنا لیتی ہوں۔"

اما زور سے کھلکھلائی۔ یزید کو تعجب ہوا اس لئے کہ اسے معلوم تھا وہ ہند کے رویہ سے سخت ناخوش تھی۔ لیکن اما کا کسی نے ساتھ نہیں دیا۔ حالانکہ میگوئل کو عموماً لوگ پسند نہیں کرتے تھے۔ گاؤں والوں کو یہ بدتمیزی اچھی نہیں لگی۔ جو اسے ابن فرید کے بیٹے کے ساتھ زیادتی سمجھتے تھے۔ سانپ کی بات سے اس کے چچا کو جھلاہٹ ہوئی۔ یہ زہر اس کے کانوں میں اتر گیا اور وہ اپنے آنسو نہیں چھپا سکا۔

اپنے چچا کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر عمر گھبرا گیا۔ اس نے انگیٹھی کے اس پار اپنی بیوی کی طرف گھور کر دیکھا۔ زبیدہ اس کے اشارے کو بھانپ گئی۔ اس نے ہند کو خبردار کیا کہ تمیز سے رہے ورنہ میگوئل کے بیٹے سے اس کی شادی کر دی جائے گی۔ اگر اس نے زبان کو قابو میں نہ رکھا تو یو آن سے اس کا بیاہ کر دیا جائے گا۔ یہ دھمکی کارگر ثابت ہوئی۔ ہند میگوئل کے قریب گئی اور اس سے معافی چاہی۔ اس نے مسکرا کر اس کے سر کو تھپتھپایا۔ معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ کافی پیش کی گئی۔

ہند کو کوئی کوفت نہیں ہوئی اس لئے کہ اس کے خیالات لوگوں تک پہنچ گئے تھے اور خصوصاً اس اجنبی تک جو وہاں بیٹھا ہوا تھا۔ ابن داؤد' قاہرہ کا وہ سبز آنکھوں والا شہزادہ' جو اس کے جذبات کا مرکز تھا' گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ ابھی اپنی بہن کے دل کا چور یزید نے بتایا بھی نہیں تھا کہ ابن داؤد پہلے ہی ہند کے سحر میں آچکا تھا۔ اس کی تیز زبان اور شرارت آمیز تیکھے تیور اس کا دل جیت چکے تھے۔ لیکن آج رات کی بحث نے اسے الجھا دیا تھا۔ وہ بڑے چچا سے ہند کی گستاخی پر ہلکے سے مسکرایا تھا۔ لیکن اصل میں یہ زندیق کی سنجیدہ باتیں تھیں جن کے متعلق وہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

میگوئل کے برعکس زندیق نے عیسائی عقائد اور توہمات کو ادھیڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس نے قدیم چرچ کا مذاق اڑایا کہ وہ اصنام پرستوں کے اثر سے ہو سکا۔ ورنہ وہ عیسیٰ کو خدا اور ان کی ماں کو دیوی کا درجہ نہ دیتے۔ اس کے مقابلہ میں پیغمبر اسلام نے ان اثرات کو رد کیا اور تین دیویوں کی پرستش سے انکار کیا۔ اس وقت زندیق بس اسی حد تک اپنے ہم مذہبوں کا ساتھ دے سکتا تھا۔ اس نے اسلام کا اس استدلال سے دفاع نہیں کیا جس کی اس سے توقع تھی۔ وہ ایمانداری کے ساتھ سمجھتا تھا کہ میگوئل کی باتیں بالکل ٹھیک اور ناقابل تردید تھیں۔ اس کے بجائے اس نے انہیں یہ امید دلائی کہ ایک ستارہ اگر ایک جگہ ڈوب جائے تو دوسری جگہ ظاہر ہو سکتا ہے۔ استنبول میں مسلمانوں کی فتح کو اس نے اس قدر تفصیل سے بیان کیا کہ سننے والوں میں فخر کی ایک لہر دوڑ گئی اور جہاں تک اندلس کے زوال کا تعلق تھا تو اس نے عام سنی سنائی باتوں کو قابل اعتنا نہیں سمجھا۔

اس نے کہا۔ سلطان تلمسین اور مرد درویش کی کہانی یاد کرو۔ جب اس نے عبداللہ التولیی کا استقبال کیا تو سلطان بڑی بیش قیمت پوشاک پہنے ہوئے تھا۔ اس نے اپنے عالم و فاضل مہمان سے پوچھا! "کیا ان قیمتی کپڑوں میں نماز پڑھنا جائز ہے؟" ابوعبداللہ ہنسا اور اس نے یوں جواب دیا! "مغرور سلطان! میں تمہاری کم دماغی پر ہنس رہا ہوں اور تمہاری ناخود شناسی اور تمہاری روحانی پستی پر۔ مجھے تم ایسے کتے کی طرح لگتے ہو جو کسی مردہ ڈھانچے کو سونگھ رہا ہو اور خون اور غلاظت میں منہ مار رہا ہو۔ لیکن پیشاب کرتے وقت ٹانگ اٹھالے کہ کہیں اس کا جسم گندہ نہ ہو جائے۔ تم مجھ سے کپڑوں کی بات کرتے ہو۔ جبکہ وہ لوگ جو تمہاری ذمہ داری ہیں مصیبتوں میں پھنسے ہوئے ہیں۔" سلطان رونے لگا۔ اس نے تاج و تخت کو خیرباد کہہ کر درویش کی مریدی اختیار کر لی۔

زندیق نے کہانی ختم کی تو واللہ واللہ کی آوازیں آنے لگیں اور لوگ یہ باتیں کرنے

لگے کہ اگر اندلس کے مسلمان بادشاہ بھی ایسا ہی رویہ اختیار کرتے تو مسلمانوں کو آج ان حالات کا سامنا نہ ہوتا۔ زندیق ایسے ہی ردعمل کا منتظر تھا۔ لیکن اب اس نے براہ راست سب کو مخاطب کیا۔

"یہ بات بھلی لگتی ہے۔ لیکن کیا یہ ہمیں بچا سکتی تھی؟ میں ایسا نہیں سمجھتا۔ مذہب کیسا بھی ہو۔ یہ بادشاہوں کے طور طریقے نہیں بدل سکتا جب تک کہ اس کے علاوہ کچھ اور بھی نہ ہو۔ وہ کچھ اور جسے عظیم استاد ابن خلدون اتحاد کہتا ہے۔ ہماری شکستوں کی وجہ ہی یہ ہے کہ ہم اندلس کو متحد نہ رکھ سکے۔ ہم نے خلافت کو تباہ ہوتے دیکھا اور اس کی جگہ زہر کو پلتے بڑھتے دیکھا جو اس باغ کے ایک ایک ریشہ میں سما گیا۔ بڑے بڑے امرا نے اندلس کو جھپٹ لیا اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ اس چھوٹے سے تالاب میں ہر ایک بڑی مچھلی بن گیا جبکہ عیسائی اس کے بالکل برعکس چل رہے تھے۔ کئی خاندان ہمارے ہاں برسراقتدار رہے لیکن ہم کوئی معقول نظام حکومت قائم نہ کر سکے۔ ہم نے سیاست کے قوانین وضع نہیں گئے جو عوام کو حکمرانوں کے جبر سے محفوظ رکھ سکتے۔ ہم جنہوں نے سائنس، فن تعمیر، طب، موسیقی، ادب اور فلکیات میں ساری دنیا کی رہنمائی کی، ہم جنہیں سب پر فضیلت حاصل تھی ہم مستحکم اور منظم حکومت قائم نہ کر سکے۔ یہ ہماری کمزوری تھی اور یورپ کے عیسائیوں نے ہماری غلطیوں سے سبق حاصل کیا۔ اس علاقہ میں مسلمانوں کے زوال کا سبب یہ ہے۔ یہ نہیں کہ وہ کیسے لباس پہنتے تھے، مجھے معلوم ہے کہ آپ میں سے کچھ لوگ سوچتے ہیں کہ سلطان ترکی ہماری مدد کرے گا۔ دوستو! مجھے اس کا یقین نہیں۔ میرا خیال ہے کہ ترک مشرق پر اپنا تسلط قائم کر لیں گے اور ہمیں عیسائیوں کے رحم وکرم پر چھوڑ دیں گے۔

عمر میگوئل اور زندیق دونوں سے بہت متاثر تھا۔ لیکن وہ تھک گیا تھا اور بہت سے اہم خاندانی مسائل تھے جو اسے پریشان کئے ہوئے تھے اور اسی لئے اس نے اس بحث میں زیادہ حصہ نہیں لیا۔ وہ محفل کو برخواست کرنا چاہتا تھا لیکن کچھ روایات بہت مقدس قرار پا چکی تھیں اور آداب مجلس کا جزو بن گئی تھیں۔ گفتگو کو ختم کرنے کی غرض سے عمر نے پوچھا کیا کسی کو کچھ اور کہنا ہے۔ اسے بڑا برا لگا جب ایک بوڑھا جلاہا کھڑا ہو گیا:

"آپ سب کو میرا سلام ہو اور میری دعا ہے کہ خدا آپ کو عمر بن عبداللہ اور آپ کے خاندان کو محفوظ رکھے" جولاہے نے کہنا شروع کیا۔ میں نے قرطبہ کے عالی قدر بشپ کو بھی سنا اور ابن زیدون کو بھی جو خود کو زندیق کہتا ہے۔ میں ان جیسا عالم نہیں ہوں۔ لیکن

میں ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ طارق بن زیاد کے جبل طارق پر اترنے کے سو سال کے اندر اندر ہی ہماری شکست طے ہو گئی تھی۔ جب ہمارے دو جنرل اس پہاڑ پر پہنچے جسے فرانسیسی پائرینیز کہتے ہیں تو انہوں نے چوٹی پر کھڑے ہو کر فرانس کے ملک کا جائزہ لیا۔ پھر انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ایک لفظ بھی ان کی زبان پر نہیں آیا لیکن دونوں جنرل ایک بات سوچ رہے تھے کہ اندلس کے تحفظ کے لئے فرانس پر قبضہ ضروری تھا۔ ہم نے کوشش کی، ہاں کوشش کی۔ بہت سے شہر ہمارے قبضہ میں آ گئے لیکن ہماری فوجوں اور چارلس مارتل کی فوجوں کے درمیان جو سخت ترین مقابلہ ہوا وہ پلوا ٹئیر کے شہر سے کچھ فاصلہ پر تھا۔ اس روز ہم نے فرانس پر فتح حاصل کرنے کا موقع کھو دیا۔ لیکن ساتھ ہی ہم اندلس بھی ہار بیٹھے۔ گو ہم میں سے بہت کم کو اس کا احساس ہے۔ اس ملک کو بچانے کا بہترین طریقہ یہ تھا کہ نوتردیم میں ایک مسجد بنا دی جاتی۔ بس مجھے یہی کہنا تھا۔"

اس پر عمر نے اس کا بڑا شکریہ ادا کیا کہ اس نے ہماری زبوں حالی کے ایک بڑے سبب کی طرف ہماری توجہ مبذول کی اور پھر سب کو شب بخیر کہا۔

لوگ رخصت ہونے لگے تو اماں نے یزید کا ہاتھ پکڑا اور اسے گھر کے اندر لے گئی۔ لیکن اس نے دیکھا کہ بہت سے لوگ بڑی گرمجوشی کے ساتھ میگوئل سے ہاتھ ملا رہے تھے۔ ان میں اس کا اپنا حقیقی بھائی ابن حد بھی تھا اور جب یہ دونوں ایک ساتھ کھڑے تھے تو ہند کو یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ دونوں میں کس قدر مشابہت تھی۔ زبیدہ اپنے شوہر کے ساتھ رخصت ہوتے ہوئے گاؤں کے مردوں اور عورتوں کو الوداع کہہ رہی تھی۔

اپنے باپ اور دادا کے برعکس کسانوں اور جلاہوں کے ساتھ عمر کے تعلقات بہت قریبی اور دوستانہ تھے۔ وہ ان کے مرنے جینے اور بیاہ شادی میں شریک ہوتا۔ وہ ایک ایک نام اور ایک ایک کنبہ کے افراد کی تعداد جانتا جس سے وہ حیران بھی ہوتے اور خوش بھی۔ ایک جولاہا اپنی بیوی سے کہتا۔ "یہ امیر واقعی امیر ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ اپنے باپ دادا کی طرح یہ ہم سے فائدے اٹھاتا ہے۔ لیکن یہ ایک اچھا امیر ہے"

یہ ایسے تکلفات کا وقت نہیں تھا۔ عمر بہت بے چین تھا۔ اس نے اس ساری بحث میں کوئی زیادہ حصہ نہیں لیا تھا لیکن اب وہ چاہتا تھا کہ سب جلد جلد اپنے گھروں کو لوٹ جائیں۔ زبیدہ نے رات کے کھانے پر اسے بتایا تھا کہ ان کا بڑا بیٹا ایک ایسا منصوبہ بنا رہا تھا جو بہت جذباتی بلکہ احمقانہ تھا اور اسے ڈر تھا کہ وہ اپنی زندگی داؤ پر نہ لگا دے۔ گاؤں کی

کام کرنے والی عورتوں نے اسے بتایا تھا کہ زہیر لڑائی کے لئے نوجوان بھرتی کر رہا تھا۔ زہیر وہاں موجود نہیں تھا اور جب اس کے متعلق پوچھ گچھ کی گئی تو سائس نے بتایا کہ اس نے چھوٹے مالک کے خاص گھوڑے کو تیار کیا تھا۔ اس پر زین کسی تھی لیکن وہ کہاں گیا تھا اس کا اسے کوئی اندازہ نہیں تھا۔ اسے صرف اتنا معلوم تھا کہ زہیر الفحل اپنے ساتھ دو کمبل لے گیا تھا۔ جب سائس چلا گیا تو ہند اپنی مسکراہٹ نہ چھپا سکی۔ عمر کے لئے اتنا ہی اشارہ کافی تھا۔

"بدتمیز کتا! اس کا بڑا چچا اپنے گھرے دوست زیدون سے ہماری زندگی' موت' اس کے عقیدہ اور ہمارے مستقبل کے متعلق بات کرے گا اور پوچھے گا کہ ہمارا نائٹ کہاں ہے۔ کسی پہاڑی پر کسی بے بس ملازمہ کے ساتھ زیادتی کر رہا ہو گا۔"

گھر کے اندر سے زہیر لوگوں کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اسے افسوس تھا کہ ایسے اہم موقع پر وہ غیر حاضر رہا۔ وہ اپنی بے راہروی پر بہت شرمندہ اور بددل تھا اور خود کو حیوانوں کی صف میں شمار کر رہا تھا۔ لیکن..... لیکن۔ اسے خیال آیا کہ عمیمہ غرناطہ کی لپتی پوتی قحباؤں سے کتنی مختلف تھی جن کے جسم دن رات استعمال ہوتے رہتے تھے۔ عمیمہ اسے بے خود کر دیتی تھی۔ وہ اس کے جذبات کو بھڑکاتی تھی۔ نہ اسے کوئی توقع تھی نہ وہ کوئی مطالبہ کرتی تھی۔ اگر آج وہ اس کے پاس نہ جاتا تو پھر کبھی اسے نہ دیکھ سکتا۔ تین ماہ کے اندر اندر سلیمان سے اس کی شادی ہونے والی تھی۔ اس گنجے' بھینگے جلاہے سے جو گاؤں میں بہترین ریشم کاتتا تھا لیکن جو کسی طرح بھی زہیر الفحل کا ہمسر نہیں تھا۔۔ خصوصاً اس فن میں جو واقعی فن تھا۔

عمر کے سوال سے اس کا بیٹا چونک گیا۔ "کہاں تھے؟ کھانے پر غیر حاضری اتنی اہم نہیں جتنا ایسے وقت میں اس گفتگو سے غیر حاضر رہنا۔ تمہاری غیر حاضری کو سب نے محسوس کیا۔ ابن حد اور سلیمان جولاہا دونوں تمہیں پوچھ رہے تھے"

"السلام علیکم۔ ابو زہیر نے اپنی پریشانی چھپاتے ہوئے منہ ہی منہ میں کہا۔ "میں دوستوں کے ساتھ گیا ہوا تھا۔ کوئی ایسی ویسی بات نہیں تھی۔ یقین کیجئے۔"

عمر نے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا اور مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ لڑکے کو جھوٹ تک بولنا نہیں آتا تھا۔ اس کی آنکھیں اس کی ماں کی آنکھوں کی طرح ہلکے بھورے رنگ کی تھیں اور جب وہ اس کے سامنے کھڑا تھا تو عمر نے اپنے جذبات میں ایک زبردست تبدیلی محسوس کی۔ ایک زمانہ میں وہ ایک دوسرے کے بہت قریب تھے۔ عمر نے ہی اسے گھوڑے پر

سواری کرنا اور شکار کھیلنا سکھایا تھا۔ وہ اپنے باپ کے ساتھ الحمرا کے دربار میں بھی گیا تھا۔ اب اسے احساس ہوا کہ اس نے بہت دیر سے اسے نظر انداز کیا ہوا تھا خصوصاً یزید کی پیدائش کے بعد سے۔ وہ دونوں کتنے مختلف تھے اور اسے دونوں سے کتنی محبت تھی!

وہ ایک بڑے سے گدے پر بیٹھ گیا۔ "بیٹھ جاؤ' زہیر! تمہاری والدہ نے بتایا ہے کہ تم نے کوئی منصوبہ بنایا ہے۔ تمہارے کیا ارادے ہیں؟"

زہیر کا چہرہ ایک دم سے سنجیدہ ہو گیا۔ وہ اچانک اپنی عمر سے بڑا لگنے لگا تھا۔ "میں جا رہا ہوں۔ ابو! کل صبح سویرے۔ میں آج رات آپ سب سے رخصت ہونا چاہتا تھا۔ لیکن یزید سو چکا ہے اور میں اسے سینہ سے لگائے بغیر نہیں جا سکتا۔ میں غرناطہ جا رہا ہوں۔ ہم پادریوں کو اجازت نہیں دیں گے کہ وہ ہمیں زندہ درگور کر دیں۔ ہمیں فوراً کچھ کرنا پڑے گا۔ کہیں وقت ہاتھ سے نہ نکل جائے۔ بغاوت کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ یہ عیسائیت کے ساتھ پنجہ کشی ہے۔ ابو! غلامی کی زندگی سے لڑتے ہوئے مرجانا بہتر ہے۔"

عمر کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اسے ایک روشنی نظر آئی۔ کیپٹن جنرل کے سپاہیوں سے ٹکراؤ' ہنگامہ' تلواریں اٹھتی ہیں۔ بندوقیں داغی جاتی ہیں اور اس کا زہیر گھاس پر پڑا ہوا ہے۔ اس کے سر میں ایک سوراخ ہے۔

"یہ پاگل پن ہے بیٹے۔ یہ جو نوجوان غرناطہ کے حماموں میں بڑھ چڑھ کر باتیں کرتے ہیں ان میں اکثر کاسٹیلین فوج کو دیکھتے ہی دوڑ جائیں گے۔ مجھے اپنی بات پوری کر لینے دو۔ اس میں مجھے کوئی شک نہیں تمہیں چند سو ایسے لڑکے مل جائیں گے جو تمہارے ساتھ لڑنے کو تیار ہوں گے۔ تاریخ ایسے پاگل پن کے کارناموں سے بھری پڑی ہے جہاں مذہب کے نشے میں چور کچھ احمق کافروں پر ہلہ بول دیتے ہیں۔ اس سے کہیں زیادہ آسان یہ ہے۔ کہ کسی درخت کے سائے میں نہر کے کنارے زہر پی کر خودکشی کر لی جائے لیکن اس سے بھی بہتر' بیٹے' یہ ہے کہ زندہ رہا جائے۔"

زہیر کا دماغ خود شکوک سے بھرا ہوا تھا لیکن وہ اپنے باپ پر یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ باپ الرملا میں آگ کے کھیل کے بعد سے جو منصوبے وہ اور اس کے دوست بناتے رہے تھے زہیر ان پر بحث کرنا نہیں چاہتا تھا وہ بہت سنجیدہ تھا۔

"ابو! جو کچھ آپ سوچ رہے ہیں اس کے برخلاف ہمیں اپنی بغاوت کی کامیابی کی کچھ زیادہ امید نہیں ہے لیکن یہ ضروری ہے۔"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ غرناطہ میں حالات ٹھیک رہیں- یہ حالات اچھے نہیں ہیں- لیکن اس سے بہتر ہیں کہ انہیں تور کیماده کے درندوں کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا جائے- وہ درندے جنہیں وہ پادری اور رفیق کہتے ہیں- اگر ہمارے سابق سلطان' اس پر اللہ کی لعنت' نے بغیر لڑے ہتھیار ڈالے ہوتے تو حالات مختلف ہوتے- ازابیلا ہم سے کتوں جیسا سلوک کرتی ہے- ہمارے چیلنج سے ہمارے دشمنوں اور خود ہمارے دوسرے ہم مذہبوں کو پتہ چلے گا کہ ہم آخری دم تک مقابلہ کریں گے- جھکیں گے نہیں- انہیں معلوم ہو گا کہ ہماری اس لٹی پٹی تہذیب میں اب بھی دم باقی ہے-"

"احمق! احمق! لڑکا!"

"ابن داؤد سے پوچھو کہ اس نے سارا کنہ اور بلانسیہ میں کیا دیکھا- غرناطہ تک آتے ہوئے سارے راستے ہر مسلمان جو عیسائیوں سے بچ کر بھاگا یہی کہتا تھا-"

نہ چاہتے ہوئے بھی عمر کو اپنے بیٹے پر بہت فخر محسوس ہوا- وہ زہیر کو ایسا نہیں سمجھتا تھا-

"بچے- تم کیا کہہ رہے ہو؟ یہ تم نہیں لگتے معمے بجھا رہے ہو-"

"میں کہہ رہا ہوں کہ جب وہ معصوم لوگوں پر ظلم کرنے جاتے ہیں تو ان کے پادریوں کی شکلیں کیسی ہو جاتی ہیں- جب وہ کلیسائی عقوبت خانوں میں بچوں کو یتیم بنا رہے ہوتے ہیں-اگر ہم اب نہیں لڑیں گے تو ہر چیز ختم ہو جائے گی'ابو! ہر چیز-"

"ویسے بھی شاید ہر چیز ختم ہو ہی جائے گی- چاہے تم لڑو یا نہ لڑو"

"شاید"

عمر کو علم تھا کہ زہیر کو اندر ہی اندر شکوک وشبہات کھائے جا رہے تھے- وہ اپنے بیٹے کے تذبذب سے پریشان تھا- مسجد میں اپنا مدعا ظاہر کرنے اور اپنے دوستوں کی مدد سے فتوحات کرنے کے دعوؤں کے بعد وہ خود پھنس گیا تھا- عمر نے اپنے بیٹے کو روکنا چاہا- ابھی تم نوجوان ہو زہیر! تمہاری عمر میں موت ایک وہم کی طرح محسوس ہوتی ہے- میں تمہیں یوں زندگی نہیں گنوانے دوں گا- اب جب کہ میں نے طے کر لیا ہے کہ تبدیلی مذہب ناممکن ہے- میرے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے- تمہاری ماں بہنوں کی کون حفاظت کرے گا-؟ یزید کو کس پر چھوڑو گے؟ انہوں نے ہم سے تمام اختیارات چھین لئے ہیں- لیکن جاگیریں ابھی قائم ہیں- ہم امن اور عزت سے اپنی امارت برقرار رکھ سکتے ہیں- الحزیل کا ستیلین کو پریشان کیوں کریں؟ ان کی نظریں اب نئی دنیا پر لگی ہوئی ہیں- سونے چاندی

کے اس انبار پر وہ ہم پر غالب آ چکے ہیں مزاحمت بے سود ہے- میں تمہیں نہیں جانے دوں گا-"

زہیر نے کبھی کسی جنگ میں حصہ نہیں لیا تھا- اس کا جنگی تجربہ بس اس عسکری تربیت تک تھا جو اس نے بچپن میں حاصل کی تھی- وہ ماہر شمشیرزن تھا اور شہ سواری میں اس کی جرات کے وہ سب لوگ گواہ تھے جنہوں نے غرناطہ میں میلادالنبیؐ کے موقع پر اس کے کمالات دیکھے تھے- لیکن اسے پوری طرح احساس تھا کہ وہ کبھی کسی دشمن سے نہیں لڑا تھا-

اس نے اپنے باپ کے فکرمند چہرے کی طرف دیکھا تو زہیر نے محسوس کیا کہ اپنا ارادہ بدلنے کا یہ اس کا آخری موقع ہے- وہ سازش میں شریک اپنے رفیقوں سے کہہ سکتا تھا کہ اس کے باپ نے اسے گھر سے نکلنے سے منع کر دیا ہے- عمر کا بڑا احترام تھا اور وہ سب اس کی مجبوری کو سمجھ جاتے شاید؟- زہیر یہ برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ اس کا کوئی دوست اسے بزدلی کا طعنہ دے- لیکن صرف یہی ایک وجہ نہیں تھی- زہیر کو اس بات کا یقین نہیں تھا کہ غرناطہ میں زی منس کے اقتدار کے ہوتے ہوئے الحزیل محفوظ رہ سکیں گے- اس وجہ سے اس کا خیال تھا کہ عمر کو قطعی طور پر حالات کا صحیح اندازہ نہیں ہے-

"ابو"! زہیر نے گلہ کرتے ہوئے کہا- "مجھے اپنے گھر اور جاگیر سے زیادہ اور کسی بات کا خیال نہیں- اس لئے میرا جانا بہت ضروری ہے- اگر آپ مجھے زبردستی روکیں گے تو میں ظاہر ہے کہ حکم عدولی نہیں کروں گا- لیکن مجھے دکھ ہو گا اور جب میں دکھ محسوس کرتا ہوں تو مجھے موت سہل لگتی ہے-

"کیا آپ کو معلوم نہیں کہ پادری سب کچھ تباہ کر دیں گے- کبھی نہ کبھی وہ الحزیل پہنچ ہی جائیں گے- وہ اندلس کو ویران کر دیں گے- وہ ہماری یادوں کو مٹا دیں گے- وہ کسی ایک بھی نخلستان کو کیوں چھوڑیں گے؟ مجھے رکنے پر مجبور نہ کیجئے- آپ یقین کیجئے کہ جو کچھ میں کرنا چاہتاہوں وہی ہمارے گھر اور مذہب کے تحفظ کا واحد ذریعہ ہے"

عمر اس استدلال سے قائل نہیں ہوا اور بحث چلتی رہی- زہیر کا رویہ اور بھی سخت ہوتا گیا- آخر عمر نے محسوس کیا کہ وہ اپنے بیٹے کو روک نہیں سکتا- اس کے چہرے پر ایک آسودگی نظر آنے لگی- زہیر نے محسوس کیا کہ اس نے بازی جیت لی ہے- اسے اپنے باپ کے مزاج کا پتہ تھا- ایک مرتبہ عمر کوئی بات مان لیتا تھا تو پھر اس میں بالکل مداخلت نہ کرتا-

دونوں کھڑے ہو گئے۔ عمر نے بیٹے کو گلے لگایا اور اس کے رخسار پر بوسہ دیا۔ پھر وہ ایک بڑے سے صندوق کی طرف بڑھا اور اس پر سے ایک منقش نقرئی میان اٹھائی جس میں ابن فرید کی تلوار تھی۔ اس نے تلوار کھینچی اور دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر اسے زبیر کے سر سے اونچا لے گیا اور پھر اس کے ہاتھوں میں دے دی۔

"اگر لڑنا ہی ہے تو اس سے لڑو جو کئی معرکوں میں آزمائی جا چکی ہے اور کامیاب رہی ہے"

زبیر کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

"چلو"! عمر بن عبداللہ نے کہا! "تمہاری ماں کو خبر کرتے ہیں۔"

جب اپنے پر دادا کی تلوار لئے زبیر بڑے فخر کے ساتھ اپنے باپ کے پیچھے پیچھے جا رہا تھا تو صحن میں سے گزرتے ہوئے ان کا سامنا میگوئل اور زہرہ سے ہوا۔ چار مختلف آوازیں ایک ساتھ گونجیں:

السلام علیکم"

میگوئل اور زہرہ نے اپنے باپ کی تلوار دیکھی اور سارا معاملہ بھانپ گئے

زہرہ نے اس کے گالوں کا بوسہ دیتے ہوئے اسے دعا دی۔ "بیٹے! خدا تمہیں سلامت رکھے"۔

زبیر نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن اس عجیب سے جوڑے کو گھورتا رہا۔ اس طرح سامنا ہونے سے وہ گھبرا گیا تھا۔ پھر اس کے باپ نے آہستہ سے اس کا کندھا تھپکا اور وہ آگے بڑھ گئے۔ یہ سب کچھ چند لمحہ میں ہو گیا۔ زبیر کو یہ بدشگونی محسوس ہوئی۔

"کیا میگوئل...؟" اس نے اپنے باپ سے پوچھا۔ لیکن عمر نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتا"۔ اس نے سرگوشی کی۔ "تمہارے بڑے چچا میگوئل کبھی چرچ کو اپنے ہی خاندان پر ترجیح نہیں دیں گے۔" زہرہ اور میگوئل کچھ دیر ساکت کھڑے رہے۔ جیسے سنتری پہرہ دیتے ہوں۔ اس نسل کی آخری نشانی جو ختم ہو چکی تھی۔ آسمان ستاروں سے بھرا ہوا تھا۔ لیکن نہ ستاروں میں روشنی تھی اور نہ غسلخانہ کے دروازے پر رکھے ہوئے چراغ میں۔ رات کے سایوں میں اپنی جھکی ہوئی کمروں کے ساتھ جن پر اونی شال لپٹے ہوئے تھے وہ ایسے لگتے تھے جیسے سوکھتے مرجھاتے ہوئے چھوٹے چھوٹے پائن کے درخت۔ بشپ نے آخر سکوت کو توڑا۔

"مجھے بہت خطرہ نظر آ رہا ہے"

زہرہ کچھ کہنے ہی والی تھی کہ ہند اور ابن داؤد داخل ہوئے۔ ان کے پیچھے پیچھے تین کنیزیں آ رہی تھیں۔ ان میں سے کسی نے بھی بزرگ خاتون اور میگوئل کو نہیں دیکھا۔ نوجوان آداب بجا لیا اور وہ اپنے کمرے کی طرف جانے والا ہی تھا کہ ایک آواز نے اسے روک دیا:

"ابن داؤد"

جواب ہند نے دیا۔

"واللہ! آپ نے تو مجھے ڈرا دیا۔ بڑے چچا' السلام علیکم۔ بڑی چچی۔"

"آؤ" میگوئل نے ابن داؤد سے کہا۔ "آپ میرے ساتھ میرے کمرے تک چلیں جو آپ کی خوابگاہ کے برابر ہے۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ دن بھی آئے گا جب میں مہمانوں کے کمروں میں ٹھہروں گا۔"

"بکواس" زہرہ نے کہا "وہ تمہیں اور کہاں ٹھہراتے؟ اصطبل میں؟ ہند۔ آج تم مجھے دباؤ سردی میری ہڈیوں میں اترتی جا رہی ہے اور میرے سینہ اور شانوں میں درد محسوس ہو رہا ہے۔"

"جی! بڑی چچی" ہند نے اشارے سے کنیزوں کو رخصت کرتے ہوئے کہا اور بڑی چاہت سے سبز آنکھوں والے نوجوان کی طرف دیکھا۔ ابن داؤد بشپ کے ساتھ برآمدے میں سے جا رہا تھا جو صحن کو ان کمروں سے ملاتا تھا جن کا اضافہ ابن فرید نے کیا تھا۔ وہاں عیسائی نائٹس کی خاطر مدارات کی جاتی اور راتوں کی محفلیں سجتیں۔ زہرہ سوچ رہی تھی کہ کتنی عجیب بات ہے کہ یہ بچی جسے میں بس سرسری ہی جانتی ہوں اور جو ابھی بمشکل اٹھارہ برس کی ہو گی کس طرح مجھے اپنی دوشیزگی کی یاد دلاتی ہے۔ اس کا باپ ابھی اسے ایک نوخیز کلی سمجھتا ہے۔ وہ کتنا ناسمجھ ہے۔ سب باپ ایسے ہی ناسمجھ ہوتے ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔ یہ پورے شباب پر ہے جیسے بہار میں پکے ہوئے مالٹے ہوتے ہیں جن کی خوشبو میں ایک سحر ہوتا ہے۔ گویا اپنے خیال کی تصدیق چاہتی ہو۔ زہرہ تکیہ پر بلند ہوئی اور پوتی کو دیکھا جو بڑے انہماک لیکن نرمی سے اس کے بائیں پیر کے انگوٹھے کو دبا رہی تھی۔ لیمپ کی مدھم روشنی میں بھی ہند کی جلد جو جنگلی شہد کے رنگ کی تھی جھلکتی ہوئی اور زندگی سے بھرپور نظر آ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں چمک تھی لیکن اس کا ذہن کہیں اور تھا۔ یہ بڑی واضح علامات تھیں۔

"کیا وہ بھی تم سے اتنی ہی محبت کرتا ہے؟"

اس اچانک سوال سے وہ گھبرا گئی۔

"آپ کس کی بات کر رہی ہیں۔ بڑی چچی؟"

"چلو بیٹی! تم اتنی شرمیلی نہیں ہو۔ تمہارا چہرہ صاف بتا رہا ہے۔ ابھی میں سوچ رہی تھی کہ شام کو جو کچھ ہوا اس سے تم بہت متاثر ہو۔ میگوئل نے مجھے بتایا کہ تم اس پر برس پڑیں۔ وہ اس سے پریشان نہیں۔ بلکہ وہ تم سے بہت متاثر ہے۔ لیکن تم تو سب کچھ بھول بھی چکی ہو گی۔ کیوں؟ تم کہاں تھیں۔

ہند' اپنی بڑی بہن کلثوم کی ٹھہری ہوئی اور متحمل طبیعت کے برعکس فطرتاً" اپنے جذبات کو چھپا نہیں سکتی تھی۔ ابھی وہ نو برس کی ہی تھی کہ اس نے اشبیلیہ کے ایک عالم کو' جو اس کی ماں کا کزن بھی تھا' قرآنی آیات کی تشبیہ پر اسے پریشان کر دیا تھا۔ علمائے دین تقریباً ہر قسم کی تفریح کو ممنوع قرار دے رہے تھے اور وہ اس بات پر بحث کرتے تھے کہ اندلس کے زوال کا سبب ایسی ہی تفریحیں ہیں جن میں امراء مشغول ہیں۔ ہند نے بیچ میں اسے ٹوک دیا اور اس کی اس جسارت کو آج بھی بونا اور اس کے دوست مزے لے لے کر یاد کرتے تھے۔

"چچا" بچی نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔"کیا ہمارے نبیؐ کی ایک حدیث ہے جس کی صحت پر کبھی شک نہیں کیا گیا تھا کہ فرشتے صرف تین قسم کے کھیل پسند کرتے ہیں"

وہ عالم اس بچی کی مسکراہٹ سے دھوکا کھا گیا اور اسے خوشی ہوئی کہ اتنی سی بچی قرآن کا اتنا علم رکھتی ہے۔ اس نے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرا اور بڑی شفقت سے کہا:

"اور یہ کھیل کیا تھے۔ میری بچی؟"

"شہسواری' تیراندازی اور باہم اختلاط"

اشبیلیہ والے چچا کے حلق میں نوالہ پھنس گیا۔ زہیر بڑے ادب سے اجازت لے کر اٹھا اور باورچی خانہ میں پہنچ کر ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو گیا۔ زبیدہ بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔ صرف عمر تھا جس نے بات کا رخ بدلا اور بڑے سلیقہ سے بدلا۔ صرف کلثوم خاموش رہی اور اس نے اپنے چچا کو پانی کا ایک گلاس پیش کیا۔ اس کا عالم پر بہت اچھا اثر ہوا۔ اس کے بیٹے سے کلثوم کی شادی ہونے والی تھی۔

زبیدہ نے یہ قصہ زہرہ کو سنایا ۔ بزرگ خاتون کو ہنسی آ گئی اور اسی بات کی یاد تھی جس کی وجہ سے وہ اپنی پوتی کو دیکھ کر مسکرائی۔

"میرے کان سننے کے لئے بیتاب ہیں بچی"۔

ہند جس نے ابھی تک اپنا راز صرف اپنی چہیتی ملازمہ کو ہی بتایا تھا اب گھر کے ایک فرد کو بتانے پر مصر تھی۔ اس نے زہرہ کو ساری بات بتانے کا فیصلہ کیا۔ اس کی آنکھوں میں پھر چمک آ گئی۔

"پہلے ہی دن سے ایسا تھا بڑی چچی۔ پہلی ملاقات میں ہی میں نے طے کر لیا کہ اس کے علاوہ اور کوئی مرد مجھے پسند نہیں۔

زہرہ مسکرائی اور اس نے سنجیدگی سے سر ہلایا۔ "پہلی محبت ہو سکتا ہے بہترین نہ ہو لیکن بہت گہری ہوتی ہے۔"

گہری بھی اور بہترین بھی۔ یقیناً بہترین"

ہند کی آنکھیں چراغوں کی طرح دمک رہی تھیں۔ اس نے ابن داؤد کے الجزیل آنے کا واقعہ سنایا۔ کس طرح اس نے سب کو متاثر کیا تھا۔ اس کا باپ فوراً ہی اس طالب علم سے اس قدر متاثر ہوا تھا کہ اس کو گھر میں اتالیق بننے کی پیشکش کی تھی۔ سب اس کے پہلے درس میں شریک ہوئے تھے۔ ابن داؤد نے ابن خلدون کی وہ تشریح کی جو قاہرہ میں پڑھائی جاتی تھی۔ زبیدہ نے تفصیل سے یہ پوچھنا چاہا کہ ابن خلدون کے نظریات کی مدد سے اندلس کے المیہ کو کس طرح سمجھا جا سکتا ہے۔ اس نے جواب دیا تھا۔ بکھرے ہوئے پتھروں سے شہر کی فصیل نہیں بنتی"

زہرہ نے ہند کو سمجھانا چاہا۔" میں بہت بوڑھی ہو گئی ہوں اور سب باتوں کو نہیں سمجھ سکتی۔ مجھے اس میں کوئی شک نہیں کہ لڑکا ذہین بھی ہے اور اس میں کشش بھی ہے۔ لیکن تم اگر اسی طرح تفصیلات بتاتی رہیں تو تمہاری کہانی کے ختم ہونے سے پہلے میرے دن ختم ہو جائیں گے۔ آج کیا ہوا؟۔ جلسہ کے بعد کیا ہوا؟"

"ابو زہیر کے متعلق پریشان تھے۔ لیکن جلد ہی سب لوگ گھر کے اندر چلے گئے۔ میں ابن داؤد کے پاس گئی۔ اس سے کہا کہ مجھے تازہ ہوا کی ضرورت ہے اور اسے ساتھ چلنے کو کہا۔"

"تم نے اسے کہا؟"

"ہاں۔ میں نے کہا"

زہرہ بہت زور سے ہنسی۔ پھر اس نے ہند کے چہرے کو اپنے جھریاں بھرے ہاتھوں میں لیا اور اس کے منہ کو تھپتھپایا۔

"محبت کبھی کبھی کسی سانپ کا روپ دھار لیتی ہے اور اور گلے کا ہار بن جاتی ہے یا بلبل کی شکل اختیار کر لیتی ہے جو گاتے گاتے نہیں تھکتی۔ آگے چلو"

پھر ہند نے بتایا کہ ایک ملازمہ چراغ لے کر ان کے آگے آگے چلتی رہی اور مناسب فاصلے پر دو خادمائیں ان کے پیچھے پیچھے آ رہی تھیں۔ یوں وہ اناروں کے جھنڈ تک پہنچ گئے۔

"اناروں کا جھنڈ" زہرہ نے اپنے دل کی دھڑکن کو دباتے ہوئے بڑے آہستہ سے کہا "درختوں کا وہی جھنڈ جو گاؤں سے واپس آتے ہوئے گھر سے کچھ پہلے نظر آتا ہے؟ اور زمین پر لیٹ کر ایسا لگتا ہے جیسے اناروں کا ایک شامیانہ جس کے بیچوں بیچ اوپر ایک کھڑکی کھلی ہوئی ہے؟ اور جب آنکھیں کھولو تو آسمان پر ستارے جھومتے نظر آتے ہیں۔"

"مجھے نہیں معلوم بڑی چچی۔ مجھے وہاں لیٹنے کا موقع نہیں ملا۔"

دونوں عورتوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور ہنسیں۔

ہند نے بات جاری رکھی۔ "ہم گھر کی' گاؤں کی' برف پوش پہاڑوں کی اور آنے والے موسم بہار کی باتیں کرتے رہے اور جب تمام باتیں تمام تکلفات ختم ہو گئے تو ہم خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ ایسا لگا جیسے برسوں کی خاموشی کے بعد وہ بولا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور آہستگی سے اپنی محبت کا اظہار کیا۔ اس موقع پر خادمائیں زور زور سے کھانسنے لگیں۔ میں نے انہیں خبردار کیا کہ اب اگر ایسا کیا تو میں انہیں کلیسائی عدالت کے سپرد کر دوں گی اور کہہ دوں گی کہ انہیں زندہ بھون ڈالے۔ پھر وہ کھانستی ہوئی جہنم رسید ہو جائیں گی۔ میں نے بھی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر محبت کا اقرار کیا۔ میں نے اس کے چہرے کو ہاتھوں میں لیا اور اسکے لبوں کا بوسہ لیا۔ اس نے کہا کہ کل وہ ابو سے میرے رشتہ کے متعلق بات کرے گا۔ میں نے اسے خبردار کیا۔ پہلے میں راستہ ہموار کر لوں۔ واپسی پر میں نے محسوس کیا جیسے میرا جسم درد کر رہا ہے۔ اسے اس کی خواہش تھی۔ میں نے اس کے کمرے میں رات گزارنے کی پیشکش کی۔ وہ اس خیال سے تقریباً بے ہوش ہو گیا۔ "میں تمہارے ابو کا مہمان ہوں۔ مجھے ایسا مشورہ نہ دو کہ میں ان کی میزبانی اور اعتماد کو مجروح کروں۔ یہ بڑی شرم کی بات ہو گی"۔ "خدا کا شکر ہے کہ آپ یہاں ہیں دادی زہرہ! میں اس راز کو زیادہ نہیں چھپا سکتی تھی۔"

زہرہ بستر میں اٹھ کر بیٹھ گئی اور ہند کو گلے سے لگایا۔ اسے اپنی زندگی کے لمحے یاد آئے اور وہ کانپ گئی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ یہ لڑکی جو ابھی زندگی میں قدم رکھ رہی ہے اسی کی طرح غلطی کرے اور اس کے دل کو بھی سخت ٹھیس لگے۔ وہ ان دونوں کے لئے

زبیدہ اور عمر سے بات کرے گی۔ لڑکا بے شک غریب ہے۔ لیکن اب زمانہ بدل گیا ہے۔ اپنی پوتی کو وہ صرف تسلی ہی دے سکتی تھی۔

"اگر تمہیں اس پر اعتماد ہے تو پھر یہ موقع نہ جانے دو۔ میں نہیں چاہتی کہ سو سال بعد یہ سننے میں آئے کہ ایک سبز آنکھوں والا نوجوان ان پہاڑوں پر گھومتا رہا۔ تنہا اور دل شکستہ' اور یہ کہا جائے کہ ہند نامی ایک عورت کی چاہت کا راز ا دریا کو بتاتا رہا۔

"مجھے دیکھو بیٹی۔ آج بھی دل میں ایک کسک ہے۔ میں بھی محبت کی آگ میں جل گئی تھی۔ اس نے مجھے اندر سے جھلس ڈالا تھا اور مجھ میں کچھ بھی باقی نہیں بچا تھا حتیٰ کہ میں کسی بھی ہسپانوی شہ سوار کی نفسانی خواہشات پورا کرنے کو تیار ہو جاتی تھی اور مجھے اس کی بھی پروا نہیں تھی کہ یہ مجھے اچھا لگتا تھا یا برا۔ یوں میں اپنی حس کو مارنے کی کوشش کرتی تھی اور جب قرطبہ میں انہوں نے مجھے راستوں میں ننگے بدن پایا تو غرناطہ کے مارستان میں بھیجنے کا فیصلہ کر لیا۔ کبھی غلطی نہ کرنا۔ بہتر ہے کہ تم اس لڑکے کے ساتھ بھاگ جاؤ اور چھ مہینوں میں تم پر یہ کھل جائے گا کہ وہ تمہارے حسن کی خوشہ چینی کی خاطر اپنے والدین کے انکار کی پروا نہیں کرے گا۔ پہلی بات سے شاید تمہیں دکھ ہو جو چند مہینے یا شاید چند برس تمہیں تنگ کرے۔ لیکن دوسری تمہیں مایوسی کی طرف لے جائے گی اور مایوسی روح کو کچل دیتی ہے۔ یہ بدترین شے ہے۔ میں تمہارے والدین سے بات کروں گی۔ اب زمانہ بدل گیا ہے اور پھر یہ تمہارا ابن داؤد گھر کا کوئی ملازم بھی نہیں ہے۔ اب اپنے کمرے میں جاؤ اور مستقبل کے خواب دیکھو۔"

"بہت بہتر بڑی چچی۔ لیکن ایک سوال ہے جو آپ کی اجازت سے میں آپ سے پوچھنا چاہتی ہوں۔"

"پوچھو"

"بڑے چچا میگوئل کے متعلق گاؤں میں ایک کہانی پھیل رہی ہے"

"اوہ' ہاں' وہی جلاہے کی لڑکی والا قصہ۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ اس کا کیا ذکر؟"

"کچھ نہیں۔ اول تو یہ کبھی کوئی راز تھا ہی نہیں۔ میں یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ میگوئل اور اس کی ماں کے بارے میں جو افواہیں ہیں۔ بی بی اسمی کے بارے میں' کیا وہ صحیح ہیں؟"

زہرہ نے زور سے اپنی آنکھیں میچ لیں۔ کہ شاید یہ اندھیرا اس تلخ یاد کو چھپالے جس

میں ہند اسے ایک بار پھر دھکیلنا چاہتی تھی۔ آہستہ آہستہ اس کے چہرے سے کرب کے آثار دھیمے پڑنے لگے اور اس نے آنکھیں کھولیں۔

"میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔ مجھے پہلے ہی گھر سے نکالا جا چکا تھا اور اس وقت میں قرطبہ میں تھی۔ ہم اسمی کو چھوٹی امی کہتے تھے۔ اس پر سب ہنس پڑتے۔ ابن فرید بھی۔ جب مجھے اسمی کے انتقال کی خبر ہوئی تو مجھے بہت دکھ ہوا میکال۔ میگوئل!۔" زہرہ نے شانے جھٹکے۔

"لیکن بڑے چچا"... ہند بولی

بزرگ عورت نے اشارے سے چپ رہنے کو کہا۔ "میری بات غور سے سنو۔ ہند بنت زبیدہ۔ میں نے کبھی حقیقت جاننے کی کوشش نہیں کی۔ مجھے تفصیلات میں دلچسپی نہیں تھی۔اسمی جسے میں بہن کی طرح چاہتی تھی۔ موت سے نہ بچ سکی۔ نہ ابن زیدون کی ماں۔ شاید جو لوگ کہتے ہیں وہی ہوا۔ لیکن اصل حالات کا علم صرف تین کو تھا۔ ان میں سے دو مر چکے ہیں اور میں نہیں سمجھتی کہ میکال سے کبھی کسی نے کچھ پوچھا ہو گا۔ شاید جب وہ عیسائی ہوا تھا تو اس نے اعتراف میں ساری بات بتا دی۔ اب اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ جب تم بڑی ہو گی تو یقیناً دوسرے خاندانوں کے بھی ایسے ہی المناک قصے سنو گی یا پھر ہمارے ہی خاندان کی دوسری شاخوں کے متعلق۔ تمہیں اپنی ماں کا وہ اشبیلیہ والا عمزاد یاد ہے؟"

ہند کے چہرے پر کرب کے آثار ظاہر ہوئے۔

"تمہیں ضرور یاد ہو گا۔ اشبیلیہ کا وہ بڑا مذہبی بھائی جو تمہارے حدیث کے علم سے چونک اٹھا تھا۔؟"

"وہ"۔ ہند نے دانت نکالتے ہوئے کہا۔ "ابن حنیف۔ ہماری کلثوم کا ہونے والا سسر! اس کا کیا قصہ ہے؟"

اگر کبھی انہوں نے ہماری کلثوم کو شرمندہ کرنے کے لئے اسمی کی بات چھیڑی تو تم ان سے ابن حنیف کے اصلی باپ کا نام پوچھنا۔ وہ یقیناً حنیف نہیں تھا۔"

اس انکشاف سے ہند کے جسم کا رواں رواں ہل گیا۔ یہاں تک کہ وہ ابن داؤد کو بھی کچھ دیر کے لئے بھول گئی۔

"مجھے بتایئے۔ چچی، بتائے نا"

"بتاتی ہوں۔ لیکن کلثوم کو کبھی نہ بتانا جب تک کہ خود یہ جاننا اس کے لئے ضروری

نہ ہو۔ وعدہ کرو۔"

ہند نے بڑے اشتیاق سے سرہلایا۔

"ابن حنیف کا باپ اس کی ماں کا باپ بھی تھا۔ وہاں کسی نے خودکشی کے متعلق نہیں سوچا۔ میں نہیں سمجھتی کہ خود ابن حنیف بھی اس حقیقت سے واقف ہے اور ہو بھی کیسے سکتا تھا؟ اس کے ماں باپ اپنے ساتھ ہی یہ راز قبر میں لے گئے۔ لیکن گھر کے پرانے ملازم جانتے تھے۔ ملازموں کو سب خبر ہوتی ہے۔ انہی کے ذریعہ یہ کہانی یہاں تک پہنچی۔"

ہند یہ جان کر دہل گئی۔ اسمی کے معاملہ میں کم از کم۔ موت نے اس داغ کو دھو دیا تھا۔ لیکن اشبیلیہ میں.....

"میں تھک گئی ہوں بیٹی، اور تمہیں بھی سو جانا چاہئے۔" زہرہ نے یہ کہتے ہوئے اسے باہر جانے کا اشارہ کیا۔

ہند نے محسوس کیا کہ مزید گفتگو بیکار ہے۔ وہ بستر سے اٹھی اور زہرہ کے ضعیف گالوں کو بوسے دئے۔

"سلام علیکم۔ بڑی چچی، شب بخیر"

لڑکی کے رخصت ہونے کے بعد زہرہ پر اس کی اپنی جوانی کی یادوں نے یلغار کر دی۔ مشکل سے ہی کوئی دن ایسا گزرتا جب ماضی کا کوئی واقعہ اس کے ذہن پر نہ ابھرتا۔ غرناطہ کی مہیب تنہائی میں اس نے اپنی زندگی کے تین چار خوشگوار برسوں پر غور کیا وہ انہیں یاد کرتی اور قلمبند بھی کرتی۔ لیکن بنو حزیل میں واپسی سے تین روز پہلے اس نے بھی زی منس کی طرح چھوٹی سی آتشبازی میں سب کچھ جلا دیا۔ اسے احساس تھا کہ اس کی زندگی میں سوائے اس کے کسی کو کوئی دلچسپی نہیں اور وہ موت کے قریب پہنچ چکی ہے۔ اسے یہ خیال نہیں آیا کہ اپنی زندگی کی یادوں کو یوں مٹا کر وہ ایک پورے طرز زندگی کو آگ کی نذر کر رہی تھی۔

اسے اپنے گھر آنے پر واقعی خوشی تھی اور وہ یہ دیکھ کر خوش تھی کہ عمر اور اس کا کنبہ وہاں رہ رہا ہے۔ برسوں اس نے اپنے جذبات کو دبائے رکھا۔ جان بوجھ کر خود کو سب عزیزوں سے دور رکھا اور اسے لگا کہ اب اس کی شفقتوں کے بند کھل گئے تھے۔ جب وہ تنہا ہوتی تو اس کی زندگی کی درد بھری یادیں اسے گھیر لیتیں۔ مثلاً۔ آج رات کے کھانے پر ابن زیدون سے ملاقات۔ اپنے آپ پر بہت جبر کرنے کے باوجود ضبط کا دامن اس کے ہاتھ سے نکلا جا رہا تھا اور آج جب اتنے برسوں کے بعد اس پر نظر پڑی تو اس کا دل پنجرے میں

بند پنچھی کی طرح پھڑپھڑا رہا تھا۔ جب گھروالوں نے بڑی سمجھداری کے ساتھ انہیں پودینے کی چائے پینے کے لئے تنہا چھوڑ دیا تو وہ اس سے بات کرتے ہوئے جھجک رہی تھی۔ یہاں تک کہ جب اس نے اسی مانوس آواز میں جسے سنتے ہوئے اس کا جی نہیں بھرتا تھا بتایا کہ وہ ہر ہفتہ اسے لمبے لمبے خط لکھتا رہا ہے تب بھی نہ جانے کیوں اس نے کسی تاثر کا اظہار نہیں کیا وہ سوچ رہی تھی کہ کیا یہی وہ شخص ہے جس کے لئے اس نے زندگی تباہ کر دی۔

اس نے اس کے جذبات کی ٹھنڈک کو محسوس کیا اور ادب سے جھکتے ہوئے کہا کہ اس کی محبت کبھی ختم نہیں ہوئی۔اس نے کبھی کسی دوسری عورت کی طرف دیکھا تک نہیں کہ ہر روز وہ اس دکھ کو محسوس کرتا رہا زہرہ پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ اس تلخی کو بھلا نہیں سکی جو اسے اس وقت محسوس ہوئی تھی جب اس نے غلام زادہ کی حیثیت سے رتبوں کے فرق کو محسوس کرتے ہوئے اسے اس کی اعلی نسبی کے حوالے کر دیا تھا۔ یہ غصہ قید تنہائی کے دوران کچھ کم ہو گیا تھا اور اس کی جگہ چوری چھپے ملنے اور جوانی کی ہیجانی یادوں نے لے لی تھی۔ لیکن یہ غصہ اندر ہی اندر پلتا رہا تھا اور اس کے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ اس خیال سے وہ کچھ خوش ہوئی۔ اتنے عرصہ تک محبت کے کڑوے گھونٹ پینے کے بعد وہ اب آزاد تھی۔ اس نے سوچا کہ اگر بیس برس پہلے وہ اس سے ملتی تو کیا اتنی آسانی سے اس سے چھٹکارا حاصل کر سکتی تھی۔

ابن زیدون جانتا تھا کہ ان کا مصنوعی رشتہ ٹوٹ چکا تھا۔ جب وہ آداب وتسلیمات کے بعد رخصت ہوا تو اس نے زہرہ کی آنکھوں میں لاتعلقی جھلکتی دیکھی اور اسے یہ اچھا نہیں لگا۔ وہ خالی خالی محسوس کرنے لگا۔ اس نے سوچا کہ اس منحوس گھر میں اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوں کہ میری ماں یہاں کام کرتی تھی اور اپنی خدمات کا صلہ اسے موت کی صورت میں ملا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ زہرہ کے سامنے یہ احساس اس پر غالب آیا تھا۔

زہرہ نے اپنے سفید بالوں کے جوڑے کو کھولا۔ وہ کسی اژدھے کی طرح اس کی کمر تک لہرا کر گر گئے' اس نے خاص طور پر آج اچھا لباس پہنا تھا اور سب اسے دیکھ کر مبہوت ہو گئے تھے۔ وہ کچھ یاد کر کے اپنے پوپلے منہ سے ہنسی اور شال سے بروچ اتارا۔ یہ ہیرا اسمی کا دیا ہوا تحفہ تھا۔ کسی احمق نے اسے بتایا تھا کہ یہ جسم سے لگا رہے تو ہر قسم کے پاگل پن کو ٹھیک کر سکتا ہے۔

خوبصورت' بدقسمت اسمی! زہرہ کو وہ دن یاد آیا جب اس کے باپ کا قافلہ قرطبہ سے واپس آیا تھا۔ وہ اور عبداللہ بیرونی احاطہ کے باہر دروازے کے پاس کھڑے تھے اور

حیران تھے کہ کیا ہونے والا ہے؟ انہوں نے اپنی خالہ' جواب ان کی ماں تھی' کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا۔ انہیں احساس تھا کہ ابن فرید کے ایک عیسائی عورت کو ڈال لینے کی وجہ سے وہ بہت غمگین تھی۔ اسمی کو دیکھ کر فوری طور پر وہ دھک سے رہ گئے تھے۔ وہ اتنی چھوٹی اور معصوم نظر آ رہی تھی۔ اس کا قد درمیانہ تھا۔ لیکن مضبوط اور بہت موزوں۔ اس معصوم چہرے کے نیچے ایک بہت ہی پرکشش جسم تھا۔ اس کی جلد دودھ کی طرح صاف تھی لیکن اس کا رنگ آڑوؤں جیسا تھا اور منہ لگتا تھا کہ اناروں سے رنگا ہوا ہے۔ گھنے سیاہ بالوں کے نیچے دو شرمیلی آنکھیں جو کچھ سہمی سہمی سی لگتی تھیں انہیں اندازہ ہو گیا کہ ابن فرید کے دل پر کیا گزری ہو گی۔

"تمہیں میرے والد سے کس طرح محبت ہو سکتی ہے"؟ زہرہ نے کچھ عرصہ بعد میکال کی ولادت سے پہلے اس سے پوچھا تھا۔ بڑھیا ان قہقہوں کو یاد کر کے مسکرائی جو اس کے سوال کا جواب تھے۔ اسمی کے گالوں پر گڑھے پڑ گئے۔ لیکن اس نے خود کو سنبھالا۔" تم جاننا چاہتی ہو کہ یہ کیسے ہوا؟" اس نے پوچھا۔"ہاں'ہاں" زہرہ بڑے اشتیاق سے چلائی۔ اس کا خیال تھا کہ کچھ چٹ پٹی رومانوی داستان ہو گی۔ اس کے رتج خارج کرنے کا انداز ایسا تھا کہ مجھے وہ باورچی خانہ یاد آ گیا جہاں میری ماں کام کرتی تھی۔ مجھے لگا کہ بالکل گھر کی سی بات ہے اور اسی وجہ سے وہ مجھے اچھا لگنے لگا" زہرہ پہلے تو حیران ہوئی اور پھر بے یقینی سے ہنس پڑی۔ اسمی کو اندازہ بھی نہیں تھا کہ یوں اس نے ابن فرید کی قوی ہیکل سنجیدہ شخصیت کو ایک جیتے جاگتے انسان میں تبدیل کر دیا تھا۔

زہرہ نے بھیڑ کی اون سے بھرا ہوا خوبصورت ریشمی لحاف کھینچا۔ نیند کا دور دور پتہ نہیں تھا' لگتا تھا کہ ابن زیدون کو ذہن سے نکال کر اب وہاں دوسروں کے لئے جگہ بن گئی تھی۔ اب اس کا باپ اس کے سامنے آیا۔ کسی پرہیبت سخت مزاج سردار کی طرح نہیں جو اپنی بات منوانے پر مصر ہو اور اسے حکم دے کہ یا محبت سے توبہ کر لے یا سزا بھگتے۔ بلکہ ایک مہربان جن کی طرح' اس کے ساتھ ہنستا کھیلتا ہوا' اسے شہسواری سکھاتے ہوئے تاکہ وہ عبداللہ کے ساتھ گھوڑا دوڑا سکے۔ اس میں کتنا تحمل تھا وہ اس سے کتنی عقیدت رکھتی تھی۔ اسی ہفتہ میں اس نے اسے تیراندازی بھی سکھائی تھی۔ اس کے ایک ہفتہ بعد تک اس کا کندھا دکھتا رہا تھا۔ وہ اس پر ہنستا تھا ۔ پھر میکوئل پیدا ہوا اور ابن فرید محبت کی اس نشانی پر خوش تھا اور زہرہ اور عبداللہ کو بھول گیا تھا۔ اس نے سوچا کیا معلوم اگر وہ ہمیں یوں نظر انداز نہ کرتا تو شاید میں ابن زیدون کے سحر میں نہ آتی اور عبداللہ کو گھوڑ دوڑ کی

ایسی لت نہ لگتی۔

اچانک اس کے ذہن پر ایک نوجوان عورت کی تصویر ابھری۔ زہرہ کو اب بالکل یاد نہیں۔ لیکن یہ چہرہ بہت مانوس ہے۔ اس کی پیشانی عبداللہ جیسی ہے اور آنکھیں اس کی اپنی آنکھوں کی طرح یہ یقیناً ان کی ماں کا چہرہ تھا۔ زہرہ بڑے کرب سے چلائی۔ ”میں کب سے آپ کی راہ دیکھ رہی ہوں تمہیں جلد ہی آنا ہے۔ ابھی کیوں نہیں آجاتیں؟ اب مزید انتظار کا دکھ مجھ سے سہا نہیں جاتا۔

”چچی زہرہ! چچی زہرہ!“

اس نے آنکھیں کھولیں اور زبیدہ کے پریشان چہرے کی طرف دیکھا۔

”آپ کے لئے کچھ لاؤں؟“

زہرہ دھیمے سے مسکرائی اور سر کے اشارے سے منع کیا۔ پھر کچھ یاد کر کے اس نے ہیرے کا بروچ اٹھایا اور زبیدہ کو دیا۔

”میرا وقت آگیا ہے۔ یہ تمہاری بیٹی ہند کے لئے ہے۔ اچھی طرح دیکھ لو کہ وہ قاہرہ کے نوجوان کو چاہتی ہے۔ پھر ان کو شادی کرنے دو۔ عمر سے کہنا یہ اس کی چچی کی آخری خواہش تھی۔

”چچا میگوئل کو بلاؤں؟“ زبیدہ نے آنسو پونچھتے ہوئے پوچھا۔

”اسے آرام سے سونے دو۔“ وہ میری تجہیز و تکفین کی کوشش کرے گا۔ لیکن میں ایک مسلمان کی موت مرنا چاہتی ہوں۔ عامرہ سے کہنا مجھے پرانے طریقہ کے مطابق باقاعدہ غسل دے۔“

زبیدہ زہرہ کے ہاتھ پیر دبا رہی تھی۔

”آپ کے پاؤں انگاروں کی طرح جل رہے ہیں۔ کیا کبھی کسی نے سنا ہے کہ مرنے والے کے پیر گرم ہوں؟“

”تم بھی کتنی بچی ہو۔ زبیدہ“ اس کی چچی نے اپنی کمزور آواز میں کہا۔ ”کیا تم نے کبھی ان معصوموں کے متعلق نہیں سنا جنہیں زندہ جلا دیا جاتا ہے؟“

زبیدہ کے دہلنے پر زہرہ ہنسی۔ زبیدہ کو بھی ہنسی آگئی۔ ایک دم سے ہنسی غائب ہو گئی اور اس کی روح پرواز کر گئی۔ زبیدہ نے بزرگ خاتون کو سینہ سے لگایا اور زور سے اس کے ساتھ لپٹ گئی۔

”ابھی نہیں۔ چچی زہرہ۔ اتنی جلدی ہمیں چھوڑ کر نہ جاؤ“

کوئی جواب نہیں آیا۔

باب 8

اگلے ہی روز زہرہ کو دفن کر دیا گیا۔ طلوع آفتاب سے بہت پہلے عامرہ نے اسے بڑی عقیدت اور احترام کے ساتھ غسل دیا۔ ابھی باد سحر کے جھونکوں نے سورج کی پہلی کرن کو چھوا بھی نہیں تھا کہ کام ختم ہو گیا تھا۔

”زہرہ۔ تم مجھ سے یہ کیوں کرانا چاہتی تھیں؟ یہ میری آخری سزا تھی؟ یا یہ دوستی کا آخری اظہار تھا؟ اگر تم نہ ہوتیں تو بی بی‘ میں اس پہاڑوں والے شخص سے شادی کر لیتی جو اب بڑی ہواؤں میں رہتا ہے اور خود کو زندیق کہتا ہے۔ اب تک تین بچے بھی ہو گئے ہوتے‘ یا شاید چار! میں اسے خوش کر دیتی۔ میں بھی کیا پاگلوں کی سی باتیں کر رہی ہوں؟ معاف کرنا۔ شاید اللہ کی یہی مرضی تھی کہ ہم علیحدہ رہیں۔ دیکھو! اب تمہارا بھی آخری وقت آگیا ہے۔ میں بہت خوش ہوں کہ تم یہاں واپس آگئیں۔ غرناطہ میں وہ تمہیں صندوق میں بند کرتے اور تمہاری قبر پر ایک صلیب لگا دیتے۔ جنت میں ابن فرید سے ملاقات ہوتی تو وہ کیا کہتا۔ اوہ!“

سفید کفن میں لپٹی ہوئی زہرہ کی میت بستر پر پڑی تھی۔ اس کی موت کی خبر گاؤں میں پہنچ گئی تھی اور جلاہوں اور کسانوں میں وہ کس قدر مقبول تھی کہ ایک رئیس زادی ہوتے ہوئے وہ محبت کی خاطر انہی میں سے ایک سے شادی کرنے کو تیار تھی۔ وہ دوڑتے ہوئے اس کے گھر آئے۔ صبح سویرے‘ کام شروع کرنے سے پہلے ہی وہ اس سے اپنی عقیدت کا اظہار کرنا چاہتے تھے اور اس کی تدفین میں شریک ہونا چاہتے تھے۔

چار آدمیوں نے آہستہ سے تابوت کو ہاتھوں سے اٹھا کر اپنے مضبوط کندھوں پر رکھا سرہانے کی طرف عمر اور زہیر تھے جبکہ ابن داؤد اور بونے کا نوجوان بیس سالہ بیٹا پائنتوں

کی طرف تھے۔ زندیق اور میگوئل درمیان میں چل رہتے تھے۔ وہ ضعیفی کی وجہ سے کاندھا نہیں دے سکتے تھے۔ لیکن وہ مرحومہ کے اس قدر قریب تھے کہ اسے صرف نئی نسل پر نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ یزید اپنے باپ کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ اسے بزرگ خاتون اچھی لگتی تھی۔ لیکن چونکہ وہ اس سے زیادہ مانوس نہیں تھا اس لئے ہند کی طرح غمگین نہیں تھا۔

عورتیں پہلے ہی آہ وبکا کر چکی تھیں۔ صبح سویرے ہی زہرہ کی یاد میں بین کر کر کے عامرہ نے سارے گھر کو اٹھا دیا تھا۔ ہند کی آنکھوں سے دکھ کے دریا بہہ رہے تھے اور وہ زبیدہ کی آغوش میں آ گئی تھی۔ ان سب نے اس کی انسان نوازی کی باتیں کیں۔ اس کا بچپنا' پھر اس کی جوانی اور اس کے بعد ایک خاموشی۔ قرطبہ میں اس پر کیا گزری اس کا کوئی ذکر کرنا نہیں چاہتا تھا یا یہ کہ اس کی زندگی کا زیادہ حصہ غرناطہ میں مارستان کے اندر گزرا تھا۔

جنازے کو جان بوجھ کر آہستہ آہستہ لے جایا جا رہا تھا۔ گھر کی پتھریلی دیوار کے باہر ان کا خاندانی قبرستان تھا۔ زہرہ کو عزیزوں کے قریب ہی دفن کرنا تھا۔ اس کی ماں بی بی نجمہ کے برابر ہی اس کے لئے جگہ چن لی گئی تھی۔ اس کی ماں زہرہ کی پیدائش کے چند روز بعد ہی انہتر برس پہلے انتقال کر چکی تھی۔ اسے پام کے ایک درخت کے نیچے دفن کیا گیا تھا۔ اس کے دوسری طرف ابن فرید تھا۔ اس کا باپ جس سے وہ بہت محبت اور سخت نفرت کرتی تھی۔ حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ کے ماننے والوں کی تجہیزوتدفین سادگی کے ساتھ ہو اور اسی کے مطابق کسی قبر پر کوئی کتبہ نہیں تھا۔ بنو حزیل کا دعویٰ تھا کہ وہ ایک صحابی رسولؐ کی نسل میں سے تھے اور یہ بات صحیح ہو یا نہ ہو اس سے قطع نظر وہ اس دستور پر قائم تھے کہ ان کی قبریں سادہ ہوں۔ اس سے زیادہ نہیں۔ یہ ہاتھوں سے بنائی ہوئی چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں بڑی احتیاط کے ساتھ گھاس سے ڈھانپی گئی تھیں اور اس میں جنگلی پھول چمکتے تھے۔

زہرہ کو تابوت سے اٹھا کر تازہ تیار کی ہوئی قبر میں اتارا گیا۔ پھر میگوئل نے خود کو میکال سمجھتے ہوئے مٹھی میں مٹی بھری اور بہن کی میت پر ڈال دی اور ہاتھ اٹھا کر دعا پڑھی۔ ہر شخص نے اس کا ساتھ دیا۔ پھر ہر سوگوار نے عمر بن عبداللہ کو گلے سے لگایا اور سب رخصت ہو گئے۔ اسے تب ہی اپنے عیسائی ہو جانے کا احساس ہوا جب یوآن نے صلیب کا نشان بنایا۔ وہ عقیدت سے جھک کر دعا کرنے لگا۔

قرطبہ کا بشپ کافی عرصہ تک اسی صورت میں رہا ہو گا اس لئے کہ جب اس نے آنکھیں کھولیں تو وہ قبر کے پاس تنہا کھڑا تھا۔ اس وقت جیسے اس کے صبر کا بند ٹوٹ گیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ مدتوں کا دبا ہوا دکھ ابل پڑا تھا۔ اس کی آنکھوں سے دو فوارے پھوٹ پڑے اور اس کے گالوں سے ہوتے ہوئے داڑھی میں جذب ہو گئے۔ میگوئل اچھی طرح جانتا تھا کو جو بھی زندہ ہے اسے مرنا ہے۔ زہرہ انہتر برس کی ہو چکی تھی۔ خدا سے ابھی کسی گلہ کا موقع نہیں تھا۔

بہن کی اچانک موت نے اسے اس طرح ہلا کر رکھ دیا جیسے برسوں پہلے جب وہ اسے الوداع کہے بغیر گھر سے چلی گئی تھی۔ وہ اسے بتانا چاہتا تھا کہ اس شرمناک واقعہ کے بعد اس پر کیا بیتی۔ کس طرح اس کے جذبات بھڑک اٹھے اور اس نے دیرینہ مقدس روایات کو ٹھکرا دیا اور ہولناک نتائج کی پروا نہیں کی۔ وہ پہلی بار اس سے اسی کی موت کے متعلق بات کرنا چاہتا تھا۔ وہ موت جس نے اس سے اس کو چھین لیا تھا جو اس کے دکھوں اور مصیبتوں کی ذمہ دار تھی۔ احساس جرم اب بھی تہہ در تہہ اس کے اندر کہیں چھپا ہوا تھا۔ پرانا گھرانا بکھر گیا تھا اور نئے جانشین پیدا ہو گئے تھے۔ گزشتہ تین روز سے وہ صرف یہی سوچ رہا تھا۔ میگوئل کو اب احساس ہو رہا تھا کہ وہ بھی خاندان کے اس آخری فرد سے کچھ بات کئے بغیر مر جائے گا۔ یہ خیال بہت ہی تکلیف دہ تھا "یہ سب کچھ اس وقت ہوا۔ زہرہ جب تم ہمیں ذلیل کر کے چلی گئی تھیں" میگوئل نے آہستہ سے گلہ کیا۔ "اگر تم ٹھہر جاتیں تو یہ سب کچھ نہ ہوتا۔ تم سچائی اور شفقت کو بھی اپنے ساتھ لے گئیں۔ ہمارے پاس صرف خوف' پشیمانی اور نفرت رہ گئی۔ تمہارے جانے سے ہم سب کے چہرے مسخ ہو گئے۔ میرا خیال ہے کہ ہمارے والد بھی اسی دکھ میں چل بسے۔ وہ مانتے نہیں تھے لیکن انہیں تمہاری جدائی کا بہت دکھ تھا۔ اب تقریباً آدھی صدی گزر گئی ہے اور میں نے کبھی بھی کسی سے بھی یہ باتیں نہیں کیں۔ میرا یہ ڈوبتا ہوا دل تمہارے سامنے صفائی پیش کرنا چاہتا تھا۔ میں کسی دن تم سے بات کرتا۔ تم میری بہن چلی گئیں۔ مر گئیں اللہ تم پر رحمت کرے۔"

جیسے ہی وہ اٹھا اور اس نے اس خطہ زمین کو دیکھا جس میں اس کی بہن چھپ گئی تھی تو ایک مانوس آواز نے اس کو چونکا دیا'

میں نے اس سے بات کی تھی۔ جناب عالی"

"ابن زیدون!"

"میں قبر کی دوسری طرف آنسو بہا رہا تھا۔ آپ نے مجھے دیکھا نہیں"۔

دونوں گلے ملے۔ زندیق نے میگوئل کو بتایا کہ کس طرح زہرہ نے آخر میں اسے ٹھکرا دیا تھا۔ کس طرح قبیلہ جزیل کی غیرت نے اپنی بھٹکی ہوئی بیٹی کو واپس اپنی آغوش میں لے لیا۔ اصلیت کس طرح ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو گئی۔ کس طرح اپنی موت سے ہفتوں پہلے وہ اپنی محبت کو یاد کر کے تڑپتی رہی۔ کس طرح اسے یہ احساس ہوا کہ اس کی مصیبتیں زیادہ تر اس کی اپنی پیدا کی ہوئی تھیں۔ اسے ابن فرید سے جدا ہونے کا کتنا دکھ تھا۔ خاندان سے کٹ جانے کا کس قدر افسوس تھا۔ وہ ان سب باتوں کے لئے خود کو ذمہ دار سمجھتی تھی۔

"میں سب کچھ جانتا تھا" میگوئل نے کہا "اس کی زندگی میں باپ کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی" میگوئل کو اس انکشاف سے جس قدر خوشی ہوئی اتنا ہی زندیق کو دکھ ہوا۔ بشپ اور ملحد کچھ دیر ساکت رہے اور ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ ایک زمانے میں ایک ہی ڈوبتی ہوئی تہذیب کے رکن تھے۔ لیکن اب دونوں کی دنیاؤں کے درمیان ایک خلیج حائل ہو گئی تھی۔ وہ عورت جس نے ان کے درمیان فاصلے کم کرنے کی کوشش کی تھی اور جس کی اسے سزا ملی تھی چند قدم دور زمین کے نیچے پڑی تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ اپنی زندگی کے آخری دنوں میں دوبارہ خاندان میں شامل ہونے سے اس کے بھائی کو بڑا اطمنان ہوا تھا۔ زندیق کے لئے اداس اور دکھی زندیق کے لئے یہ اندلس کے اس گہرے طبقاتی خلا کی علامت تھی جس نے پیغمبر کی امت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا۔ وہ اپنی ابتدائی فتوحات پر کوئی مستقل تعمیر قائم نہ کر سکے۔

"اب تو بس یہ رہ گیا ہے" زندیق نے خود سے سرگوشی کی "ہمارے کلیسائی عدالت کے سپرد کر دیا جائے۔ ہاں اور ہڈیوں کی گہرائی تک"

میگوئل نے یہ جملے سنے لیکن خاموش رہا۔

جس وقت یہ دونوں گھر کو لوٹ رہے تھے۔ ایک عزیزوں کے پاس اور دوسرا باورچی خانہ میں ناشتہ کے لئے تو اسی وقت زہیر غرناطہ کے لئے روانہ ہو رہا تھا۔ وہ گھوڑے پر سوار خاصی تیز رفتاری سے جا رہا تھا۔ لیکن اس کا خیال انہی کے ساتھ تھا جنہیں وہ پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ چھوٹے بھائی سے جدائی اسے سب سے زیادہ شاق گزری تھی۔ یزید جیسے کسی غیبی طاقت کے زیر اثر محسوس کر رہا تھا۔ کہ وہ اب دوبارہ اپنے بھائی کو نہیں دیکھے گا۔ وہ بڑے زور سے زہیر سے بغلگیر ہوا اور روتا رہا۔ اس نے منتیں کیں کہ وہ غرناطہ میں موت کے منہ میں نہ جائے۔ اس ملاقات پر گھر کے سب لوگوں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بونا بھی رو

پڑا۔ اس پر یزید کو حیرانی ہوئی اور وہ کچھ دیر کے لئے اپنا دکھ بھول گیا۔

"مجھے یہ سرخ مٹی ہمیشہ یاد رہے گی" گاؤں سے گزرتے ہوئے خالہ کی ایال کو تھپکتے ہوئے اس نے سوچا جب وہ ایک پہاڑی کی چوٹی پر پہنچا تو اس نے گھوڑے کو لگام دی اور مڑ کر الحزیل پر نظر کی۔ سفیدی کئے ہوئے گھر روشنی میں چمک رہے تھے اور ان سے پرے بڑے بڑے پتھروں سے بنی ہوئی اس گھر کی دیواریں تھیں جہاں وہ پیدا ہوا تھا۔

"میں تمہیں ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ آج کی طرح سردی کی دھوپ میں بہاروں میں جب شگوفوں کی خوشبو جذبات کو ابھارتی ہے اور گرمیوں کی تپش میں جب ایک بوند کے گرنے کی آواز ذہن کو سکون دیتی ہے اور حواس میں خنکی پیدا کرتی ہے۔ پھر بارش کے کچھ قطرے گرتے ہیں۔ مٹی بیٹھ جاتی ہے اور یاسمین کے پھولوں کی مہک پھیلنے لگتی ہے۔ "میں پہاڑی چشموں کے اس پانی کا ذائقہ یاد رکھوں گا جو ہمارے گھر سے ہو کر گزرتا ہے۔ وہ گہرے زرد جنگلی پھول جو جھاڑیوں پر لہراتے ہیں۔ پہاڑوں کی تیز ہوا جو پائن اور پام کے جھومتے ہوئے درختوں میں سے چھن چھن کر آسمان سے آتی ہے۔ خود رو پودوں کی خوشبو اور سردیوں میں دہکتے الاؤ سے اٹھتی خوشبو اور پھر کس طرح گرمیوں کے صاف آسمان پر ایک صبح اچانک گہرا اندھیرا چھا جاتا ہے اور یزید اپنے ہاتھ میں پرانا خاندانی شیشہ لئے جو ہمارے پردادا کی ملکیت تھا پرانے مینا کے باہر سیڑس پر کھڑے ہو کر بے تابی سے پہلے ستارے کے نمودار ہونے کا انتظار کرتا ہے۔ وہ وہاں سے اس وقت تک کائنات کا جائزہ لیتا رہتا ہے۔ جب تک والدہ یا اماں اسے سیڑھیوں سے گھسیٹ کر بستر پر نہ لٹا دیں۔

"یہ سب کچھ" زہیر نے خود سے کہا "ہمیشہ میرے دل کو گرماتا رہے گا۔"

اس نے لگام کھینچی اور الحزیل سے منہ موڑ کر آہستہ سے گھوڑے کو ایڑھ لگائی جس سے گھوڑا تیزی سے غرناطہ کی طرف جانے والی سڑک پر دوڑنے لگا۔

زہیر کی پرورش بہادری اور جوانمردی کی الف لیلوی داستانوں پر ہوئی تھی۔ اس کے سامنے ابن فرید کی مثال تھی جس کی تلوار وہ اس وقت لئے ہوئے تھا اور بڑی اہم ذمہ داری محسوس کر رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ زمانے اب نہیں رہے۔ لیکن ایک آخری جنگ کا رومانس ان دیکھے راستوں کا سفر، دشمن پر اچانک جھپٹ پڑنے اور ایک آدھ فتح حاصل کرنے کا خیال اس کی سائیکی میں رچا ہوا تھا۔ یہی وہ خیال تھا جس نے اس کو ایسے جذباتی فیصلہ پر اکسایا

لیکن جیسا کہ وہ خود اپنے آپ سے اور اپنے دوستوں سے کہتا رہا تھا اس کا یہ اقدام

محض ماضی کے افسانوں یا مستقبل کے خوابوں کا پروردہ نہیں تھا۔ عمر اور زبیدہ کی اولاد میں ہو سکتا ہے زہیر سب سے سمجھ دار نہ ہو لیکن وہ یقیناً سب سے زیادہ جذباتی تھا۔

ابھی اس کی عمر بیس سے آدھی بھی نہیں ہوئی تھی کہ الحامہ کی تباہی اور اس پر عیسائیوں کے قبضہ کی خبر آئی۔ الحامہ' حماموں کا شہر' جہاں وہ ہر سال دوبار اپنے قریبی عزیزوں سے ملنے جاتا تھا۔ ان کے لئے حمام اور ان میں چشا ہوا گرم پانی ایک معمول کی بات تھے۔ زہیر کے لئے ان مشہور چشموں پر جانا جہاں خود سلطان غرناطہ بھی غسل کرتا تھا ایک خاص لطف کی بات تھی۔ وہ سب مر گئے تھے۔ سب مرد' عورتیں اور بچے قتل کر دیئے گئے تھے اور ان کی لاشیں شہر سے باہر کتوں کے آگے ڈال دی گئی تھیں۔

کاسٹیلین خون میں ڈوب گئے تھے اور اگر ان کے اپنے بیانات صحیح تھے تو وہ اس پر خوش بھی تھے۔ غرناطہ کی پوری سلطنت یہاں تک کہ پادری بھی اس قتل عام پر دم بخود رہ گئے تھے۔ گاؤں سے آہ و بکا کی آوازیں آ رہی تھیں۔ لوگ نماز جنازہ کے لئے مسجد کی طرف بھاگ رہے تھے اور انتقام کی باتیں کر رہے تھے۔ اس دن زہیر کو صرف اپنے وہ رشتہ کے بھائی یاد آ رہے تھے جن کے ساتھ وہ کھیلتا تھا۔ یہ سوچ کر اسے بہت دکھ ہوا کہ اس کے ہم عمر دو لڑکے اور ان کی تین بڑی بہنوں کو بے دردی سے قتل کر دیا گیا تھا۔ اس خبر کا اعلان کرتے ہوئے اس کے باپ کا متفکر چہرہ اسے یاد آیا! "انہوں نے ہمارے خوبصورت الحامہ کو تباہ کر دیا ہے۔ غرناطہ کی کنجی اب فرڈیننڈ اور ازابیلا کے ہاتھ آ گئی ہے۔ اب ہمارے شہر پر قبضہ میں انہیں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔

زہیر یادوں کی گہرائیوں میں اتر گیا اور اسے پرانی آوازیں آنے لگیں۔ جب الحامہ کے قتل وغارت کی خبر محل میں پہنچی تو وہاں جو ردعمل ہوا ابن حد اس کی تفصیلات بتا رہا تھا۔ زہیر کے ذہن پر بوڑھے سلطان ابوالحسن کی تصویر ابھری۔ اس نے صرف ایک بار ہی اسے دیکھا تھا۔ جب وہ دو یا تین سال کا تھا۔ لیکن اسے وہ چہرہ کبھی نہیں بھولا جس پر گزرے ہوئے وقتوں کی دھول تھی اور خراشیں پڑی ہوئی تھیں اور اس کی سفید داڑھی نفاست سے ترشی ہوئی تھی۔ یہی وہ عمر رسیدہ شخص تھا جس کے زہرہ کے شہر پر جرأتمندانہ لیکن احمقانہ حملہ اور قبضہ کے جواب میں عیسائیوں نے الحامہ پر چڑھائی کی تھی وہ اپنے سپاہیوں کو لے کر شہر کی حفاظت کے لئے بڑھا۔ لیکن اسے دیر ہو گئی۔ عیسائی سرداروں نے اسے پسپائی پر مجبور کر دیا۔ سلطان نے سارے غرناطہ میں منادی کرائی۔ نقارے بجا کر لوگوں کو متوجہ کیا گیا۔ لوگ سڑکوں پر جمع ہونا شروع ہو گئے۔ لیکن منادی نے صرف ایک فقرہ بولا: افسوس۔

الحامہ"

ان مظالم کو یاد کر کے زہیر کا خون کھول گیا اور اس قتل عام کی یاد میں جو نغمہ ترتیب دیا گیا وہ اسے گنگنانے لگا:

عرب سلطان غرناطہ سے گھوڑے پر سوار گزر رہا تھا
باب الابیرا سے باب الرملا کی طرف
اس کو خبر دی گئی۔ الحامہ پر قبضہ ہو گیا
افسوس الحامہ...
اس نے خطوط آگ میں ڈال دیئے اور قاصد کو قتل کر دیا
اس نے اپنے بال کھینچے اور غصہ سے داڑھی نوچی
وہ خچر سے اترا۔ گھوڑے پر چڑھا اور زکاتین سے ہوتا ہوا
الحمرا کی طرف چلا۔
اس نے بلند آواز میں نفیریاں بجائیں۔ اپنی چاندی کی نفیری بھی
تاکہ وہ عرب جو کھیتوں میں کام کر رہے ہیں اس کی پکار سن لیں
افسوس الحامہ۔
چار چار' پانچ پانچ کر کے ایک مجمع اکٹھا ہو گیا
ایک بزرگ دانا جس کی گھنی داڑھی سفید ہو گئی تھی۔ بولا:
"تم ہمیں کیوں آواز دیتے ہو۔ سلطان؟ تمہارے نقارے کیا کہہ رہے ہیں؟"
"اس لئے کہ دوستو تم میری بات سنو"۔ الحامہ کی بربادی کی بات
افسوس الحامہ"
"نیک سلطان تمہاری یہی سزا ہے۔ اچھے بادشاہ تم اسی کے مستحق تھے
تم نے وہ شہزادے قتل کر دیئے جو غرناطہ کے پھول تھے۔
تم نے قرطبہ کے غداروں کو اپنے ساتھ ملایا
اور اس لئے اے بادشاہ تم اسی بڑی سزا کے مستحق ہو۔
تم بھی تباہ ہو اور تمہاری سلطنت بھی
اور پھر جلد ہی غرناطہ کا خاتمہ
افسوس الحامہ۔"

اس نظم سے اس کے مرحوم کزن اس کے سامنے آ گئے۔ ان کی ہنسی اس کی آنکھوں میں

کھنکھنانے لگی۔ لیکن یہ خوشگوار یاد زیادہ دیر قائم نہ رہ سکی۔ اسے اب ان کی ٹکڑے ٹکڑے لاشیں نظر آئیں اور وہ سن ہو گیا۔ دوسری طرف جیسے اس نے اپنے گھوڑے کو تیزی سے دوڑایا اس کے اندر غیض وغضب اور حقارت کے جذبات ابھرتے رہے۔ پھر اس نے محسوس کیا اور اس نے ابن فرید کی تلوار کو میان سے نکالا۔ اس نے تلوار کو سر کے اوپر اٹھایا اور اسے لگا جیسے عرب شہہ سواروں کے دستے کی کمان اس کے ہاتھ میں ہے اور وہ الحامہ کو آزاد کرانے کے لئے جا رہا ہے۔

"لاالٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ" زہیر نے بھرپور نعرہ لگایا' اپنی آواز کی زبردست گونج سے وہ حیران ہو گیا۔ لیکن یہ گونج درجنوں آوازوں کی تھی اس نے لگام کھینچی۔ گھوڑا اور سوار دونوں ساکت ہو گئے' اس نے آہستہ سے تلوار کو میان میں رکھا۔ دور سے گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز سنائی دی اور پھر دھول اڑنے لگی۔ یہ کون لوگ ہیں؟۔ ایک لمحہ کے لئے اسے خیال گزرا کہ یہ عیسائی سپاہی ہوں گے۔ جنھوں نے اسے دھوکے سے گھیرنے کے لئے اس کے نعرہ کا جواب دیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ پوری سلطنت میں کوئی گھوڑا اس سے تیز نہیں دوڑا سکتا۔ لیکن یہ بزدلی ہو گی اور آداب جنگ کے خلاف بھی کہ وہ فرار ہو جائے۔ وہ ان کے قریب آنے کا انتظار کرتا رہا اور حتیٰ کہ وہ اس کے پاس آ گئے۔ اسے یہ دیکھ کر بہت اطمنان ہوا کہ سب نے عمامے پہنے ہوئے تھے اور ہر ایک پر ہلال جڑا ہوا تھا۔ ان کے لباس کچھ عجیب سے تھے لیکن ابھی زہیر اس پر غور کر ہی رہا تھا کہ ایک اجنبی نے جو عمر کے لحاظ سے اس جماعت کا لیڈر لگتا تھا اسے مخاطب کیا۔

"اسلام علیکم۔ بھائی تم کون ہو اور کدھر جا رہے ہو؟"

"میں زہیر بن عمر ہوں۔ میں قریہ الحزیل سے آ رہا ہوں اور غرناطہ جا رہا ہوں۔ ولا للہ آپ سب نبیؐ کے ماننے والے ہیں۔ تمہارے گھوڑوں کی اڑائی ہوئی دھول سے میں ڈر گیا تھا۔ لیکن آپ فرمائیں کہ آپ کون لوگ ہیں اور کس طرف جا رہے ہیں۔"

"تو آپ ابن فرید کے پوتے ہیں۔" اجنبی نے جواب دیا۔ "زہیر الفحل۔ زندیق نے ہمیں آپ کے متعلق بہت کچھ بتایا ہے"

اس پر اجنبی زور سے ہنسا اور اس کے ساتھیوں نے بھی اس کے ساتھ مل کر قہقہہ لگایا۔ زہیر بھی خوش دلی سے مسکرایا اور ایک ایک سے نظر کی۔ اب اسے احساس ہوا کہ اسے کیا چیز عجیب لگی تھی۔ ان میں سے ہر ایک کے بائیں کان میں ہلال کی شکل کا ایک چھلا لٹک رہا تھا' گو اس نے اپنے ڈر کو چھپانے کی بہت کوشش کی خوف سے اس کا خون جم

گیا۔ یہ ڈاکو تھے اور اگر انہیں پتہ لگ جائے کہ اس کے پاس اشرفیاں ہیں تو وہ اسے لوٹ لیں گے اور شاید اس کی زندگی بھی ختم کر دیں۔ بہتر ہوتا کہ وہ عیسائیوں کے ساتھ جنگ میں مارا جاتا۔ اس نے اپنا سوال دہرایا۔

"آپ کہتے ہیں کہ آپ میرے استاد زندیق کو جانتے ہیں۔ یہ جان کر مجھے خوشی ہوئی لیکن ابھی تک مجھے یہ معلوم نہیں کہ آپ کون ہیں اور آپ کا مقصد کیا ہے۔"

"ہم اس علاقہ میں دور دور تک گھومتے ہیں" جواب میں بڑی بے تکلفی تھی "ہم عزت وغیرہ کے چکر سے نکل گئے ہیں اور ہمیں نہ کوئی دکھ ہے نہ فکر۔ ہم بڑھتے ہوئے طوفان کو روک سکتے ہیں۔ صدی گھوڑے کو قابو کر سکتے ہیں۔ ہم بغیر سانس لئے شراب کی پوری صراحی پی سکتے ہیں اور ہنستے ہنستے ہی پوری دنبہ ہضم کر سکتے ہیں' ملاں کی داڑھی نوچ سکتے ہیں کھل کر گا سکتے ہیں' ہمیں غیرت اور عزت کا کوئی پاس نہیں اس لئے کہ نہ ہمارے پاس غیرت ہے نہ عزت۔ ہم سب کا ایک ہی نام ہے المعری۔ اس اندھے شاعر کے نام پر جو چار سو برس پہلے حبش اور دمشق کے درمیان رہتا تھا۔ آؤ ہمارے ساتھ کھاؤ اور پیو۔ پھر تم ہمارے متعلق اور بھی کچھ جان جاؤ گے' آؤ زہیر الفحل۔ ہم تمہیں زیادہ دیر نہیں روکیں گے۔"

زہیر اس جواب سے حیران ہو گیا۔ لیکن اس کا ڈر جاتا رہا۔ وہ اتنے عجیب و غریب تھے کہ سفاک قاتل نہیں ہو سکتے تھے۔ اس نے سر ہلا کر ان کی پیشکش قبول کرنے کا اشارہ کیا۔ اور ان کے ساتھ ساتھ ہو لیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ کچھ چٹانوں کے پاس پہنچے۔ ان کو ہٹا کر بڑی احتیاط سے راستہ بنایا گیا تھا۔ اور وہ راستہ سے ہٹ کر خفیہ درے میں داخل ہو گئے۔ دس منٹ بعد وہ ایک مسلح چوکی پر پہنچ گئے۔ یہ خیموں پر مشتمل ایک گاؤں تھا۔ جنہیں عسکری ضرورت کے تحت ایک ندی کے کنارے نصب کیا گیا تھا۔ ایک خیمہ کے باہر ایک درجن عورتیں اور چھ بچے بیٹھے ہوئے تھے عورتیں آٹا پیس رہی تھیں بچے پتھروں سے کھیل رہے تھے۔

اس گروہ کا سردار جس نے اپنا تعارف ابو زیدالمعری کے نام سے کرایا۔ زہیر کو اپنے خیمہ میں لے گیا۔ خیمہ کے اندر سادہ سی چیزیں تھیں۔ صرف ایک قالین تھا جس پر کچھ بوسیدہ تکئے پڑے ہوئے تھے۔ ان کے بیٹھتے ہی ایک نوجوان عورت مشروب کی صراحی لے کر آئی۔ ساتھ دو روٹیاں بھی تھیں اور کچھ کھیرے ٹماٹر' گاجریں اور پیاز بھی۔ وہ ان چیزوں کو ان کے سامنے رکھ کر جلدی سے باہر چلی گئی اور پھر روغن زیتون سے بھرا ہوا ایک پیالہ

لے کر آئی- اب ابوزید نے اس کا تعارف زہیر سے کرایا-

"میری بیٹی فاطمہ"

"اسلام علیکم" دوشیزہ کے بے نیازانہ انداز سے مسحور ہو کر زہیر نے دھیرے سے کہا- "آپ ہمارے ساتھ کھانا نہیں کھائیں گی؟"

"میں کھانے سے فارغ ہو کر دوسروں کے ساتھ آؤں گی "فاطمہ نے زہیر کی طرف آنکھیں جھپکاتے ہوئے کہا-" میرا خیال ہے کہ میرے والد آپ سے اکیلے میں بات کرنا چاہتے ہیں-"

"تو نوجوان دوست"! جب اس کی بیٹی چلی گئی تو ابوزیدالمعری نے بات شروع کی- "یہ کوئی اتفاق نہیں ہے کہ ہم اس طرح مل گئے ہیں- بلکہ زندیق نے ہمیں ملایا ہے- تم دیکھ ہی رہے ہو کہ ہم تو امیروں کو لوٹ کر زندگی گزارتے ہیں- المعری کی تعلیمات کے مطابق ہم مسلمان عیسائی یا یہودی میں کوئی فرق نہیں کرتے- دولت کسی ایک مذہب کا اجارہ نہیں ہے- ڈرو مت- جب تم ہمارے بائیں کانوں میں چاندی کے ہلال دیکھ کر ڈرے تھے تو میں نے بھانپ لیا تھا- تمہیں ڈر تھا کہ تمہارا سونا نہ لوٹ لیا جائے- کیوں؟"

"صاف بات تو یہ ہے" زہیر نے زیتون میں روٹی ڈبوتے ہوئے اعتماد سے کہا- "مجھے اپنی زندگی کا زیادہ ڈر تھا-"

"ہاں واقعی اور تمہارا ڈر ٹھیک تھا- لیکن میں تمہیں بتانے ہی والا تھا کہ غار میں رہنے والے بوڑھے شخص نے مجھے بتایا تھا کہ تم کسی خطرناک مہم پر غرناطہ کی طرف روانہ ہوئے ہو- اس نے میری منت کی تھی کہ تمہیں روکوں اور تمہیں اپنے آبائی گھر لوٹنے یا ہمارے گروہ میں شامل ہونے پر راضی کر لوں- ہم سوچ رہے ہیں کہ اس جگہ کو چھوڑ دیں اور الپوجارہ کی طرف چلے جائیں جہاں ہمارے جیسے اور بھی ہیں- وہاں ہم مناسب موقع کا انتظام کریں گے اور جب موقع ہو گا تو ہم جنگ میں شامل ہو جائیں گے-"

"ایسے زمانہ میں" زہیر نے کشید کی ہوئی کھجوروں کا ایک گھونٹ لیتے ہوئے کہا "نئے دوست بنانا پرانی دشمنیاں برقرار رکھنے سے کہیں زیادہ مشکل ہے- تمہاری تجویز کو قبول کرنے یا رو کرنے سے پہلے میں اس پر اچھی طرح غور کروں گا-"

ڈاکوؤں کا سردار منہ ہی منہ میں ہنسا اور کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اس کی بیٹی کافی سے بھرا ہوا مٹکا لے کر اپنے تین بھائیوں کے ساتھ آئی- اس کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا- کافی کی خوشبو جسے تازہ تازہ الائچی میں ابالا گیا تھا سارے خیمہ میں پھیل گئی اور زہیر کو گھنہ

بھر پہلے اپنا چھوڑا ہوا گھر یاد آ گیا وہ آلتی پالتی مار کر قالین پر بیٹھ گئے اور فاطمہ چاء انڈیلنے لگی- ابوزید نے سب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا- "میرا خیال نہیں کہ یہ نوجوان ہم میں شامل ہو جائے گا- یہ ایک شہسوار ہے- ایک نائٹ ہے جو آداب جنگ پر عمل کرتا ہے- کیوں ٹھیک ہے؟" زہیر گھبرا گیا کہ اتنی جلدی اس کی نیت کا حال معلوم ہو گیا

"آپ ایسی باتیں کیوں کرتے ہیں- ابوزید المعری! کیا میں نے کہا نہیں کہ میں اس پر سوچوں گا؟" "میرے والد کو لوگوں کی بڑی پہچان ہے" فاطمہ بیچ میں بول پڑی- "وہ تو ایک لمحہ میں بھانپ لیتے ہیں کہ آپ کہیں شطرنج میں ایک زائد مہرہ تو استعمال نہیں کر رہے ہیں' یہ تو مجھے بھی لگ رہا ہے کہ آپ اس طرح کے انسان نہیں ہیں"

"کیا مجھے اس طرح کا ہونا چاہیۓ؟" زہیر نے گلہ کرتے ہوئے پوچھا-

"جو تلی کے لئے اچھا ہو' جگر کے لئے اچھا نہیں ہوتا" لڑکی نے جواب دیا-

اس کے بھائی نے- جو بمشکل اٹھارہ برس کا ہو گا- سوچا کہ فاطمہ کچھ زیادہ ہی ہوشیار بن رہی ہے- "میرے والد نے ہمیشہ ہمیں یہی سکھایا ہے کہ لوگ دھات کی طرح ہوتے ہیں' سونا- چاندی یا تانبہ" "ہاں! یہ صحیح ہے" ابو زید نے زور دے کر کہا- "لیکن ہو سکتا ہے کہ ایک نائٹ یہ سوچے اور وہ اس میں حق بجانب بھی ہو سکتا ہے کہ وہ سونا ہے اور ڈاکو تانبہ ہے- اب چونکہ ہم دھاتوں کی قدر وقیمت کا موازنہ کر رہے ہیں' میں الحزیل کے اس نوجوان سے ایک بات اور بھی کہنا چاہتا ہوں- کیا وہ میری اس بات سے متفق ہے کہ لوہا ہی لوہے کو کاٹتا ہے؟"

"ہاں- یقیناً "زہیر خوش تھا کہ گفتگو نے ایک نیا رخ اختیار کر لیا ہے- "اس کے علاوہ اور ہو بھی کیا سکتا ہے؟"

"اگر ہم اس پر متفق ہیں زہیر الفحل- تو پھر تم غرناطہ کے غاصبوں سے جنگ کرنے کے خلاف میرے دلائل کو نظر انداز کس طرح کر سکتے ہو- ہمارا سلطان تو محض ایک تنکا تھا اور زی منس ڈی سیسنیروس لوہا ہے- جس رات عیسائیوں نے الحامہ کو تباہ کیا اس جنگ کا پرانا انداز بدل گیا- اگر ہمیں فتح حاصل کرنی ہے تو ہمیں ان سے سیکھنا پڑے گا- مجھے معلوم ہے کہ زندیق کے خیال میں وقت ہاتھ سے نکل چکا ہے لیکن لازمی نہیں' کہ اس کا خیال ٹھیک ہی ہو- اگر ہمارے حکمرانوں نے ابوالعلی المعری کی باتوں پر عمل کیا ہوتا تو اندلس کو بہت پہلے بچایا جا سکتا تھا- اس سے وہ خود کفیل ہو جاتے - لیکن انہوں نے مدد کے لئے شمالی افریقہ پیغامات بھیجے-"

شمالی افریقہ والوں نے کئی مرتبہ ہمیں عیسائیوں سے بچایا ہے۔ کیا یہ صحیح نہیں؟"

"ٹھیک ہے۔ ہماری مدد وہ صرف اسی طرح کر سکتے تھے کہ ہم نے جو کچھ تعمیر کیا ہے وہ سب تباہ کر دیتے۔ انہوں نے ہمیں اسی طرح بچایا ہے جس طرح ببر شیر ہرن کو دوسرے شیر کے پنجے سے چھڑاتا ہے۔ وہ جس اسلام کی بات کرتے ہیں وہ کسی طرح بھی عیسائیت سے بہتر یا کمتر نہیں ہے"

ہمارے مبلغ بھٹک رہے ہیں۔ عیسائی گمراہ ہو گئے ہیں۔
یہودی حیران ہیں مجوسی غلط راستوں پر بہت دور نکل گئے ہیں
انسانیت صرف دو مکتبوں میں بٹ گئی ہے۔ سمجھدار شیطان اور احمق دیندار"

المعری؟" زہیر نے پوچھا۔

سب نے ہاں میں سر ہلایا۔

"تم زندیق کی طرح باتیں کرتے ہو" زہیر نے کہا۔ "میری کم علمی پر معاف کریں۔ میں نے اسے نہیں پڑھا" ابو زید کا غصہ حق بجانب تھا۔ "کیا زندیق نے تمہیں یہ سب کچھ نہیں بتایا؟"

"ہاں اس نے بتایا۔ لیکن کبھی مجھے المعری کی کوئی کتاب نہیں دی۔ وہ صرف اس کے شعر پڑھتا تھا۔ جو میں مانتا ہوں تمہاری شراب سے بھی زیادہ تیز ہیں۔ کیا آپ اس کی نسل سے تو نہیں؟"

"اپنی موت سے پہلے" فاطمہ نے وضاحت کی۔ "اس نے وصیت کی تھی کہ اس کی قبر پر یہ شعر لکھ دیا جائے

یہ ظلم میرے باپ نے مجھ پر کیا تھا لیکن میں نے کسی پر نہیں کیا۔۔۔

"وہ دنیا سے اس قدر بیزار تھا کہ افزائش نسل کو حماقت سمجھتا تھا۔ نوع انسانی ہدایت کی اہل نہیں۔ چنانچہ اب تم سمجھے۔ ہم نے خود کو اس کی اولاد کی جگہ سمجھا اور اس کی تعلیمات کے مطابق زندگی گزارتے ہیں" زہیر الجھن میں پڑ گیا۔ اب تک اسے پورا یقین تھا کہ اس نے جو راستہ اختیار کیا ہے وہی ایک مسلمان سپاہی کے لئے عزت کا راستہ ہے۔ لیکن ان لیٹروں اور ان کے فلسفی نے اس کے دل میں شک کا بیج بو دیا تھا۔ جب ابو زید المعری اور اس کے ساتھی اس آزاد خیال شاعر اور فلسفی کی عظمتوں کے قصہ سنا رہے تھے تو زہیر کو ان کی آواز دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

زہیر کا سر گھوم گیا۔ اس کے دماغ میں طوفان اٹھ رہے تھے۔ اسے لگا کہ وہ اتھاہ

تاریکی کے دہانے پر کھڑا ہے۔ اسے ڈر تھا کہ وہ اپنا توازن نہ کھو بیٹھے۔ اسے بڑی شدت سے احساس ہوا کہ اسے الحزیل کی طرف واپس لوٹ جانا چاہئے۔ شاید کھجوروں کی شراب دماغ پر چڑھ گئی تھی۔ شاید کافی کے چند پیالے اور غرناطہ میں دو گھنٹے حمام کے غسل سے سب کچھ صاف ہو جاتا۔ کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ اس لئے کہ ذہنی تذبذب کے زیر اثر اسے لگا جیسے وہ قرآن کی بے حرمتی کر رہے ہیں اور یہ وہ کبھی برداشت نہیں کر سکتا تھا' اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ شاید اس نے صحیح نہیں سنا تھا۔ اس نے ابو زید سے کہا کہ جو وہ ابھی کہہ رہا تھا اسے پھر کہے۔

مذہب کیا ہے؟
ایک ایسی دوشیزہ ہے جسے کوئی دیکھ نہ سکے
اس کا جہیز اتنا زیادہ ہے کہ چاہنے والا پاگل ہو جاتا ہے۔
تمام اچھی باتیں جو میں نے منبر سے سنی ہیں
میرے دل نے ان کا ایک لفظ بھی قبول نہیں کیا۔

"نہیں نہیں" زہیر بڑے کرب کے ساتھ چلایا۔ "اس کی شاعری نہیں۔ یہ میں پہلے بھی سن چکا ہوں۔ تم قرآن کی بات کر رہے تھے نہیں؟"

فاطمہ نے اس کی آنکھوں میں گھورا

"ہاں"! فاطمہ بولی۔ "میں کبھی کبھی کرتی ہوں۔ لیکن ہمیشہ نہیں۔ ابو العلی المعری کو اس کے کلام الٰہی ہونے پر شک تھا۔ لیکن وہ اس کے انداز بیان کا معترف تھا۔ ایک دن اس نے اپنا ایک مسودہ تیار کیا جسے اس نے الفصول والغائت کا نام دیا۔

"یہ کفر ہے" زہیر چلایا۔

"فقیہوں نے اسے کفر ہی قرار دیا تھا۔ "ابو زید نے بڑی نرمی اور ہلکی سی مسکراہٹ سے وضاحت کی اور یہ مقدس کتاب کی نقل تھی۔ لیکن ہمارے استاد معظم کے دوستوں کا بھی یہی خیال تھا کہ یہ قرآن سے ہر حیثیت میں کم تر تھی"

"اس کے جواب میں" فاطمہ نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "استاد نے کہا کہ ابھی اس کے کلام میں وہ روانی نہیں آئی جو چار سو برس مسلسل مشق سے آتی ہے۔"

استاد کے انمول خزانے سے اس جواہر پارے کے انتخاب کی سب نے داد دی ابو زید زہیر کے چہرے پر سنجیدگی کے آثار دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ اور اس نے فضا کو ہلکا کرنے کی کوشش کی۔

"جب اس پر کفر کا الزام لگایا گیا تو اس نے الزام لگانے والے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا:

میں بے سروپا جھوٹ بولنے کے لئے اپنی آواز بلند کرتا ہوں۔
لیکن جب میں سچ بولتا ہوں تو میری نحیف آواز کوئی نہیں سنتا۔

"ابوزید! یہ بتاؤ" زہیر نے پوچھا۔ "کیا تم ہمارے مذہب کو مانتے ہو؟"

"سارے مذہب ایک بھول بھلیاں ہیں۔ لوگ محض عادتاً مذہبی ہوتے ہیں۔ وہ کبھی اپنے اعتقادات کی صحت کے بارے میں نہیں سوچتے۔ آسمانی صحیفوں کا تصور ذہنوں میں سمایا ہوا ہے۔ جبکہ اگلے وقتوں کے لوگوں نے قصہ گھڑے اور انہیں مذہب کا نام دے دیا۔ موسیٰؑ، عیسیٰؑ اور ہمارے نبیؐ نے مشکل حالات میں اپنے لوگوں کی رہنمائی کی۔ اس سے زیادہ میں نہیں مانتا۔"

اس گفتگو کے بعد زہیر نے اپنا راستہ متعین کر لیا۔ یہ برائی میں گھرے ہوئے لوگ تھے۔ وہ جو خود بے دین تھے وہ بھلا کس طرح عیسائیوں کو غرناطہ سے نکال سکتے تھے۔ ایک مرتبہ پھر وہ ابوزید کی آواز سے جھلا گیا۔ اسے لگا کہ اس کے دل کی بات کھل گئی ہے۔

"تم سوچ رہے ہو کہ ہم جیسے لوگ کس طرح عیسائیوں کو شکست دے سکتے ہیں۔ لیکن ذرا خود سے یہ سوال بھی کرو کہ پختہ ایمان رکھنے والے بھی کیوں اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔"

"میں اور بحث نہیں کروں گا۔" زہیر نے کہا۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ میں اب رخصت چاہوں گا اور ان کے پاس جاؤں گا جو غرناطہ میں میرا انتظار کر رہے ہیں۔"

وہ کھڑا ہوا اور اس نے اپنی تلوار اٹھائی۔ فاطمہ اور دوسرے لوگ بھی باہر سرد ہوا میں اس کے پیچھے پیچھے آئے۔ اسے دیر ہو رہی تھی اور زہیر غروب آفتاب سے پہلے اپنی منزل پر پہنچنا چاہتا تھا۔

"سلام علیکم۔ زہیر بن عمر" رخصت کے لئے بغل گیر ہوتے ہوئے ابو زید نے کہا۔ "یاد رکھنا کہ اگر تم ارادہ بدل لو اور ہم میں شامل ہونا چاہو تو البحارہ کی طرف چلے آنا۔ وہاں تم ایک چھوٹے سے گاؤں الباسط پہنچ کر کسی بھی شخص کو میرا نام بتانا ایک دن کے اندر اندر میں تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔ خدا حافظ"

زہیر گھوڑے پر سوار ہوا۔ دائیں ہاتھ کو اٹھا کر سلام کیا اور چند منٹوں میں غرناطہ کی سڑک پر واپس آ گیا۔ ایک بار پھر سب سے جدا ہو کر وہ خوش تھا۔ اسے اطمینان تھا کہ وہ

بے دینوں اور چوروں کی بری صحبت سے بچ گیا ہے۔ اسے یہ تجربہ تو اچھا لگا مگر وہ اس کے بعد ایسا ہی نجس محسوس کر رہا تھا جیسا وہ امیمہ کے ساتھ رہنے کے بعد محسوس کرتا تھا۔ اس نے اپنے پھیپھڑے پھلائے اور لمبے لمبے سانس لے کر پہاڑوں کی تازہ ہوا سے اپنے اندر کی کثافت کو صاف کیا۔

ایک پہاڑی کی چوٹی سے اس نے شہر کو دیکھا۔ پرانے وقتوں میں جب وہ اپنے باپ کے قافلہ کے ساتھ دربار میں جاتا تھا تو اس جگہ رک کر وہ کچھ خور و نوش کرتے اور اس منظر سے لطف اندوز ہوتے۔ اس کا باپ عموماً سلطان ابوالحسن کے زمانہ کا کوئی قصہ سناتا۔ پھر وہ بچوں کی سی بے فکری کے ساتھ ڈھلوان پر سے تیز تیز دوڑ لگاتے۔ دروازے پر پہنچ کر وہ وقار کے ساتھ چلنے لگتے۔ ایک لمحہ کے لئے زہیر کا جی چاہا کہ وہ تیزی سے نیچے اترے۔ لیکن اس نے خود کو سمجھایا۔ شہر کے ہر دروازے پر عیسائی سپاہی تعینات تھے۔ اسے حد درجہ سکون سے رہنا تھا۔ شہر کے دروازے پر پہنچ کر اس نے سوچا کہ اگر ابن داؤد کا ان لٹیروں سے واسطہ پڑتا تو وہ کیا کرتا۔ ابن داؤد کو بڑی معلومات تھی۔ لیکن اس نے المعری کا نام تک نہیں سنا تھا۔

عیسائی سپاہیوں نے بڑے غور سے نووارد جوان کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ اس کے لباس اور ریشمی عمامہ سے انہوں نے اندازہ لگایا کہ وہ شرفاء میں سے ہے۔ غالباً ایک عرب نائٹ جو اپنی محبوبہ سے ملنے آیا ہے۔ چونکہ اس نے تلوار اس طرح باندھی ہوئی تھی کہ وہ صاف نظر آ رہی تھی اس لئے انہوں نے سوچا کہ وہ کوئی مجرم نہیں ہو سکتا نہ اس کا ارادہ کسی کو قتل کرنے کا ہو سکتا ہے۔ زہیر نے ان کی نجس نظروں کو دیکھا اور گھوڑے کو مزید آہستہ کیا۔ لیکن سپاہیوں نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ سر کی ہلکی سی جنبش سے اس نے ان کو متوجہ کیا۔ یہ طریقہ اسے اپنے باپ سے ورثہ میں ملا تھا۔ سپاہی مسکرائے اور انہوں نے اس کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلائے۔

جب وہ شہر میں داخل ہوا تو ایک مرتبہ پھر زہیر کو سکون محسوس ہوا۔ کافروں سے چند گھنٹے پہلے غیر متوقع ملاقات نے اس کے ذہن میں جو ہلچل مچا دی تھی وہ کسی خواب کی طرح تحلیل ہو گئی۔ پہلے، بلکہ ایک ماہ پیشتر ہی۔ زہیر سیدھا اپنے چچا ابن حشام کے گھر جاتا۔ لیکن آج وہ ایسا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس لئے نہیں کہ ابن حشام اب پیڈرو ڈی غرناطہ بن گیا تھا اور اس نے اپنا مذہب تبدیل کر دیا تھا بلکہ دراصل وہ اپنے چچا کے گھر والوں کو کسی مصیبت میں ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔

اس کے کوئی درجن بھر ساتھی گزشتہ روز غرناطہ پہنچ گئے تھے۔ اور جن کے وہاں کوئی عزیز یا دوست نہیں تھے وہ خندق میں ٹھہرے ہوئے تھے ایک ایسے شہر میں جہاں اتنے عزیز اور اتنے دوست ہوں اسے کسی سرائے میں ٹھہرنا بہت عجیب لگا۔ تاہم اس سے اسے اپنے مقصد پر یکسوئی سے سوچنے کا موقع ملا۔ وہ اس مرتبہ غرناطہ میں سکون سے بیٹھنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ ہر ساعت ہر لحہ اپنے مقصد کو مد نظر رکھنا چاہتا تھا۔ اپنے خیالوں کی دنیا میں زہیر نے دیکھا کہ وہ علم اٹھائے ہوئے نئی ریاست کے خلاف جوابی حملہ کرنے جا رہا ہے۔ چڑیل ازابیلا اور فحاشی میں ڈوبے ہوئے فرڈنینڈ کے خلاف مکار زی منس کے خلاف' ان سب کے خلاف ۔

اسی شام زہیر کے ساتھی اس سے ملنے شہر آئے۔ اسے وہاں ایک ذرا بہتر کمرہ دیا گیا تھا۔ چھت پر پیتل کا ایک چھ شاخوں والا فانوس لٹکا ہوا تھا جس پر عجیب و غریب نقش بنے ہوئے تھے۔ تیل کے چراغوں سے ہلکی ہلکی روشنی نکل رہی تھی۔ کمرے کے بیچوں بیچ مٹی کا ایک برتن رکھا تھا جس میں انگارے دہک رہے تھے۔ ایک کونے میں ایک شاندار بستر تھا جس پر سنہرے اور کاسنی ریشمی لحاف رکھے ہوئے تھے۔ آٹھوں نوجوان ایک بڑی سی جاء نماز پر بیٹھے تھے جو مسہری کے دوسری طرف پھیلی ہوئی تھی۔

زہیر سب سے اچھی طرح واقف تھا۔ وہ ایک ساتھ ہی پلے بڑھے تھے۔ دو بھائی ابن منصور سنار کے خاندان سے تھے۔ ایک ابن باسط جڑی بوٹی فروش کا بیٹا تھا ایک ابن امین تھا جو یہودی حکیم کے اس معاون کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا جو اب کیپٹن جنرل کی خدمت میں تھا اور تین الحزیل کے سر پھرے نوجوان تھے جو گزشتہ روز غرناطہ پہنچے تھے۔ شکست نے ان کے طور طریقوں میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کی تھی۔ اس کا سبب وہ خود تھا۔ لیکن کلیسا کا سربراہ ان کے طرز حیات کو بدلنے پر مصر تھا۔ اسی لئے وہ اس سے نفرت کرتے تھے۔

قدرت کو منظور نہیں تھا کہ ان میں سے کوئی ایک بھی سازشی بنے۔ جب وہ زہیر کے کمرے میں داخل ہوئے تو سب کے سب بہت سنجیدہ اور احساس ذمہ داری سے دبے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ ان کے چہرے اترے ہوئے تھے۔ زہیر نے ان کی یہ حالت دیکھی اور ادھر ادھر کی باتوں میں لگا کر ان کی پریشانی دور کرنے کی کوشش کی اپنے یار دوستوں کی زندگیوں کے چیتھڑے اڑانے کے بعد ان میں طمانیت لوٹ آئی اور وہ پہلے کی طرح ہو گئے۔

صرف ابن امین تھا جس نے اس ساری بحث میں کسی جوش و جذبہ کا اظہار نہیں کیا۔

وہ تو سن بھی نہیں رہا تھا۔ وہ آئندہ پیش آنے والے خطروں کے متعلق سوچ رہا تھا اور وہ بڑے غصہ سے بولا۔

جب تک وہ ہمیں ٹھکانے لگائیں گے کوئی رونے اور چلانے والا بھی باقی نہیں بچے گا۔ کیپٹن جنرل ہمیں اپنے حال پر چھوڑ دے گا۔ اصل مسئلہ تو پادری کا ہے۔"

اس کے بعد سب نے شکایتوں کا طومار باندھ دیا۔ کشتالہ کی کلیسائی عدالت کے لوگ شہر میں دیکھے گئے تھے۔ تفتیش کی جا رہی تھی کہ تبدیلی مذہب حقیقی ہے یا محض دکھاوا۔ مذہب بدلنے والوں کے گھروں پر جاسوس بٹھا دیئے گئے تھے جو یہ دیکھتے تھے کہ آیا یہ لوگ جمعہ کے روز کام پر جاتے ہیں۔ کتنی مرتبہ نہاتے ہیں۔ نوزائدہ لڑکوں کے ختنہ کرتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ مسلمان خواتین کی توہین اور سپاہیوں کے ان سے دست درازی کرنے کے بہت سے واقعات ہوئے تھے۔

"جب سے ملعون پادری ہمارے شہر میں آیا ہے" ابن باسط 'جو جڑی بوٹی والے کا بیٹا تھا نے کہا۔ "وہ تمام ایسی جائدادوں اور اثاثوں کی تفصیلات تیار کر رہے ہیں جو مسلمانوں یا یہودیوں کی ملکیت ہیں۔ یہ طے ہے کہ اگر ہم نے مذہب نہ بدلا تو سب کچھ لے لیں گے۔"

"میرے والد کہتے ہیں کہ اگر ہم نے مذہب بدل بھی لیا تو بھی وہ کسی اور بہانے سے ہماری جائدادوں پر قبضہ کر لیں گے۔" یہ سلمان بن محمد تھا۔ سنار کا بڑا بیٹا۔ "ذرا سوچو' انہوں نے یہودیوں کے ساتھ کیا کیا ہے۔"

"وہ خونی بھیڑیئے جو روم میں پوپ بن کر بیٹھے ہیں وہ تو اپنی جیبیں بھرنے کے لئے کنواری مریم کو بھی بیچ دیں گے" ابن امین بڑبڑایا۔ "ہسپانوی کلیسا اپنے مقدس باپ کے نقش قدم پر چل رہا ہے۔"

"لیکن اس کے شکار ہم ہیں۔" ابن باسط نے کہا۔

غرناطہ کی شکست کے بعد سے زہیر غرناطہ اور الحزیل کی تمام بحثوں میں محض ایک خاموش تماشائی بنا رہا تھا۔ عموماً اس کے والد یا چچا یا گاؤں کا کوئی بزرگ مناسب موقعوں پر مداخلت کر کے گفتگو کا رخ متعین کرتے۔ زہیر تنگ آ چکا تھا۔ تیز ہوا دروازوں کھڑکیوں سے اندر آنے لگی تھی اور کوئلے بجھنے والے تھے۔ خندق کے ملازم سو چکے تھے۔ وہ بھی سونا چاہتا تھا لیکن اسے معلوم تھا کہ اگر اس نے کسی نتیجہ پر پہنچنے اور کوئی فیصلہ کرنے پر اصرار نہیں کیا تو گفتگو صبح تک یونہی گھسٹتی رہے گی۔

"دوستو! تمہارے لئے تو بات کا سمجھنا مشکل نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ہم سے جو جاگیروں پر رہتے ہیں وہ صدیوں سے تنہائی کے عادی ہو چکے ہیں اور شہری زندگی کو نہیں سمجھتے۔ یہاں تمہاری زندگی بازار کے گرد گھومتی ہے۔ ہماری تمام یادیں اور تمام امیدیں زمین اور اس پر کام کرنے والوں سے وابستہ ہیں۔ اکثر کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جو ہم دیہات والوں کو اچھی لگتی ہیں لیکن جن کی تمہارے لئے کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ ہم نے صدیوں میں سرزمین کی آبیاری کی ہے۔ ہم قرطبہ' اشبیلہ اور غرناطہ کو خوراک مہیا کرتے ہیں۔ اس سے شہروں میں خوشحالی آگئی ہے۔ ایک ایسی تہذیب پروان چڑھی ہے لیکن جسے عیسائی جلا تو سکتے ہیں لیکن جس کی وہ نظیر پیش نہیں کر سکتے۔ ہم نے وہ دروازے کھولے ہیں وہ روشنی دی ہے جو ہمارے شہروں سے نکل کر اس تمام براعظم کو منور کر رہی ہے۔ اب وہ ہم سے یہ سب کچھ چھین لینا چاہتے ہیں ہمیں چند محدود علاقوں میں رہنے کی بھی اجازت نہیں ہے۔ جہاں ہم امن و سکون سے جی سکیں۔ یہ وہ حقیقت ہے جس نے ہم سب کو یہاں اکٹھا کیا ہے۔ شہر اور دیہات سب کو ایک ہی طرح کی ہلاکت کا سامنا ہے' تمہاری تجارت' تمہارے پیشے' ہمارے جولاہے اور کسان' سب کو تباہی کا سامنا ہے۔"

دوسروں نے اس کی طرف حیرانی سے دیکھا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ الفحل ایک دم سے بہت سمجھدار ہو گیا ہے۔ اس نے ان کی آنکھوں میں ایک نیا احترام دیکھا۔ دو برس پہلے اگر اس نے ایسی باتیں کی ہوتیں تو وہ قہقہے لگاتے اور اسے مردانہ قحبہ خانے میں جانے کا مشورہ دیتے جہاں ایسے خیالات کو بہتر عملی شکل دی جا سکتی تھی' آج نہیں۔ وہ جانتے تھے کہ زہیر ایکٹنگ نہیں کر رہا ہے۔ انہیں پوری طرح علم تھا کہ حالات نے کس طرح ان سب کو ایسے ہی بدل دیا تھا۔ البتہ انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ غرناطہ کے المیہ سے زیادہ المعری جیسے عجیب و غریب شخص سے اس کے ٹکراؤ نے اسے اتنی سمجھ دی تھی اور اس کے حواس کو اس طرح جھنجھوڑا تھا۔ زہیر نے محسوس کیا کہ اب انہیں اپنے منصوبہ سے آگاہ کر دے۔

"ہم نے اپنے گاؤں میں بہت سوچ بچار کیا ہے۔ اس وقت الحزبل سے بیس رضاکار شہر میں آ چکے ہیں۔ یہ تعداد تھوڑی ہے۔ لیکن ہم جان دینے کو تیار ہیں۔ پہلی بات یہ ہے تین چار سو جوانمردوں کی ایک جمعیت تیار کی جائے جو عیسائیوں سے مسلح جنگ کرے اور باب الرسلہ میں روزانہ مقابلہ کرے۔ اس جنگ کو دیکھ کر اوروں کے حوصلے بڑھیں گے اور شہر میں کمک پہنچنے سے پہلے ہی بغاوت شروع ہو جائے گی۔ ہم سلطان کی ہاری ہوئی جنگ

لڑیں گے۔"

ابن باسط نے کسی لحاظ کے بغیر اس منصوبے کو رد کر دیا۔

"زہیر ابن عمر! آج شام تم نے دو مرتبہ مجھے حیرانی میں ڈالا' پہلے اپنی ذہانت سے اور پھر حماقت سے۔ میں اس بات سے متفق ہوں کہ عیسائی ہمیں مکمل طور پر تباہ کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن تم ان کا کام آسان کرنا چاہتے ہو۔ تم چاہتے ہو کہ ہم تیاری کر کے ان کی چال میں پھنس جائیں۔ جنگی کارناموں کی باتیں پرانی ہو گئی ہیں۔ واقعی اگر وہ کبھی تھیں بھی یا صرف مورخوں کی داستان طرازیاں تھیں۔ اگر ہم انہیں شکست دے بھی دیں اور مجھے یقین نہیں کہ ہماری ہمت ان کی بہیمانہ درندگی کی تاب لا سکے گی۔ پھر بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ بالکل بھی نہیں۔ ہمارے لئے صرف ایک راستہ ہے کہ ہم اپنے لوگوں کو تیار کریں اور انہیں شہر سے نکال کر الیوجرا لے جائیں۔ وہ اسے ہم اہل ایمان کے پاس بلانسیہ اور دوسرے شہروں میں اہل ایمان کے پاس سفیر بھیج سکیں گے اور ان سے رابطے قائم کر سکیں گے اور یوں ایک ایسی بغاوت کی آگ لگائیں گے جو سارے جزیرہ نما میں بیک وقت بھڑک اٹھے۔ یہی وہ اشارہ تھا جس کے لئے سلطان استنبول میں انتظار کرتا رہا۔ ہمارے بھائی ہماری امداد کو آئیں گے۔"

زہیر نے حمایت کے لئے اپنے گرد دیکھا۔ لیکن کوئی تیار نہیں تھا۔ تب ابن امین بولا:

"ابن باسط اور میرا دیرینہ دوست زہیر دونوں خوابوں کی دنیا میں رہ رہے ہیں۔ باسط کا خیال غالباً حقیقت سے زیادہ قریب ہے۔ لیکن ہماری حقیقتوں سے وہ بھی بہت دور ہے۔ میری ایک سادہ سی تجویز ہے۔ ہمیں چاہئے کہ سانپ کا سر اڑا دیں دوسرے اس کی جگہ لے لیں گے مگر وہ احتیاط برتیں گے۔ میری تجویز کچھ ایسی مشکل نہیں اور اس پر آسانی سے عمل کیا جا سکتا ہے۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ ہم زی منس دی سیسروس کو قابو کر کے اسے قتل کر دیں اور اس کا کی شہر کی فصیل پر لٹکا دیں۔ مجھے معلوم ہے وہ سخت پہرے میں رہتا ہے لیکن پہرے دار زیادہ نہیں ہیں اور ہم اچانک ان پر ٹوٹ پڑیں گے۔

"یہ کوئی مناسب خیال نہیں ہے" زہیر نے سنجیدگی سے کہا

"لیکن مجھے یہ تجویز پسند ہے" ابن باسط بولا۔ اس میں ایک بڑا فائدہ ہے۔ ہم خود اپنے طور پر اسے سرانجام دے سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ آئندہ چند روز ہمیں اس منصوبہ کے لئے تیاری کرنی چاہئے اور پھر ملاقات کر کے وقت اور طریقہ کار کا فیصلہ کرنا چاہئے۔"

ابن امین کی تجویز نے اس شام میں کچھ جان ڈال دی۔ ہر ایک بڑے جوش سے بولا۔

زہیر نے مستقبل کے بارے میں سوچا اور خبردار کیا کہ غرناطہ میں الحامہ کی غلطی کو نہ دہرایا جائے۔ اس طرح فتح کے سب خواب ختم ہو جائیں گے اور ڈو مینیکنز کی حمایت کی امید بھی نہیں رہے گی اگر سیسزوس قتل ہو گیا تو اسے شہادت کا درجہ مل جائے گا۔ روم اسے روحانی وقار عطا کر دے گا۔ ازابیلا اپنے کنفسر کی موت کا انتقام زبردست خونریزی سے لے گی اتنا کہ الحامہ کا قتل عام بھی اس کے سامنے کم نظر آئے گا۔ اپنے دلائل کی معقولیت کے باوجود زہیر نے خود کو بالکل تنہا پایا۔ خود اس کے اپنے الحزیل کے ساتھی سیسزوس کے قتل کی سیدھی سادھی تجویز سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ اس جذباتیت کے سامنے زہیر نے ہتھیار ڈال دئے۔ وہ قتل کی کسی ایسی سازش میں شریک نہیں ہو گا جو جنگ کے اعلیٰ منصوبوں کے خلاف ہو۔ لیکن وہ ان کے منصوبہ کے راستہ میں حائل بھی نہیں ہو گا۔

"تم بہت حساس اور مغرور ہو" ابن باسط نے اس سے کہا۔ "پرانے دن اب کبھی لوٹ کر نہیں آئیں گے۔ تم اپنی قمیضوں کو عرق گلاب سے دھوتے ہو اور لیونڈر چھڑک کر انہیں خشک کرتے ہو۔ میں تمہیں بتا دوں کہ اگر ہم نے ان جانوروں کی کمر نہ توڑی جنہیں اللہ نے ہمرا امتحان لینے کے لئے بھیجا ہے تو سب کچھ خون میں بہہ جائے گا" ان کے جانے کے بعد زہیر نے غسل لیا اور بستر میں لیٹ گیا۔ مگر اسے نیند نہیں آئی۔ اسے پھر شکوک نے گھیر لیا تھا۔ اس نے سوچا کہ شہر سے نکل جائے اور اپنی تقدیر المعری کے ہاتھ میں دے دے یا شاید گھر جائے اور اپنے باپ کو خطرات سے آگاہ کر دے دیا اور اس خیال سے وہ کانپ اٹھا۔ وہ قرطبہ جائے اور بڑے چچا میگوئل سے کہے کہ اسے عیسائی بنا لیں۔

باب 9

"میں صرف اہلیت کو ہی شرافت کا صحیح معیار سمجھتا ہوں۔ جہالت سب سے بری چیز ہے۔ جن ملاؤں کا تم اتنا احترام کرتے ہو ان کے نزدیک جہالت ہی کسی عورت کے جنت میں جانے کی ضمانت ہے۔ کاش پروردگار مجھے جہنم رسید کر دے۔"

ہند اپنے محبوب کے ساتھ بحث میں الجھی ہوئی تھی جس کے شفقت بھرے تضحیک آمیز لہجہ سے اب اسے جھلاہٹ ہونے لگی تھی۔ ابن داؤد کو اسے جلانے میں بڑا مزہ آ رہا تھا۔ اس نے الازہر کے علماء جیسا رویہ اپناتے ہوئے مروجہ مذہبی نظریات کے حق میں بات شروع کی خصوصاً عورتوں کے حقوق و فرائض کے سلسلہ میں۔ وہ اصل میں ہند سے جنت کے خلاف اس کے خیالات سننا چاہتا تھا۔ حزیل کا جذباتی جوش اس کی غضبناک آنکھوں میں جھلکنے لگا تھا۔ ابن داؤد نے پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ وہ کتنی شہ زور ہے۔ غصہ میں وہ بہت پروقار نظر آ رہی تھی۔ اس نے ہاتھ پکڑ کر اس کے بوسے لینے شروع کر دیئے۔ اس بیساختہ اظہار محبت سے ہند کو بے انتہا مسرت ہوئی لیکن وہ اناروں کے جھنڈ میں تنہا نہیں تھے۔

ابن داؤد کی جسارت پر جھاڑیوں کے پیچھے سے ان کی خدمت پر معمور تین کنیزوں کی کھانسنے کی آواز سنائی دی۔ ہند ان سے پوری طرح باخبر تھی۔

"جاؤ' تم سب گھومو پھرو۔ تم سمجھتی ہو کہ یوں مجھے فریب دے رہی ہو۔ مجھے معلوم ہے کہ تم اپنے محبوبوں پر نظر پڑتے ہی کیسے بھڑک اٹھتی ہو۔ بھوکی مرغیوں کی طرح پل پڑتی ہو۔ جاؤ اور کچھ وقت گھومو پھرو اور جب تک میں آواز نہ دوں واپس نہ آؤ۔ سمجھیں۔"

"بہتر بی بی ہند..." عمیمہ نے جواب دیا۔ "لیکن بی بی زبیدہ..."

"کیا تم نے بی بی زبیدہ کو بتایا ہے کہ میرا بھائی کس طرح تم پر سواری کرتا ہے؟"

ہند کی ڈانٹ سے معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ عمیمہ کی سہیلیوں نے ایک بے ڈھنگا سا قہقہ لگایا۔ اجنبی کے سامنے مزید حماقت سے بچنے کے لئے کنیزیں پرے چلی گئیں۔ اب تک ان کا کام یہ تھا کہ وہ ہند کی عصمت کی محافظ بنیں۔ اب انہوں نے ایک ایسا کام اپنے ذمہ لے لیا جو ان کے مزاج کے زیادہ مطابق تھا اور وہ اپنی مالکن کی راز دار بن گئیں۔ وہ نگرانی بھی کرتیں اور یہ خیال بھی رکھتیں کہ ان دونوں کو شک بھی نہ ہو۔

انہیں خبر نہیں تھی کہ یزید بھی قریب ہی تھا۔ ابن داؤد کے آنے کے فوراً بعد ہی یزید کو محسوس ہوا تھا کہ اس کی بہن اس سے چھٹ گئی ہے۔ اسے وجہ کا بھی اندازہ تھا اور اسی لئے وہ اس نووارد کو اپنے طفلانہ انداز میں ڈانٹ ڈپٹ بھی کرتا رہتا تھا۔ اسے قاہرہ کے اس اجنبی سے ایک نامعلوم لیکن بڑی گہری نفرت سی ہو گئی تھی۔

پہلے پہل یزید کو ابن داؤد کی دنیا بھر کی کہانیوں میں مزہ آتا تھا۔ اس کو بڑا اشتیاق تھا۔ بہت بے قراری تھی کہ قاہرہ کے متعلق۔ دمشق کے متعلق اور زیادہ جانے۔ اسے اندلس کی عربی اور دیار رسولؐ کی عربی کے معنوں اور لہجے میں فرق بڑا عجیب سا لگتا۔

بچے کے اشتیاق نے ابن داؤد میں بھی ایک نئی دلچسپی پیدا کر دی تھی۔ اب وہ ان باتوں پر بھی بڑی محنت سے توجہ کرنے لگا تھا جو اسے پہلے عام سی لگتی تھیں۔ البتہ یزید کو محسوس ہونے لگا تھا کہ ابن داؤد کی موجودگی میں ہند کے چہرہ کا رنگ بدل جاتا اور وہ بہت ہی حیا کرنے لگتی اور نظریں دوسری طرف پھیر لیتی۔ جب یزید کو اندازہ ہو گیا کہ قاہرہ کا نوجوان اس کا ذمہ دار ہے تو اس نے ابن داؤد کے درس میں آنا چھوڑ دیا' اگر اسے مجبور کیا جاتا تو وہ اپنی ناراضگی کو بالکل نہ چھپاتا اور ایسا ظاہر کرتا کہ وہ بور ہو رہا ہے۔

اس نے ابن داؤد سے سوال کرنے چھوڑ دیئے۔ اگر استاد کوئی سوال پوچھتا تو یا یزید خاموش رہتا یا صرف ایک دو الفاظ میں جواب دیتا۔ اس نے اس کے ساتھ شطرنج کھیلنا بھی چھوڑ دیا۔ یہ بہت بڑی قربانی تھی اس لئے کہ ابن داؤد ابھی نیا نیا وہاں آیا تھا اور اب تک ایک بار بھی اپنے شاگرد کو شکست نہیں دے سکا تھا۔ یہاں تک کہ یزید نے خود ہی اس سے تمام تعلقات ختم کر دیئے۔

جب ہند نے اس رویے کی وجہ پوچھی تو یزید نے ایک سرد آہ بھری اور نہایت بے دلی سے جواب دیا کہ اسے تو اس نئے ملازم استاد سے اپنے رویے میں کوئی تبدیلی محسوس نہیں ہوتی۔ یہ اس کی بہن کو بہت برا لگا۔ اس سے تعلقات اور کشیدہ ہو گئے۔ ہند جو خود

یزید کے معاملے میں حد سے زیادہ حساس تھی ابن داؤد کی محبت میں اندھی ہو گئی تھی۔ سب سے زیادہ دکھ اس کے بھائی کو ہی تھا۔ زبیدہ نے اپنے چھوٹے بیٹے کا مغموم چہرہ دیکھا۔ وہ معاملہ کو اچھی طرح سمجھتی تھی۔ اس نے طے کیا کہ ہند کی شادی کو جلد از جلد نمٹا دے اور اس وقت تک یزید سے اس موضوع پر کوئی بات نہ کرے۔

اس بات سے بالکل بے نیاز کہ وہ لوگوں کی نظروں میں ہیں ہند اور ابن داؤد ایسے مقام پر پہنچ گئے تھے جہاں کچھ حتمی فیصلے ناگزیر ہو جاتے ہیں۔ اس کے ہاتھ قمیض کے بیچ سینہ کو ٹٹولتے لیکن فوراً ہی باہر آ جاتے۔

"ایک نازک سی شاخ پر دو ماہ تمام" اس نے آہستہ سے کچھ ایسے لہجہ میں کہا کہ لگا کہ جذبات سے اس گلا رندھ گیا ہے۔ ہند بھی پیچھے رہنے والی نہیں تھی۔

اگر اس سے آگے بڑھ جاتے تو شب عروسی تک پہنچ جاتے۔ لیکن۔ ہند نے سوچا۔ اگر یہیں رک گئے تو اتنا طویل صبر آزما عرصہ کیسے گزرے گا۔ ہند رکنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے تمام تکلفات کو ایک طرف رکھ دیا۔ وہ اپنے پورے وجود کے ساتھ اس سے محبت کرنا چاہتی تھی۔ غرناطہ اور اشبیلیہ میں رشتہ کی بہنوں کے کھکھلانے اور کنیزوں سے سنی ہوئی باتوں سے اس نے دل ہی دل میں بڑے مزے لئے تھے۔ وہ اصل مزہ لینا چاہتی تھی۔

ابن داؤد نے موقع کی نزاکت کو محسوس کیا اور خود کو روکا۔ اس نے اپنے ہاتھ اس کے جسم سے ہٹالئے اور اس کے ہاتھوں کو بھی نرمی سے باہر نکالا۔

"کیوں؟" اس نے رندھے ہوئے گلے سے کہا۔

"میں تمہارے والد کا مہمان ہوں' ہند" اس کی آواز میں لاتعلقی اور بیگانگی تھی۔ "کل میں علیحدگی میں ان سے بات کروں گا اور تمہیں مانگوں گا اور کوئی صورت بڑی بے غیرتی کی بات ہو گی۔"

ہند نے جذبات کو ٹھنڈا پڑتے ہوئے محسوس کیا۔

"مجھے لگا کہ میں کسی انتہا کو پہنچ گئی ہوں۔ جو محض لذت سے کہیں زیادہ ہے۔ کوئی ایسی پاک کیفیت جو بیان نہیں ہو سکتی۔ اب میں سخت بددلی سے دو چار ہوں۔ شاید میں نے تمہارے متعلق غلط اندازہ لگایا تھا۔"

بڑی یقین دہانیاں کرائی گئیں۔ محبت کے عہدوپیمان ہوئے۔ وہ اس کو بہت ہی ذہین سمجھتا تھا۔ وہ کبھی کسی اس جیسی عورت سے نہیں ملا تھا۔ وہ باتیں کرتا جاتا اور اس کے پیروں کو چومتا جاتا۔ ان کی تعریف کرتا جاتا۔ وہ خاموش رہی۔ یہ خاموشی بات کرنے سے

زیادہ معنی خیز تھی- سچ تو یہ ہے کہ عارضی طور پر کھو دینے کے بعد وہ اسے دوبارہ پا چکا تھا- لیکن یہ احساس کہ وہ اسے غلط سمجھتی رہی تھی حقیقت سے کچھ دور بھی نہیں تھا- ابن داؤد کو پہلے کسی عورت کی صحبت میسر نہیں ہوئی تھی- ایک دم سے خود کو کھینچ لینے کی وجہ یہ تھی کہ وہاں وہ مہمان تھا- اسے تعجب تھا کہ ہند نے کس حد تک اس کے جذبات کو بھڑکا دیا تھا- لیکن یوں خود کو روک لینے کی اصل وجہ اس کا نامعلوم خوف تھا-

اب تک ابن داؤد کی زندگی میں ایک ہی جذباتی لگاؤ پیدا ہوا تھا وہ قاہرہ میں ایک ہم جماعت کے ساتھ تھا- منصور اسکندریہ کے ایک خوشحال قدیم جوہریوں کے گھرانے کا ایک فرد تھا- اس نے بڑے سفر کئے تھے اور بہت سے شہر دیکھے تھے جن میں جنوبی ہندوستان کا کوچین بھی شامل تھا جہاں وہ پانی کے جہاز میں گیا تھا- اس کی داستانوں نے ابن داؤد پر جادو کر دیا تھا- ساتھ ہی ساتھ انہیں شاعری اور الغوزہ نوازی میں بھی دلچسپی تھی- دونوں کے نقش تیکھے تھے اور ذہن متجس- اس کا لازمی نتیجہ ان کی دوستی تھی- تین برس وہ ایک دوسرے کے بہت قریب رہے تھے- وہ الازہر کی مسجد کے بالکل سامنے رواق میں ایک ہی کمرے میں رہتے تھے-

جلد ہی ان کی دوستی ایک تہرے رشتہ میں بدل گئی- ذہنی تسکین اور مذہبی جذبہ کے ساتھ —- کہ ان کا صوفی شیخ ایک ہی تھا—- ان کے درمیان تیسری قدر مشترک ان کے جنسی تعلقات تھے- انہوں نے مقفی نثر میں ایک دوسرے کے لئے نظمیں لکھی تھیں- یہ ایک ایسی زبان میں لکھی گئی تھیں کہ کسی تیسرے پڑھنے والے کے لئے بھی کوئی راز نہیں تھا- موسم گرما میں جب انہیں مجبوراً گھروں پر زندگی گزارنی پڑتی تھی وہ ڈائری میں روز مرہ کے واقعات لکھتے اور جنسی لطف سے محرومی پر اظہار خیال کرتے-

تجارتی سلسلے میں والد کے ساتھ استنبول جاتے ہوئے منصور کا جہاز حادثہ کا شکار ہو گیا اور وہ مارا گیا- اسے اس جدائی کا اتنا دکھ ہوا کہ ابن داؤد کے لئے قاہرہ میں رہنا مشکل ہو گیا اور اسی وجہ سے ابن خلدون کی کتابیں پڑھنے کے لئے وہ غرناطہ آیا تھا- ذہنی طور پر اس کا جھکاؤ زندیق کی طرف تھا- لیکن کچھ ملاقاتوں کے بعد اسے اندازہ ہو گیا کہ گو یہ چالاک شخص بہت ذہین اور پڑھا لکھا تھا لیکن اپنے حریف کو نیچا دکھانے کے لئے کسی طرح کے بھی ہتھکنڈے استعمال کرنے میں اسے کوئی جھجک نہیں تھی- ایک مرتبہ ابن حیسم کی شاعری پر گفتگو کے بعد ابن داؤد کو منصور کے ساتھ بھی اسی طرح کی ایک بحث یاد آئی- وہ اس یاد میں کھو گیا- جذبات کی رو میں بہہ گیا- ظاہر ہے اس نے زندیق کو ساری بات نہیں

بتائی لیکن بڈھا بھی بے وقوف نہیں تھا- اس نے بھانپ لیا تھا- اسی بات سے ابن داؤد پریشان تھا- زندیق اس خاندان کا دوست تھا- کہیں وہ ہند کے والدین کے سامنے اپنے شکوک کا اظہار نہ کر دے؟

جیسے وہ اس کے خیالات کو بھانپ گئی تھی- ہند نے اس کے ہاتھ سے کھیلنا شروع کر دیا اور معصومیت سے پوچھا: "قاہرہ میں جس عورت سے تمہیں محبت تھی اس کا نام کیا تھا؟ میں تمہارے متعلق سب کچھ جاننا چاہتی ہوں-"

ابن داؤد چونک گیا- ابھی وہ کوئی جواب نہیں دے پایا تھا کہ قہقہوں اور چیخوں کی آوازیں آنے لگیں- کنیزیں بسورتے ہوئے یزید پر ٹوٹ پڑی تھیں اور اسے گھسیٹ کر جھنڈ کی طرف لے جا رہی تھیں-

"مجھے چھوڑ دو" یزید چلایا- اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھرا ہوا تھا-

اپنے بھائی کو اس حالت میں دیکھ کر ہند سے برداشت نہ ہو سکا- اس نے دوڑ کر یزید کو سینہ سے لگا لیا- لیکن اس نے اپنے ہاتھ مضبوطی کے ساتھ پرے کر لئے- ہند نے اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو پونچھے اور اس کے گالوں کے بوسے لئے-

"تم میری جاسوسی کیوں کر رہے تھے"؟

یزید چاہتا تھا کہ اس کے گلے لگ کر اسے پیار کرے اور اسے اپنی پریشانیوں اور خوف سے آگاہ کرے- اس نے سن رکھا تھا کہ کس طرح بڑی چچی زہرہ گھر سے بھاگ گئی تھیں اور پھر واپس نہیں آئی تھیں- وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی ہند بھی ایسا ہی کرے- اگر وہ تنہا ہوتے تو وہ سب کچھ کہہ ڈالتا لیکن ابن داؤد کے چہرہ پر مسکراہٹ دیکھ کر چپ ہو گیا وہ مڑا اور گھر کی طرف دوڑ گیا اور حیران پریشان بہن دیکھتی رہ گئی-

آہستہ آہستہ ہند پر یہ واضح ہوتا جا رہا تھا کہ یزید کے غیر معمولی رویے کا سبب خود اس کی اپنی ذہنی کیفیت تھی- وہ ان سمندر سے بھی گہری سبز آنکھوں میں کچھ ایسی ڈوب گئی تھی کہ باقی ہر چیز یہاں تک کہ بانسری کی آواز بھی غیر اہم ہو کر رہ گئی تھی- اس کا بھائی اسکی اپنی بے احتیاطی کی وجہ سے پریشان تھا- اس نے خود کو مجرم محسوس کیا وہ اس کو سینہ سے لگانے کے لطف کو تقریباً بھول ہی گئی تھی- یزید کی بے چین شکل دیکھ کر اسے ابن داؤد سے اپنی بے رخی یاد آئی:

"سچ یہ ہے" اس نے سوچا- "اس کا پروقار رویہ ہمارے جذبات کو نظرانداز کرنے کے علاوہ کچھ اور نہیں-"

اس بات پر اسے اتنا غصہ آیا کہ وہ جس نے ابن داؤد کے دل میں آگ لگا دی تھی اب اسے کچھ بنیادی سبق سکھانا چاہتی تھی۔ اسے جلد ہی پتہ چل جائے گا کہ وہ برف سے بھی زیادہ ٹھنڈی ہے۔ وہ اب بھی اسے چاہتی تھی لیکن اپنی مرضی سے۔ اس وقت سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ وہ یزید سے پھر تعلقات استوار کر لے۔

ہند کے خیالات کا مرکز اپنی ماں کی گود میں سر چھپائے لیٹا تھا۔ وہ ان الفاظ کے ساتھ زبیدہ پر برس پڑا تھا۔ ”وہ آدمی ہند کے سینہ سے کھیل رہا تھا۔ میں نے خود دیکھا ہے۔“ یزید کا خیال تھا کہ اس کی ماں خوفزدہ ہو جائے گی۔

وہ جائے واردات پر پہنچے گی اور گھر کے مرد ملازموں کو حکم دے گی کہ ابن داؤد کو کوڑے لگائیں۔ قاہرہ کے اس دو ٹیہ کو اس کے گھر بے عزت کر کے واپس بھیج دیا جائے گا اور غرناطہ کے لئے سواری کی تلاش میں گاؤں جاتے ہوئے جنگلی کتے اس پر پڑ جائیں گے۔ اس کے بجائے زبیدہ مسکرائی۔

”ابن عمر! تمہاری بہن اب ایک سیانی عورت بن گئی ہے۔ جلد ہی اس کی شادی ہو گی اور اس کے بچے ہوں گے اور تم ماموں بن جاؤ گے۔

”اس سے شادی ہو گی؟“ یزید کو یقین نہیں آیا۔

زبیدہ نے ہاں میں سر ہلایا اور بیٹے کے ہلکے بھورے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔

”لیکن.... لیکن.... اس کے پاس تو کچھ نہیں۔ وہ تو ...“

”وہ بڑا عالم ہے میرے یزید۔ اس کی ساری دولت اس کے دماغ میں ہے۔ میرے والد کہا کرتے تھے کہ دماغ کا وزن بٹوے کے وزن سے زیادہ اہم ہے۔

”امی“۔ یزید نے تیوری پر بل ڈالتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھیں ننگی تلوار کی طرح تھیں اور اس کی آواز اسے اپنے شوہر جیسی لگی۔ وہ اس کا سامنا نہ کر سکی۔ ”کیا تم بھولتی ہو کہ خاردار جھاڑیوں میں سیب نہیں اگے؟“

”صحیح ہے، میرے بھائی۔“ ہند نے خاموشی سے کمرے میں آتے ہوئے یزید کے یہ الفاظ سن لئے تھے۔ ”لیکن میں اور تم اس بات سے بھی واقف ہیں کہ گلاب کے ساتھ ہمیشہ کانٹے ہوتے ہیں۔“

یزید نے اپنی ماں کے گلے کے پیچھے اپنا سر چھپا لیا۔ لیکن ہند نے ہنستے ہوئے اور اپنے اصلی روپ میں آتے ہوئے اسے اپنی طرف کھینچ لیا اور اس پر بوسوں کی بارش کر دی۔ سر پر، گردن پر، شانوں پر، گالوں پر۔

”یزید! میں تم سے ہمیشہ محبت کروں گی اس سے بھی زیادہ جس سے میری شادی ہو گی۔ یہ تو میرے ہونے والے شوہر کے لئے تشویش کی بات ہونی چاہئے۔ تمہارے لئے نہیں۔“

”لیکن پچھلے ایک مہینہ سے.....“ یزید نے کہنا چاہا

”مجھے معلوم ہے، معلوم ہے۔ میں واقعی شرمندہ ہوں۔ مجھے خیال نہیں رہا کہ ہم ساتھ ساتھ نہیں ہیں۔ لیکن یہ سب باتیں اب گئی گزری ہو گئیں۔ ہم پھر سے دوست بن جاتے ہیں۔“

یزید نے اس کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور اسنے اسے گود میں اٹھا لیا۔ جب گود سے اتارا تو اس کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔

”جاؤ۔ بونے سے پوچھئے وہ شام کے لئے کیا پکار رہا ہے۔“ ہند نے کہا۔ ”میں امی سے بات کرنا چاہتی ہوں۔“

جیسے ہی یزید باہر جانے لگا ماں اور بیٹی ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرائیں۔

”یہ بھی کہیں مجھ پر گئی ہے زبیدہ نے سوچا جب تک اس کے باپ سے شادی کی اجازت نہیں ملی تھی میں بھی محبت میں خوش نہیں تھی۔“ میرے معاملہ میں تاخیر عمر کی ماں کی وجہ سے ہوئی تھی۔ اسے میرے حسب نسب پر شک تھا۔ ہند کو محض اس وجہ سے کہ لڑکا یتیم ہے ان مشکلات سے نہیں گزرنا چاہئے۔“

ہند نے اپنی ماں کے خیالات کو بھانپ لیا۔ ”میں اتنا انتظار نہیں کر سکتی تھی کہ وہ میرے خون کی اصلیت جانیں۔ مجھے کچھ اور ہی تشویش ہے۔ سچ سچ بتاؤ۔ تمہیں وہ کیسا لگتا ہے؟“

”بہت وجیہ نوجوان اور ذہین بھی۔ وہ تم سے کہیں زیادہ اچھا ہے۔ میری بچی۔ تمہیں اور کیا چاہئے؟ شک کس بات کا ہے۔“

ہند کا اپنی ماں کے ساتھ ہمیشہ سے ہی خاص تعلق تھا۔ ان کے درمیان دوستی گھر کی آسودہ فضا کی مرہون منت تھی۔ ہند اس بات سے ناواقف نہیں تھی کہ اگر اس کا باپ دوسری شادی کر لیتا یا گاؤں میں کوئی ایک آدھ داشتہ رکھ لیتا تو گھر کا ماحول کیسا ہوتا۔ قرطبہ اور اشبیلیہ میں وہ اپنے عزیزوں کے گھروں میں گئی تھی۔ اسے یاد تھا کہ ان گھروں کی فضا کتنی گھٹی ہوئی تھی۔ اس کی رشتہ کی بہنیں اسے عیاشی کی وہ داستانیں سناتیں کہ قحبہ خانے یاد آجاتے۔ عورتیں گھر میں اس طرح لڑتی تھیں جیسے وہ کوئی سانپوں کی منڈلی ہو۔ الحزیل میں زندگی قطعی مختلف تھی۔

جب وہ بڑی ہوئی تو ہند اپنی ماں زبیدہ کے بہت قریب ہو گئی۔ اپنے آزاد منش باپ کی وجہ سے اس کی پرورش بڑے کھلے ماحول میں ہوئی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی چھوٹی بیٹی کسی قسم کے توہمات یا رسم ورواج کی اسیر نہ ہو۔ کلثوم بچپن سے ہی روایت پرست تھی' ہند اور اس کے باپ نے تو جب وہ ابھی دو برس کی تھی اندازہ لگا لیا تھا کہ بڑی باغیانہ طبیعت رکھتی تھی۔ اما کے بہت سے خدشات اور اس کی بار بار کی تنبیہہ کے باوجود زبیدہ نے اپنی بیٹی کی اس باغیانہ طبیعت کی حوصلہ افزائی کی۔

اس بارے میں ہند کے ذہن میں کوئی تذبذب نہیں تھا کہ وہ اپنی ماں کے سوال کا جواب کس طرح دے۔ وہ بالکل بھی نہیں ہچکچائی اور اس سہ پہر کی تمام تفصیلات بتانے لگی۔ اس طرح کہ کوئی ذرا سی بات رہ نہ جائے۔ جب وہ بول چکی تو اس کی ماں جو بڑے غور سے سن رہی تھی ہنس پڑی۔ لیکن اس ہنسی کے پیچھے ایک تشویش بھی تھی۔ اگر عمر موجود ہوتا تو جان جاتا۔

زبیدہ اپنی بیٹی کو ڈرانا نہیں چاہتی تھی۔ اپنے مزاج کے برخلاف اس نے تسلی دینے کی کوشش کی۔

"تم اس لئے پریشان ہو کہ وہ تمہاری آبیاری نہیں کرنا چاہتا۔ کیوں ٹھیک ہے؟"

ہند نے بڑی سنجیدگی سے سر ہلا کر اس سے اتفاق کیا۔

"پاگل لڑکی۔ ابن داؤد نے بالکل ٹھیک کیا۔ وہ ہمارا مہمان ہے اور کنیزوں کی موجودگی میں اپنے میزبان کی بیٹی کو ورغلانہ اس کی شفقت اور خاطر مدارات کا مناسب اعتراف نہیں۔"

"میں جانتی ہوں' میں جانتی ہوں" ہند بڑبڑائی۔ لیکن ایک اور بات بھی ہے جو میں بتا نہیں سکتی۔ اس وقت بھی جب اس کے ہاتھ مجھ سے کھیل رہے تھے تو میں نے محسوس کیا کہ اس میں وہ گرمی نہیں تھی۔ کوئی بے قراری نہیں تھی۔ حتیٰ کہ میں نے اسے چھوا لیکن وہ ڈر گیا۔ ابو سے نہیں' مجھ سے۔ پہلے کبھی اس کا کسی عورت سے واسطہ نہیں پڑا۔ یہ تو ظاہر ہے۔ لیکن یہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ میرا مطلب ہے کہ جب آپ دونوں نے ابو کے والدین کی بات نہیں مانی اور..."

"تمہارے والد ابن داؤد نہیں تھے۔ وہ بنو حزیل کے ایک بہادر تھے اور جب ہم قرطبہ گئے تو ہمیں شادی کئے ہوئے کئی گھنٹے گزر چکے تھے۔ اب جاؤ آرام کرو اور میں اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کرتی ہوں۔"

جب ہند صحن میں آئی تو سورج ڈوب رہا تھا۔ وہ ساکت کھڑی رہی۔ رنگوں میں ڈوبی ہوئی الحزیل کے اوپر برف پوش پہاڑیاں سنہری اور نارنجی رنگوں میں نہا رہی تھیں۔ گاؤں کے چھوٹے چھوٹے گھر ایسے لگ رہے تھے جیسے ابھی ابھی ان پر روغن کیا گیا ہو۔ وہ اپنے چاروں طرف بکھرے ہوئے حسن میں اتنی گم تھی کہ اسے اور کچھ نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔ چند لمحے پہلے وہ بالکل بے جان اور دکھی محسوس کر رہی تھی۔ اچانک تنہائی میں اسے مزہ آنے لگا۔

"ابھی کل ہی" اس نے سوچا "اگر میں یوں غروب آفتاب کی روشنی میں کھڑی ہوتی تو اس کے لئے بے قرار ہوتی۔ میں چاہتی کہ وہ یہاں میرے پاس ہو تاکہ ہم قدرت کی فیاضیوں سے لطف اندوز ہو سکیں۔ لیکن آج میں تنہائی میں خوش ہوں۔"

وہ اپنے خیالات میں اتنی گم تھی کہ جب وہ آہستہ آہستہ حمام کی طرف جانے لگی تو اس نے باورچی خانہ سے آتی ہوئی شور و غل کی خوشگوار آواز نہیں سنی۔

"یزید ایک سٹول پر بیٹھا تھا اور بونا شور مچا کر زجل گا رہا تھا۔ ملازم الحزیل کے انگوروں کے باغوں میں رکھے ہوئے مٹکوں میں سے بچی ہوئی شراب پی کر مست ہو رہے تھے۔ بونا زیادہ نشے میں نہیں تھا۔ اس کے تین معاون اور وہ دو شخص جن کا کام صرف اتنا تھا کہ کھانا نکال کر میز پر لگا دیں کچھ زیادہ ہی چڑھا گئے تھے۔ وہ ایک دائرے میں ناچ رہے تھے جس کے درمیان بونا ایک میز پر کھڑا ہو کر گا رہا تھا۔ اما باورچی خانہ کے باہر سیڑھیوں پر بیٹھی تھی۔ وہ بہت بیزار تھی اور اس کے چہرہ سے غصہ ٹپک رہا تھا۔ اس نے کوشش کی تھی کہ بہلا پھسلا کر یزید کو گھر میں لے جائے لیکن وہ بڑے مزے لے رہا تھا اور اس نے اما کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔

بونے نے گانا ختم کر دیا۔ وہ تھک گیا تھا۔ لیکن داد دینے والے اسے گانے پر اکسا رہے تھے۔

"بس ایک آخری" وہ چلائے۔ قزمان کا گیت۔ چھوٹے مالک کی خاطر"

"ہاں۔ بونے۔ سناؤ" یزید بھی ان کے ساتھ مل گیا۔ "بس ایک نغمہ اور"

بونا ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔

میں ابن قزمان کی ایک کتھا سناؤں گا جو اس نے تین سو برس پہلے لکھی تھی۔ لیکن اتنے عظیم استاد کے احترام میں سب لوگ خاموشی سے سنیں۔ اس جیسا شاعر اب پیدا نہیں ہو گا۔ اگر ذرا بھی کسی نے گڑبڑ کی تو میں یہ شراب اس کی داڑھی پر انڈیل دوں گا۔ سمجھ

گئے۔ مغرور بھڑ بھڑیو!"

باورچی خانہ جو چند لمحے پہلے ہلڑبازی کا اکھاڑا بنا ہوا تھا ایک دم خاموش ہو گیا۔ صرف اس بڑے پتیلے میں سے شام کے کھانے کے پکنے کی آواز آ رہی تھی۔ بونے نے اپنے شاگرد کو اشارہ کیا۔ بارہ سالہ باورچی خانہ کا ملازم ایک بانسری لے آیا اور اس کے تار ٹھیک کرنے لگا۔ پھر اس نے اپنے استاد کی طرف اشارہ کیا اور وہ چھوٹا سا استاد ابن قزمان کی زجل اتنی سریلی آواز میں گانے لگا کہ سب وجد میں آ گئے'

لو۔ اسے سنہری سمندر سے بھر دو
اور یہ خوبصورت پیالہ مجھے دے دو
پرانی شراب کا دور چلنے دو
اس کے سنیہ پر بلبلے موتیوں کیطرح چمک رہے ہیں
لگتا ہے کہ رات کے اندھیرے چھٹ گئے ہیں
واللہ۔ کیسے سینکڑوں جام جھلک پڑے ہیں
یہ ستاروں کے جھرمٹوں سے کشید کی ہوئی شراب ہے
بجتے ہوئے سروں کے ساتھ جام بڑھاؤ
یہاں اس پھولوں بھرے غالیچہ پر دور چلے
جہاں شبنم کے تازہ قطرے زمین کو سیراب کر رہے ہیں
اور میرے اعضاء کو بڑے پیار سے غسل دے رہے ہیں
یہ ٹھنڈی خوشبوؤں کا حسین غسل
میرے ساتھ چمن کے سبزہ زار میں
تنہا ایک مغنیہ جادو بکھیر رہی ہے۔
اس کی مسکراہٹ نور برسا رہی ہے
میری جھجک دور ہو گئی ہے۔ کوئی دیکھنے والا نہیں
اور' "واللہ" میں نے نعرہ لگایا۔ "آؤ جشن منائیں"

سب نے تالیاں بجائیں اور سب سے زیادہ یزید نے۔

"بونے" وہ خوشی سے چلایا۔ "تم باورچی خانہ چھوڑو اور مغنی بن جاؤ۔ تمہاری آواز بڑی خوبصورت ہے۔"

بونے نے لڑکے کو گلے لگایا اور اس کے سر کو چوما۔

"اب وقت گزر چکا ہے یزید بن عمر۔ یہ گانے کی عمر نہیں۔ بلکہ کسی چیز کی بھی عمر نہیں۔ میرا خیال ہے کہ اب تم دوڑ کر بی بی زبیدہ کو وہ اطلاع دے دو جس کے لئے انہوں نے تمہیں یہاں بھیجا تھا۔"

یزید اپنی ماں کی بات بالکل ہی بھول گیا تھا

"کیا پوچھا تھا۔ بونے؟"

"تم تو میرے شام کے اسٹو کے مصالحے بھی بھول گئے ہو۔"

یزید نے سر کھجایا۔ دماغ پر زور دیا لیکن اسے ایک مصالحہ بھی یاد نہ آیا۔ وہ فخریہ نغمہ میں اتنا کھو گیا تھا کہ اسے باورچی خانے میں آنے کی وجہ ہی یاد نہیں رہی تھی۔ بونا اسے یاد دلانے لگا۔ لیکن اس طرح کہ وہ اب نہ بھول سکے۔ اس لئے اس نے لے اور سر میں مصالحوں کی تفصیل بیان کرنی شروع کر دی۔ یزید اس لے سے مانوس تھا۔ بونا قرات کے انداز میں پڑھ رہا تھا۔

اے میرا بتایا ہوا کھانا کھانے والو! غور سے سنو۔ آج میں نے اپنا پسندیدہ اسٹو تیار کیا ہے۔ جو غروب آفتاب کے بعد کھایا جا سکتا ہے۔ اس میں تمہیں ملیں گے پچیس آلو باریک کٹے ہوئے' بیس شلغم' صاف کٹے ہوئے اور باریک تراشے ہوئے' دس داشین چھلے ہوئے' چمکتے ہوئے اور اس میں ملانے کے لئے دنبے کے دس سینے چار تازہ چوزے جن کا خون صاف کر دیا گیا ہے۔ ایک دہی کا پیالہ' جڑی بوٹیاں' مصالحے جن سے اس کا رنگ گدلا سا ہو جاتا ہے۔ اس میں کچھ گنے کا رس ملاؤ اور واللہ' یہ تیار ہے۔ یزید ایک بات یاد رکھو۔ گوشت اور سبزی کو الگ الگ بھونا چاہئے اور پھر جس برتن میں سبزی بنی ہے اس میں پانی ڈال کر دونوں کو ملا دو۔ اس کو آہستہ آہستہ ابلنے دو۔ جب تک ہم گائیں بجائیں۔ چاول تیار ہیں۔ گاجریں' مولیاں' مرچیں' ٹماٹر' پیاز وغیرہ دھلے دھلائے تیار رکھے ہیں تاکہ تمہاری پلیٹوں کے اندر اسٹو میں ڈالے جائیں۔ کیا تم یہ سب کچھ یاد رکھ سکتے ہو۔ یزید بن عمر۔

"ہاں!" یزید کچن سے دوڑتے ہوئے اور لفظوں کو لے میں دہراتے ہوئے چلایا۔

بونا لڑکے کو باغ میں سے دوڑتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس کے پیچھے پیچھے اماں دوڑ رہی تھی۔ بونا مسکرایا۔

"ابن فرید کے پڑپوتے کا کیا بنے گا؟" اس نے بغیر کسی کو مخاطب کئے' کہا۔

یزید دوڑتا ہوا ماں کے کمرے میں گیا اور بونے کے بتائے ہوئے الفاظ دہرائے۔

اس کا باپ مسکرایا اور اگر تم قرآن بھی اسی آسانی سے یاد کر لیتے' میرے بچے تو

ہمارے گاؤں والے بہت خوش ہوتے۔ جاؤ اور کھانے سے پہلے ہاتھ منہ صاف کرو۔

بچے کو دوڑ کر جاتے ہوئے دیکھ کر زبیدہ کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

"وہ پھر خوش ہے"

عمر ابن عبداللہ اور اس کی بیوی اپنی چھوٹی بیٹی کے متعلق سوچ رہے تھے۔ زبیدہ نے تھوڑی بہت ترمیم کے ساتھ اناروں کے درمیان ہونے والے واقعات اپنے شوہر کو بتائے اس خیال سے کہ وہ ناراض نہ ہو۔ اس نے پام کے درخت اور کھجوروں وغیرہ کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ ابن داؤد کے تحمل اور غیرت مندی سے عمر بہت متاثر ہوا۔ ہند سے شادی کرنے کی اسے اجازت لینے کے لئے اتنا ہی بہت تھا۔ اس موقع پر زبیدہ نے اپنے خدشات کا اظہار کیا۔

"کیا تمہیں ایسا نہیں لگتا کہ ابن داؤد دوسرے لوگوں میں بھی دلچسپی لیتا ہو؟"

"کیوں؟ صرف اس لئے کہ اس نے تمہاری بیٹی کی عزت سے کھیلنے کی دعوت قبول نہیں کی؟"

زبیدہ زیادہ تفصیلات میں نہیں جانا چاہتی تھی اس لئے اس نے مزید کچھ نہیں کہا "نہیں" اس نے کہا "مجھے کچھ ایسا خیال ہوا تھا۔ کھانے کے بعد جب تمہاری اس سے بات چیت ہو تو میری تسلی کے لئے ذرا اس سے پوچھ لینا۔

"کیا؟" عمر چلایا "اپنی ہند کے متعلق اس کے احساسات جاننے کے بجائے میں اس کی تفتیش شروع کر دوں جیسے وہ ایک غلیظ ہو جس نے اپنی حیثیت کا ناجائز فائدہ اٹھایا ہو۔ شاید اسے اس سے دکھ بھی پہنچے۔ نہیں۔ نہیں۔ نہیں یہ تمہیں زیب نہیں دیتا۔"

"عمر" زبیدہ نے غصہ سے گھورتے ہوئے کہا "میں اپنی بیٹی کو کسی ایسے شخص سے شادی نہیں کرنے دوں گی جو اسے خوش نہ رکھ سکے۔"

"اور اگر تمہارے والد نے شادی کی اجازت دینے سے پہلے مجھ سے یہی سوال کیا ہوتا؟"

"لیکن اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی، کیوں میاں؟ مجھے اس معاملے میں تم پر کوئی شک نہیں تھا۔"..... زبیدہ نے ذرا نخرے سے کہا اور یہ ایسی غیر متوقع بات تھی کہ وہ ہنس پڑا۔

"خاتون، اگر آپ اصرار کرتی ہیں تو میں کوئی ایسی صورت نکال لوں گا کہ اسے ناراض کئے بغیر بات چھیڑ دوں"

"اس پر ناراضگی کی کیا بات ہے۔ تم کوئی ایسی بات نہیں کر رہے جو ہوتی نہ ہو"

متذکرہ نوجوان اپنے کمرے میں تھاا ور کھانے پر جانے کے لئے تیار ہو رہا تھا۔ اسے ایک عجیب سا ناقابل بیان احساس ہو رہا تھا اور وہ اداسی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس نے ہند کو مایوس کیا ہے۔ وہ سہ پہر کے واقعات میں گم تھا اور اب خوف کی جگہ ایک ولولہ محسوس کر رہا تھا۔

"کیا وہ کسی طرح میرے ذہن سے نکل نہیں سکتی؟" اس نے چغہ پہنتے ہوئے سوچا۔ "میں اس کے متعلق سوچنا نہیں چاہتا۔ لیکن کچھ اور بھی نہیں سوچ سکتا۔ اس کا خیال زبردستی میرے خیالوں پر چھایا جا رہا ہے۔ میں بھی کتنا احمق ہوں۔ مجھے بتا دینا چاہئے تھا کہ میں نے صرف ایک بار محبت کی ہے اور وہ بھی ایک مرد سے میں نے ایسا کیوں نہیں کیا۔ کیا اس لئے کہ میں اسے بہت چاہتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ مجھے رد کر دے۔ میں اسے بیوی بنانا چاہتا ہوں۔ منصور کی موت کے بعد وہ واحد شخص ہے۔ جس سے میں نے محبت کی ہے۔ دوسرے مردوں نے بھی میرے ساتھ تعلقات بڑھانے کی کوشش کی لیکن میں نے ان کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ ہند نے پھر مجھے بے قرار کر دیا ہے۔ اسے دیکھ کر میں کانپنے لگتا ہوں لیکن اس نے میرے چہرے میں کیا دیکھا؟"

کھانے پر جاتے ہوئے یزید نے ابن داؤد کو چونکا دیا۔

"السلام علیکم ابن داؤد"

"وعلیکم السلام"

"آپ کو بتاؤں کہ آج بونے نے کیا پکایا ہے؟"

جب ابن داؤد نے اثبات میں سر ہلایا تو یزید نے مسالوں کی اتنی مکمل تفصیل بونے کی نقل کرتے ہوئے بتائی کہ اس کا استاد جس نے بونے سے یہ نہیں سنا تھا واقعی مرعوب ہو گیا۔ وہ ایک ساتھ کھانے کے کمرے میں داخل ہوئے۔

ابن داؤد اپنے شاگرد سے تعلقات بحال ہونے پر بہت خوش تھا۔ وہ اسے ایک اچھا شگون سمجھتا تھا۔ کھانے پر ہر شخص اس کے ساتھ نہایت ہی شفقت کے ساتھ پیش آیا۔ بونے کا بنایا ہوا اسٹو سب نے بہت پسند کیا اور لوگوں نے خوب پیٹ بھر کر کھایا۔

میگوئل قرطبہ واپس جا چکا تھا۔ زہرہ کا انتقال ہو گیا تھا۔ زہیر غرناطہ میں تھا اور کلثوم اشبیلیہ میں اپنے رشتہ کے بہن بھائیوں اور آئندہ ہونے والے سسرال میں گئی ہوئی تھی۔ کھانے کے کمرے میں خاندان کے افراد کی تعداد بہت ہی کم ہو گئی تھی۔ اس طرح سے یہ

حلقہ جس میں ابن داؤد بھی شامل تھا بہت مانوس اور بے تکلف ہو گیا تھا۔ زبیدہ نے دیکھا کہ وہ مسکرا کر ہند کی آنکھوں میں جھانک رہا ہے اور اس سے اسے اطمینان ہوا۔

شاید اس کا خدشہ بے بنیاد تھا۔ شاید اسی کی نسبت عمر کا اندازہ زیادہ صحیح تھا۔ وہ کچھ مجرم سی محسوس کر رہی تھی اور اپنے شوہر سے کہنا چاہتی تھی کہ وہ لڑکے سے کوئی ایسی ویسی بات نہ کرے۔ لیکن اس کا موقع نہیں تھا۔ عمر نے بات شروع کر دی تھی۔

"ابن داؤد" صاحب خانہ نے کہا۔ "کافی پینے کے بعد ذرا کچھ دور میرے ساتھ ٹہلنے چلو گے؟"

"میری بڑی عزت افزائی ہو گی"

"کیا میں بھی آپ کے ساتھ چلوں "یزید نے ایسے ہی پوچھا۔ چونکہ زہیر موجود نہیں تھا اس لئے وہ سمجھتا تھا کہ ایسے موقعوں پر اسے ساتھ ہونا چاہئے۔

"نہیں" ہند نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ہم شطرنج کھیلیں گے۔ میرا خیال ہے کہ دس چالوں میں میں تمہارے بادشاہ کو گھیر لوں گی۔"

یزید کو مایوسی ہوئی۔ لیکن اس کی بہن اس پر حاوی رہی۔

کچھ سوچ کر اس نے اپنے باپ سے کہا "میں گھر پر ہی رہوں گا۔ باہر ٹھنڈ بڑھتی جا رہی ہے۔"

"یہ بڑی سمجھداری کی بات ہے "عمر نے فرش سے اٹھتے ہوئے کہا اور ٹیرس والے راستہ سے نکل گیا۔ ابن داؤد زبیدہ کے سامنے تعظیماً" جھکا اور بڑی التجا آمیز نظروں سے ہند کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہا ہے کہ اس پر زیادہ سختی نہ کرے۔ پھر عمر کے پیچھے پیچھے باہر چلا گیا۔

"میرے کمرے میں جاؤ اور بساط پھیلاؤ" ہند نے بھائی کو ہدایت کی۔ "میں ابھی ایک منٹ میں آتی ہوں۔"

"میرا خیال ہے ہم نے ابن داؤد کو سمجھنے میں غلطی کی" زبیدہ نے بچے کے جاتے ہی کہا "کیا آپ نے کھانے کھاتے وقت اس کی طرف دیکھا۔ وہ صرف آپ ہی کو دیکھ رہا تھا۔" ہو سکتا ہے وہ کچھ گھبرایا ہوا ہو لیکن اسے تم سے بہت لگاؤ ہے"

"ہو سکتا ہے کہ آپ ٹھیک ہی کہہ رہی ہوں لیکن میرے جذبات کا وہ پہلا سا ہیجان اب نہیں رہا۔ میں اب بھی اسے پسند کرتی ہوں۔ شاید محبت ہی کرنے لگی لیکن اس میں وہ شدت نہیں رہی جو میں پہلے محسوس کرتی تھی۔ سہ پہر کے بعد سے مجھے سر میں درد محسوس

ہو رہا ہے"

"ہند! ہمارے عظیم ترین حکیم بھی دل کے معاملات کو نہیں سمجھ سکے۔ مجھ کو ایک موقع دو۔ بڑی حد تک میری طرح ہو۔ ضرورت سے زیادہ بے صبر ہر چیز کا فوراً مطالبہ کرنے والی۔ تمہارے باپ کے ساتھ میرا رویہ ایسا ہی تھا اور ان کے والدین نے یہ سمجھا کہ شاید یہ میری طمع ہے"

"یقیناً امی" ہند نے دھیمی سی آواز میں کہا۔ "ہمیں نہیں معلوم کہ ہم میں سے کس کے پاس کتنا وقت ہے۔ جب آپ جوان تھیں تو سلطان الحمراء کے محل میں تھا اور دنیا بہت محفوظ نظر آتی تھی۔ آج ہماری زندگیاں بے یقینی کا شکار ہیں۔ گاؤں میں ہر شخص خود کو غیر محفوظ سمجھتا ہے۔ یہاں تک کہ اب خوابوں کا سحر بھی ختم ہو گیا ہے۔ ہمارے خواب بھی بدمزہ ہو گئے ہیں۔ آپ کو یاد ہے جب یزید رو رہا تھا اور زہیر کو چمٹا ہوا تھا اور منتیں کر رہا تھا کہ وہ غرناطہ نہ جائے؟"

"کیا کوئی ماں ایسے منظر کو بھول سکتی ہے"

"یزید کو اس تکلیف میں دیکھ کر مجھے بہت غصہ آیا اور میں نے زہیر کے کان میں کوئی سخت سی بات کہی۔ نہایت احمقانہ۔ میں نے کہا کہ وہ شروع سے ہی خود غرض ہے۔ اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔ اس نے یزید کو نیچے اتارا اور مجھے ایک طرف لے گیا۔ پھر غصہ سے اس نے میرے کان میں کہا "زندگی کے جھمیلوں میں پڑنے سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ ہمیں صرف یہ سوچنے کی آزادی ہے کہ ہمیں کس طرح مرنا ہے اور تم مجھ سے وہ آزادی بھی چھین لینا چاہتی ہے"

زبیدہ نے ہند کو گلے سے لگایا اور زور سے بغلگیر ہوئی۔ پھر وہ دونوں کچھ نہیں بولیں۔ اسی خاموشی میں صرف باہر سے ہوا کے چلنے کی آواز آ رہی تھی۔ ان کے جسم سرگوشی کر رہے تھے۔

"ہند! ہند!۔ یزید کی آواز نے دونوں کو چونکا دیا "میں انتظار کر رہا ہوں۔ جلدی کرو۔ میں نے اپنی چالیں سوچ لی ہیں"

دونوں عورتیں مسکرائیں۔ کچھ چیزیں کبھی نہیں بولتیں۔

باہر رات کی نیلی روشنی میں عمر اور ابن داؤد گھر کی چار دیواری کے ساتھ ساتھ ٹہل رہے تھے وہ بھی اپنی دنیا کی صورت حال پر غور کر رہے تھے لیکن اس کا انداز زیادہ فلسفیانہ تھا۔ جب وہ چوکیداروں سے ذرا دور نکل گئے تو عمر نے سوچا کہ اب کوئی نہیں سن رہا ہے

اور اسے وقت ضائع نہیں کرنا چاہئے۔

"میں نے سنا ہے کہ آج دوپہر کھانے کے بعد تم ہند کے ساتھ چہل قدمی کو گئے تھے۔ وہ ہمارے لئے ایک خزینہ ہے۔ اس کی ماں اور میں اسے بہت چاہتے ہیں۔ ہم نہیں چاہیں گے کہ اسے کوئی تکلیف ہو یا وہ پریشان ہو'

'مجھے بڑی خوشی ہوئی تھی جب آپ نے مجھے ٹہلنے کی دعوت دی تھی۔ میں ہند سے محبت کرتا ہوں۔ میں آپ سے اس کے ساتھ شادی کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔'

"ایک بات یاد رکھو ابن داؤد" عمر نے بزرگانہ لہجہ میں کہا کوئی اندھا آدمی ہی چھت پر رفع حاجت کرے گا اور سوچے گا کہ اسے کوئی نہیں دیکھ رہا ہے'

ابن داؤد کانپنے لگا۔ اسے پتہ نہیں تھا کہ عمر کو کتنا کچھ معلوم ہے۔ شاید یزید نے اپنی ماں کو بتا دیا ہو۔ ہو سکتا ہے کنیزوں نے باتیں کی ہوں۔ شاید...

'میرا مطلب یہ ہے میرے عزیز دوست کہ ایک ہی گڑھے میں دو دفعہ گرنے کا کوئی جواز نہیں' اب اس کی سمجھ میں آیا۔

'میں ہند سے' آپ سے یا بی بی زبیدہ سے کوئی بات چھپانا نہیں چاہتا' ابن داؤد نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا چند برس پہلے ایک واقعہ ہوا تھا۔ میرا ایک ہم جماعت تھا۔ ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ ایک سال ہوا کہ اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کے علاوہ میرے کسی مرد یا عورت سے کوئی تعلقات نہیں رہے۔ ہند کے ساتھ میں اپنے دوست سے بھی زیادہ محبت کرتا ہوں۔ اسے کوئی دکھ پہنچانے سے پہلے میں مرجانا بہتر سمجھوں گا۔ اگر آپ اپنی سمجھ اور تجربہ سے' آپ اور بی بی زبیدہ محسوس کرتے ہیں کہ میں اس کے لئے مناسب نہیں ہوں تو مجھے بتا دیجئے۔ میں کل ہی آپ کے دولت کدے کو چھوڑ جاؤں گا۔ آپ کا فیصلہ میرے لئے آخری فیصلہ ہو گا'

ہوا رک گئی تھی۔ آسمان صاف تھا۔ ابن داؤد کی صاف گوئی نے رات کے اندھیرے کو دور کر دیا تھا اور عمر کا دل کھل اٹھا تھا۔ گو اس نے زبیدہ سے کچھ نہیں کہا تھا لیکن اس کے خدشات سے وہ پریشان ہو گیا تھا۔ بہت سے گھروں میں ایسے ناخوشگوار واقعات ہوئے تھے جہاں مرد صرف ایک دوسرے کے لئے رہتے تھے اور عورتیں پڑی پڑی سوکھتی رہتی تھیں۔ اپنے خاوندوں کے لئے وہ محض بچے پیدا کرنے کے لئے تھیں۔ عمر کا اپنا بڑا چچا ابن فرید کا چھوٹا بھائی بھی اس گھر میں رہتا تھا۔ اسی نے اپنے مرد عاشق کو ٹھکرا دیا تھا لیکن شادی کا کبھی نہیں سوچا۔

'تو پھر آپ اجازت دیتے ہیں۔' ابن داؤد کو عمر نے بیچ میں ہی ٹوک دیا۔

اس سے بھی زیادہ۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ ہند کو بہت جہیز ملے گا۔'

میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جہیز میں مجھے کوئی دلچسپی نہیں'

کیا تم صاحب دولت ہو؟'

بالکل نہیں۔ میری زندگی میں دولت کی کوئی خاص حیثیت نہیں رہی'

جب وہ واپس لوٹ رہے تھے تو عمر اندر ہی اندر خوش ہو رہا تھا۔ غریبی میں ایک ہی قابل قدر بات ہے کہ یہ کچھ لوگوں کو وہ وقار عطا کرتی ہے جو دولت سے حاصل نہیں ہوتا

کوئی بات نہیں ابن داؤد۔ جہیز بہرحال تمہیں ملے گا۔ میرے پوتے پوتیاں میری دور اندیشی کے ممنون ہوں گے۔ یہ بتاؤ کہ کیا تم نے طے کر لیا ہے کہ کہاں رہو گے؟۔ کیا قاہرہ واپس جاؤ گے'

نہیں۔ وہی ایسی جگہ ہے جہاں میں رہنا نہیں چاہتا۔ میں یہ تمام معاملات ہند کے ساتھ طے کروں گا لیکن مغرب کا جو شہر مجھے سب سے زیادہ پسند ہے وہ فیض ہے۔ یہ غرناطہ سے مختلف نہیں ہے لیکن وہاں آرچ بشپ سسرینوس نہیں ہے اور پھر ابن خلدون' اگر میری دادی کا بیان صحیح ہے تو اس کی بہت تعریف کرتا تھا اور مستقلاً" وہیں رہائش اختیار کرنا چاہتا تھا'

جبکہ چند ہفتہ پہلے ہند کو ابن داؤد سے آنکھیں ملاتے ہوئے دیکھ کر عمر کو غصہ آیا تھا اب وہ اس نوجوان پر بہت مہربان نظر آتا تھا۔ اسے اب وہ ناگوار' ہوشیار یا مطلب پرست نظر نہیں آتا تھا اور اس کے اس اعتماد سے بھی متفق تھا کہ وہ محض اپنی ذہانت کے زور پر زندگی گزار سکتا ہے۔ جب وہ اندرونی صحن میں پہنچے تو عمر نے محسوس کیا کہ وہ ان چند لوگوں میں سے ہے جن کے ساتھ ہند خوش رہ سکتی ہے۔ اس نے ابن داؤد کو گلے لگایا۔

"خدا حافظ۔ شب بخیر"

"خدا حافظ" قاہرہ کے عالم نے جواب دیا۔ جذبات کی شدت سے اس کی آواز گلے میں اٹک رہی تھی جسے چھپانے کی وہ بہت کوشش کر رہا تھا۔

جب عمر اپنی بیوی کی خوابگاہ میں داخل ہوا تو ہند اپنی ماں کے پاؤں اور ٹانگیں دبا رہی تھی۔ اس کے آتے ہی زبیدہ اٹھ بیٹھی۔

"ہاں؟"

بازی کون جیتا ہند؟" عمر نے صرف اتنا کہا تاکہ اس کی بیوی کا اشتیاق بڑھے

"عمر! زبیدہ نے پوچھا "کیا رہا"- عمر نے بڑے سکون اور بے نیازی سے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا- "جیسا سوچا تھا ویسا ہی ہوا" اس نے جواب دیا- "لڑکا واقعی ہماری بیٹی کو چاہتا ہے- اس میں مجھے ذرا بھی شک نہیں- میں نے اسے اجازت دے دی ہے اب ہند کی مرضی ہے"

"میرے خدشات-" زبیدہ نے زور دے کر کہا "کیا وہ بالکل غلط تھے؟"

زبیدہ مطمئن ہو کر مسکرائی "فیصلہ تم پر ہے- صرف تم پر- میری بچی- ہم خوش ہیں"

اس گفتگو سے ہند کے چہرے پر سرخی آ گئی- اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا "آج میں اس پر اچھی طرح غور کروں گی" اس نے اعتماد سے کہا "اور کل- آپ کو میرا جواب مل جائے گا"

پھر اس نے باری باری والدین کو بوسے دیئے اور بڑے وقار کے ساتھ کمرے سے باہر چلی گئی-

اپنے کمرے کی محفوظ فضا میں پہنچ کر وہ ہنسنے لگی- پہلے خاموشی سے اور پھر زور زور سے یہ ہنسی اس کی جیت کا اظہار تھی- وہ خوش تھی- لیکن اس میں کسی حد تک ایک جنون کی سی کیفیت بھی تھی- "کاش کہ تم مری نہ ہوتیں- بڑی چچی زہرا" ہند- آئینہ دیکھ رہی تھی اور اپنے چہرے کا جائزہ لے رہی تھی جس کی فطری نفاست چراغ کی روشنی میں اور بھی بڑھ گئی تھی- "میں تم سے بات کرنا چاہتی ہوں- میں نے سوچا ہے کہ اس سے شادی کروں گی لیکن پہلے میں خود کو یہ یقین دلانا چاہوں گی کہ اس کی محبت سچی ہے اور اس کا ایک ہی طریقہ ہے- آپ نے خود مجھے بتایا تھا-"

جب وہ مطمئن ہو گئی کہ جو کچھ وہ کرنے لگی ہے- ٹھیک ہے تو ہند نے چراغ گل کیا اور دبے پاؤں صحن میں آ گئی- گھور اندھیرا تھا- بادل لوٹ آئے تھے اور ستارے چھپ گئے تھے- اس نے کچھ دیر انتظار کیا کہ وہ اس اندھیرے سے مانوس ہو جائے اور پھر ڈرتی ڈرتی مہمان خانے کی طرف بڑھی-

وہ ابن داؤد کے کمرے کے باہر رکی تاکہ سانس لے سکے- اس نے چاروں طرف غور سے نظر کی- ہر چیز ساکت تھی- ابن داؤد کے کمرے میں روشنی تھی- اس نے ہلکے سے دروازے کو دستک دی- کمرے میں ابن داؤد پریشان ہو گیا- اس نے چادر اوڑھی - بستر سے نکلا اور دروازہ کھول دیا-

"ہند!" اسکو اسقدر تعجب ہوا کہ اپنی آواز بھی سنائی نہیں دی- "اندر آجاؤ"

ہند کمرے میں آ گئی- چادر سنبھالتے ہوئے اسے دیکھ کر ہند کو بڑی ہنسی آئی جسے وہ دبانے کی کوشش کرتی رہی- پھر وہ بستر پر بیٹھ گئی-

"میرے ابو کہتے ہیں کہ انہوں نے تمہیں مجھ سے شادی کی اجازت دے دی ہے"

"بشرطیکہ کہ تم راضی ہو- تمہارے والد نے اتنا ہی کہا"

"ہاں- انہوں نے تم سے اور کیا کہا؟"

"وہی - جو میں تم سے کئی روز پہلے کہنا چاہتا تھا- میں نے بڑی حماقت کی ہند- شاید میں ڈر گیا تھا کہ کہیں تمہیں کھو نہ دوں"

"تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟"

ابن داؤد نے مرحوم منصور سے اپنی محبت کی داستان سنائی جس میں وہ تفصیلات بھی شامل تھیں جو ہند کے لئے اذیت کا باعث ہو سکتی تھیں- اس نے بتایا کہ وہ کس طرح جامعہ الازہر میں ایک ہی کمرے میں رہتے تھے- کیسے ایک دوسرے کے ساتھ جذباتی طور پر وابستہ تھے اور کس طرح ایک رات ان کی ذہنی ہم آہنگی جسمانی لگاوٹ میں بدل گئی- وہ ایک دوسرے سے کتنے مانوس ہو گئے تھے اور پھر منصور کا انتقال ہو گیا-

"یہ تم ہی تھیں کہ جنہوں نے مجھے نئی زندگی دی"

"مجھے اس کی خوشی ہے- غالباً تمہیں احساس ہو گیا ہو گا کہ میں ان میں سے ہوں جو ایک ٹوٹے ہوئے دل کو اس پرسکون خوشی کو ترجیح دیتے ہیں جس کی بنیاد عموماً خود فریبی اور دھوکے پر مبنی ہوتی ہے- بہت سی شادیاں بالکل کھوکھلی ہوتی ہیں میری کئی رشتہ دار بہنوں کے شوہر بالکل گنوار اور بے حس ہیں- صرف شادی کے لئے شادی کرنا مجھے بالکل منظور نہیں- میں ایک بات پوچھوں؟"

"جو آپ کا جی چاہے-" ابن داؤد کی آواز میں ایک بے قراری تھی جو کسی حد تک کم ہو رہی تھی-

"ہم اچھے دوست بن سکتے ہیں- مل کر شاعری کریں گے- ایک ساتھ شکار پر جائیں گے- ستاروں کی باتیں کریں گے لیکن کیا تمہیں یقین ہے کہ جب سورج ڈوب جائے گا تو تمہیں اپنے پہلو میں کسی عورت کی ضرورت محسوس ہو گی؟"

"میں سہ پہر سے تمہارے لئے تڑپ رہا ہوں- میں بہت الجھا ہوا اور تذبذب کا شکار تھا لیکن میرے جسم پر پھرتے ہوئے تمہارے ہاتھ ایک ایسا تجربہ ہیں جو میں صرف رات کو ہی نہیں بلکہ طلوع آفتاب کے وقت بھی دہرانا چاہوں گا"

جب اس نے اس کے چہرے کو تھپتھپایا تو وہ پھر جذباتی ہو گئی

"تمہارے دل کی دھڑکن سے سارا گھر اٹھ جائے گا" اس نے چراغ بجھا کر اس کے ساتھ بستر میں گرتے ہوئے کہا

"تم چاہتی ہو؟ ہند؟ واقعی؟" اس نے پوچھا اور اب وہ بھی صبر نہیں کر سکتا تھا۔

ہند نے سر ہلا کر ہاں کی۔ ان کے جسم ایک دوسرے میں گھل مل گئے اور وہ کیف کے عالم میں ڈوب گئے۔

"اب تم مطمئن ہو۔" اس نے بستر جھاڑتے ہوئے سوالیہ انداز میں اس سے پوچھا۔

"ہاں۔ میرے محبوب۔ میں اب مطمئن ہوں اور تم بھی؟"

"تم کہنا کیا چاہتی ہو؟"

"میرا مطلب یہ ہے کہ منصور کے ساتھ بھی ایسا ہی لطف آتا تھا؟"

"تمہاری بات اور ہے میری شہزادی اور یہ اور ہی رہے گی۔ انار کا بھی اتنا ہی مزا ہے جتنا مچھلی کا۔ حالانکہ یہ دونوں ذائقے میں ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں۔ ان میں موازنہ کرنے سے دونوں ہی مزے خراب ہو جائیں گے۔"

"میں تمہیں خبردار کر دوں۔ ابن داؤد۔ شادی کرنے سے پہلے اگر تم مجھے کسی خوبصورت خرمہ فروش لونڈے کے لئے چھوڑ دو گے تو میرا انتقام ہولناک بھی ہو گا اور دنیا بھی دیکھے گی۔"

"تم کیا کرو گی؟"

"میں تمہیں مرد نہیں رہنے دوں گی"

اس پر دونوں ہنس پڑے۔ ابال ایک مرتبہ پھر چڑھا۔ رات بھر وہ داد وصل دیتے رہے وہ اس سے پہلے ہی سو گیا۔ وہ بہت دیر تک اس کے بدن کو دیکھتی رہی اور کیف میں گم رہی۔ اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرا کہ شاید وہ جاگ جائے لیکن وہ نہیں اٹھا۔ اس کی طلب پھر اسے چاہتی تھی لیکن نیند اور تھکن نے اس پر قابو پا لیا۔

طلوع آفتاب سے کچھ پہلے زبیدہ کمرے میں آئی۔ اسے پہلے ہی اندازہ تھا اس نے اپنی بیٹی کے منہ پر ہاتھ رکھا کہ کہیں وہ گھبرا کر چیخ نہ مارے اور اپنے محبوب کو پریشان نہ کرے۔ پھر اس نے زور سے اسے ہلایا۔ یہاں تک کہ اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ زبیدہ کو دیکھتے ہی وہ بستر میں سیدھی بیٹھ گئی۔ زبیدہ نے اشارہ کیا کہ وہ خاموشی سے باہر چلی جائیں۔

"مجھے اس سے محبت ہے۔ میں اس سے شادی کروں گی" صحن عبور کرتے ہوئے ہند

غنودگی کے عالم میں کہتی رہی۔

"مجھے یہ سن کر واقعی خوشی ہوئی ہے" ماں نے جواب دیا "لیکن میرا خیال ہے کہ آج شام ہی تمہارا اس سے نکاح ہو جائے۔"

باب 10

زمنس ڈیسک پر بیٹھا ہوا سوچ میں گم ہے۔

میری جلد اتنی چٹی نہیں ہے۔ میری آنکھیں نیلی نہیں بلکہ گہرے بھورے رنگ کی ہیں۔ میری ناک طوطے جیسی اور لمبی ہے لیکن پھر بھی مجھے یقین ہے۔ پورا یقین ہے کہ میرے خون میں کسی طرح کی ملاوٹ نہیں۔ جب رومیوں نے یہاں قدم رکھا تو میرے آباؤاجداد یہیں تھے۔ میرا خاندان لائق احترام کاؤنٹ اور شیر دل کیپٹن جنرل کے خاندان ویزیگوتھ کے خاندان سے بہت قدیم ہے۔ وہ کیوں یہ افواہیں اڑاتے ہیں کیوں کہ میری رگوں میں یہودی خون دوڑتا ہے؟ کیا یہ صرف اور صرف بھونڈا مذاق ہے؟ یا کچھ میرے دشمن دومینسکن مجھے بدنام کرنے کے لئے چرچ میں یہ زہر پھیلا رہے ہیں تاکہ وہ پھر ہمیں فریبوں کی دلدل میں پھینک دیں اور ہمارے اور موسیٰؑ اور محمدؐ کے ماننے والوں کے درمیان ہر طرح کے فرق کو گڑبڑا دیں۔ وہ کچھ بھی سوچتے ہوں یہ بات صحیح نہیں ہے۔ سنا آپ نے! یہ صحیح نہیں ہے۔ میرا خون اصل ہے۔ اتنا ہی اصل جتنا ہم اس سلطنت کو ایک درہ بنا دیں گے۔ ان مسلسل ذلت آمیزیوں کے خلاف نہ میں رووں گا نہ احتجاج کروں گا اور خدا کے لئے کام کرتا رہوں گا۔ بھیڑیے مجھے جانور کہتے ہیں۔ لیکن ان میں جرات نہیں کہ وہ مجھ پر ہاتھ ڈالیں۔ اس لئے وہ جانتے ہیں کہ میرا خون انہیں بہت مہنگا پڑے گا۔ مقدس مریم اور اس کا غم جسے سولی پر چڑھا دیا گیا میرے اندر ایک پراسرار جذبے کو جگاتا ہے۔ اپنے خوابوں میں خود کو ایک صلیبی سپاہی کی شکل میں دیکھتا ہوں جو یروشلم کی فصیل سے قسطنطنیہ کا جائزہ لے رہا ہے۔ میری تمام یادیں عیسائی عہد سے متعلق ہیں لیکن میں اس قدر تنہا کیوں ہوں؟ اپنے خوابوں میں بھی تنہا؟ نہ میرا کوئی گھر ہے نہ دوست۔ ادنیٰ نسلوں کے

لئے میرے دل میں کوئی رحم نہیں۔ میرے اندر کوئی یہودی خون نہیں ہے۔ ایک قطرہ بھی نہیں۔ نہیں۔ اس میں مجھے ذرہ برابر بھی شک نہیں۔

چند گھنٹے پہلے ایک سپاہی نے زمنس کو اطلاع دی تھی کہ گزشتہ رات ضیافت کے بعد جب مسلمان۔ عیسائی عمائدین اور یہودی سوداگر شراب میں دھت تھے اور رقاصائیں ان کی دلجوئی کر رہی تھیں ایک درباری نے کہا کہ افسوس کی بات ہے کہ ٹولیڈو کا آرچ بشپ اس جشن طرب سے لطف اندوز نہیں ہو رہا ہے تو کیپٹن جنرل ڈون اینگو کو یہ کہتے سنا گیا کہ پادری کی غیر حاضری کا سبب شاید یہ ہے کہ موم بتیوں کی روشنی میں اس میں اور کسی یہودی میں شناخت کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ اس نے اسی پربس نہیں کیا بلکہ قہقہوں کے درمیان بہت زور دے کر بلند آواز میں کہا کہ یہی وجہ ہے کہ وہ عربوں سے بھی زیادہ یہودیوں سے کنی کاٹتا ہے۔ اس لئے کہ ایک طرف عیسائیوں اور مسلمانوں کی شکلوں میں کوئی فرق نہیں کیا جا سکتا یہودیوں نے اپنی خصوصیات کو برقرار رکھا ہے اور زمنس کے چہرے سے یہ بالکل واضح ہو جاتا ہے۔

اس موقع پر ایک عرب رئیس نے اپنی گھنی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اور آنکھوں میں ایک خاص چمک پیدا کرتے ہوئے ڈون اینگو سے پوچھا کہ کیا یہی وجہ تو نہیں ہے کہ آرچ بشپ خدائے واحد کے ماننے والوں کو اس لئے برباد کرنے پر تلا ہوا ہے کہ وہ اپنی نسلی نجاست کو ثابت کرے نہ کہ اس لئے کہ وہ تثلیث کا حامی ہے۔ ڈون اینگلو نے اپنے چہرے پر ایک مصنوعی معنی خیز سنجیدگی طاری کرتے ہوئے جواب دیا تھا کہ یہ بات ماننے والی نہیں ہے۔ اور پھر اس نے حاضرین کو آنکھ ماری تھی۔

زمنس نے غصہ سے ہاتھ ہلاتے ہوئے مخبر کو رخصت کیا اور اسے یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ وہ ایسی چھوٹی چھوٹی بہتان طرازیوں کی پروا نہیں کرتا۔ لیکن حقیقت میں غصہ سے اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔ یہ بات کہ عیار عرب بدمعاش اسے برا بھلا کہتے تھے اور اس پر لعنت بھیجتے تھے سب کو معلوم تھی۔ کوئی ایک دن بھی ایسا نہیں گزرتا تھا جب اسے یہ اطلاع نہ دی جاتی کہ اسے شہر کی فلاں گلی میں فلاں شخص نے برا بھلا کہا تھا۔ یہ فہرست بہت طویل تھی۔ لیکن وقت آنے پر وہ ایک ایک سے نمٹ لے گا۔ جب ذہن ایسے خیالات میں گھرا ہوا ہو اور رگوں میں زہر گھول رہا ہو تو اس میں کوئی حیرانی کی بات نہیں کہ اس روز آرچ بشپ کسی رو رعایت کے موڈ میں نہیں تھا۔ ٹھیک اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔

"آجاؤ" اس نے عمداً" بڑی نحیف سی آواز میں کہا۔

بیریونیو' دربار کا ایک افسر' کمرے میں داخل ہوا اور اس نے انگوٹھی کو بوسہ دیا۔

"آپ کی اجازت سے۔ تقدس ماب۔ دو منحرف (مرتد) پرانے علاقہ میں اپنی ماں کے گھر روپوش ہو گئے ہیں۔"

"میرے علم میں یہ معاملہ نہیں ہے۔ وضاحت کرو۔"

بیریونیو نے اپنا گلا صاف کیا۔ اسے تقریروں یا وضاحتوں کی عادت نہیں تھی۔ وہ تو صرف احکامات پہنچاتا تھا۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بات کیسے کی جائے۔ اسے ان دو لوگوں کے متعلق تفصیلات کا علم نہیں تھا۔ "میں صرف ان کے نام جانتا ہوں۔ حضور والا۔ ابینگارسیا اور ابینفرنا ندو۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ انہوں نے ہمارا مذہب اختیار کر لیا تھا۔"

"اب مجھے یاد آیا" اس نے بڑی سرد مہری سے کہا۔ "انہوں نے محض دکھاوے کے لئے مذہب بدلا تھا۔ اصل میں وہ مسلمان ہی رہے۔ وہ چرچ میں بے حرمتی کرتے ہوئے بھی پکڑے گئے تھے۔ انہوں نے صلیب پر پیشاب کیا تھا۔ سمجھے۔ انہیں میرے پاس لاؤ۔ میں آج ہی ان سے پوچھ گچھ کروں گا۔ اب تم جا سکتے ہو۔"

"کیا میں کمک ساتھ لے لوں۔ حضور والا؟ ہو سکتا ہے کوئی مزاحمت ہو"

"ہاں۔ لیکن چھ مسلح آدمیوں سے زیادہ تمہارے ساتھ نہ ہوں۔ ورنہ ہنگامہ ہو جائے گا"

زمنس ڈیسک سے اٹھا۔ اور محرابی کھڑکی کے پاس گیا جہاں سے وہ نیچے گلی میں دیکھ سکتا تھا۔ آج صبح پہلی مرتبہ اس کے چہرے پر مسکراہٹ آئی۔ اسے اس خیال سے کچھ تقویت محسوس ہوئی کہ دربار کے اس افسر کو دیکھ کر اور اس کے ساتھ مسلح سپاہیوں کو پا کر عرب مشتعل ہوں گے۔ یہ ان کی موت ہو گی۔ نئے کیتھیڈرل کی تعمیر کا حسب معمول جائزہ لینے کے لئے جانے کے بجائے اس نے الحمرا میں ہی ٹھہرنے کا ارادہ کیا اور بیریونیو کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ رات کی ضیافت کی رپورٹ سے جو بدمزگی پیدا ہوئی تھی وہ اب کم ہو چکی تھی۔ اس جگہ اب ایک زبردست جوش نے لے لی تھی۔ زمنس اس عظیم صلیب کے سامنے دوزانو ہو گیا جس نے سہ رنگی ٹائلوں کی خوبصورت اور نفیس شکلوں کو بگاڑ دیا تھا۔

"مقدس مریم۔ خدا کی ماں۔ میری دعا ہے آج تمہارے دشمن مجھے مایوس نہ کریں۔"

جب وہ کھڑا ہوا تو اس نے محسوس کیا کہ جو آگ اس کے سر میں دہک رہی تھی اب

زیرناف آ گئی تھی۔ اس کے جسم کا وہ حصہ جو ہرپادری کے لئے معطل ہو جاتا ہے بغاوت پر آمادہ تھا۔ زیمنس نے ایک پیالہ میں کچھ پانی لیا اور غٹاغٹ چڑھا گیا۔ اس کی پیاس بجھ گئی۔

پرانے شہر کے قلب سے زبیر اور اس کے ساتھی بڑی مصنوعی بے پروائی سے نئے کیتھیڈرل کی طرف بڑھ رہے تھے۔ وہ دو دو کی قطار میں چل رہے تھے اور بہت گھبرائے ہوئے سے تھے۔ بالکل ایسے جیسے انہیں ایک دوسرے سے کوئی سروکار نہ ہو۔ لیکن اس اعتماد کے ساتھ کہ آج انہیں دو طرح سے فتح حاصل ہو گی۔ ان کا بدترین دشمن ان کے ہم مذہب ساتھیوں کو ایذا پہنچانے والا موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا اور وہ' اس کے قاتل' شہادت کا مرتبہ پائیں گے اور جنت کے حقدار ہوں گے'

آج صبح سویرے ہی انہوں نے ناشتہ پر اپنے منصوبہ کو مکمل شکل دی تھی۔ آٹھوں ایک ایک کر کے اٹھے اور ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا۔ "اب جنت میں ملاقات ہو گی"

اسی صبح سویرے سویرے زبیر عمر کو خط لکھنے بیٹھا۔ غرناطہ آتے ہوئے راستے کے واقعات بیان کئے۔ بتایا کہ کیسے وہ تذبذب کا شکار ہو گیا تھا اور پھر اس نے اس آخری فیصلہ کی وضاحت کی جس سے صرف وہ خود متفق نہیں تھا۔

ہم سیسروس کے لئے جال بچھائیں گے لیکن اگر ہمیں اسے ختم کرنے میں کامیاب ہو بھی گئے تو مجھے پورا یقین ہے کہ ہم سب' ہرایک' خود اس میں کام آ جائیں گے۔ میں نے جو کچھ سوچا تھا ہر چیز اس سے مختلف ہے۔ آپ جب آخری بار یہاں آئے تھے تب سے غرناطہ والوں کے حالات بہت زیادہ خراب ہو گئے ہیں۔ وہ غصہ میں بھی ہیں لیکن ڈرے ہوئے بھی۔ وہ ہمیں عیسائی بنانے پر تلے ہوئے ہیں اور سیسروس نے اس کے لئے تشدد کی اجازت بھی دے دی ہے۔ بیشک بہت سے لوگ اذیت برداشت نہیں کر سکتے۔ لیکن وہ غصہ سے پاگل ہو جاتے ہیں۔ مذہب بدلنے کے بعد وہ جان ہتھیلی پر لئے پھرتے ہیں۔ گرجاؤں میں جاتے ہیں۔ قربان گاہوں کو گندہ کرتے ہیں۔ بپتسمہ کے پانی میں پیشاب کر دیتے ہیں۔ صلیبوں پر غلاظتیں ڈالتے ہیں اور پاگلوں کی طرح ہنستے ہوئے بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ سنیروس مزید ظلم سے اس کا جواب دیتا ہے۔ یہ چکر یونہی چلتا رہتا ہے۔ یہاں یہ احساس عام ہے کہ جب تک سنیروس زندہ ہے حالات بہتر نہیں ہو سکتے۔ مجھے یقین نہیں کہ اس کی موت سے حالات میں کچھ بہتری ہو گی۔ لیکن بلاشبہ اس سے بہت سے لوگوں کی ذہنی اذیت کم ہو جائے گی۔

شاید میں آج کے بعد زندہ نہ رہوں۔ میں آپ سب کو پیار بھیجتا ہوں۔ خصوصاً یزید کو' جو کبھی اپنے بھائی جیسی غلطی نہیں کرے گا۔ زبیر اور ابن باسط ابھی سڑک عبور کرنے کو ہی تھے کہ انہیں بیرونیو چھ مسلح سپاہیوں کے ساتھ اپنی طرف بڑھتے ہوئے نظر آیا۔ خوش قسمتی سے کوئی بھی خوفزدہ نہیں ہوا لیکن جیسے ہی بیرونیو زبیر کے سامنے رکا دوسرے تینوں گروپوں نے اپنا راستہ بدل لیا اور بائیں طرف مڑ کر طے شدہ منصوبہ کے مطابق تنگ گلیوں میں غائب ہو گئے۔

"تم تلوار لے کر کیوں پھر رہے ہو؟" بیرونیو نے پوچھا۔

"معاف کیجئے جناب" زبیر بولا۔ "میں غرناطہ کا رہنے والا نہیں ہوں۔ میں الحزیل سے چند روز کے لئے یہاں اپنے دوستوں سے ملنے کے لئے آیا ہوں۔ کیا اب گلیوں میں تلوار لے کر چلنا منع ہو گیا ہے؟"

"ہاں" سرکاری افسر نے جواب دیا۔ "یہاں تمہارے دوستوں کو اس کا پتہ ہونا چاہئے تھا۔ تم جاؤ۔ لیکن پہلے اپنے دوست کے گھر جا کر تلوار چھوڑ کر آؤ۔"

ابن باسط اور زبیر نے اطمنان کا سانس لیا۔ اب ان کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ واپس فندق لوٹ جائیں۔ سب انتظار کر رہے تھے اور انہوں نے ان کو دیکھ کر خوشی کا نعرہ لگایا۔

"ہم تو سمجھے تھے کہ تم بس۔ گئے۔" ابن امین نے انہیں گلے لگاتے ہوئے کہا۔

زبیر نے ان کے چہروں پر اطمینان دیکھا اور اس نے بھانپ لیا کہ اس کا سبب محض ابن باسط اور اس کی اپنی واپسی نہیں تھی۔ کوئی اور بات تھی۔ کم از کم ابن امین کے مطمئن چہرے سے ایسا ہی لگتا تھا۔ زبیر نے اپنے دوست کی طرف دیکھا اور اس پر ایک سوالیہ نگاہ ڈالی۔ ابن امین بولا۔

"ہمیں اپنا منصوبہ ترک کر دینا چاہئے۔ محل سے ایک دوست نے پیغام بھیجا ہے۔ زیمنس نے اپنے محافظوں کی تعداد میں تین گنا اضافہ کر دیا ہے اور آج وہ شہر میں نہیں آ رہا ہے۔ مجھے لگا کہ کچھ ہونے والا ہے۔ کیا تم نے دیکھا نہیں کہ گلیاں تقریباً سنسان پڑی ہیں؟"

زبیر اپنی خوشی کو نہیں چھپا سکا۔

"الحمد اللہ" وہ خوشی سے بولا۔ "قسمت نے ہماری قربانی کو روک دیا ہے۔ لیکن تم ٹھیک کہتے ہو۔ ابن امین گلیاں سنسان ہیں۔ فضا میں کشیدگی ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ کیا اس کا

دربار کے اس افسر کی آمد سے کوئی تعلق ہے؟"

ابھی وہ ان حالات پر غور کر ہی رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ باہر جا کر حالات کا جائزہ لیں کہ اتنے میں فندق کا ملازم دوڑتا ہوا اندر آیا۔

"آقا زادو۔۔ ماتنیوں کے کوچہ کی طرف دوڑو' ہدایت یہ ہے کہ اسلحہ لے کر آؤ"

زہیر نے پھر اپنی تلوار اٹھائی۔ دوسروں نے بھی فندق الیدیدہ سے نکلتے ہوئے اپنے خنجر نکال لئے۔ انہیں جگہ تلاش کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ آہستہ آہستہ بھنبھناتی ہوئی آواز تیز ہوتی جا رہی تھی۔ لگتا تھا کہ اس علاقہ کی تمام آبادی گلیوں میں نکل آئی ہے۔

گھروں کی محرابوں اور دکانوں سے لوگ گلیوں میں آ رہے تھے۔ تانبہ کے برتنوں' چیخ و پکار اور تنبوروں کا شور انہیں باہر کھینچ لایا تھا۔ سقے اور قالین فروش پھل والوں اور قیہوں میں گھل مل گئے تھے۔ یہ ایک عجیب بھانت بھانت کے لوگوں کا ہجوم تھا۔ فندق کے سازشیوں کو اتنا تو اندازہ ہو گیا۔ لیکن ہوا کیا کہ کل تو جو لوگ اتنے سکون سے بیٹھے تھے آج یوں کیوں اٹھ کھڑے ہوئے؟

ابن امین کے ایک واقف کار نے جو یہودی تھا اور جھگڑے کے مقام سے آ رہا تھا بڑی گھبراہٹ میں جلدی جلدی تمام واقعہ بتایا جو اس کے سامنے ہوا تھا اور جہاں سے وہ اس لئے جلدی آ گیا تھا کہ اسے اپنے بیمار باپ کی تیمار داری کرنا تھی۔

دربار کا افسر اور اسکے ساتھی سقوں والی گلی میں بیوہ کے گھر گئے۔ پچھلی رات اس کے دو بیٹوں نے وہاں پناہ لی تھی۔ افسر نے کہا کہ آرچ بشپ نے آج ہی انہیں بلایا ہے۔ بیوہ کو بہت غصہ آیا اور اس نے انہیں گھر میں نہیں گھسنے دیا۔ جب انہوں نے دروازہ توڑنے کی دھمکی دی تو اس نے برآمدے پر سے کھولتا ہوا پانی ان پر پھینک دیا۔

"ایک سپاہی بری طرح جھلس گیا۔ اس کی چیخیں بڑی بھیانک تھیں"

واقعہ کو یاد کر کے بتانے والے کا سانس گھٹ گیا اور اس کی آواز کانپنے لگی۔

"ذرا سانس لے لو۔ دوست" زہیر نے اس کے سر کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "تمہیں ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ آگے بتاؤ کیا ہوا؟

"اس سے بھی برا ہوا۔ بہت برا" ابن امین کے دوست نے پھر کہنا شروع کیا۔ "افسر بھی کافی خوفزدہ ہو گیا اور اس حکم عدولی پر اسے غصہ بھی آیا۔ اس نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ گھر میں گھس جائیں اور بیوہ کے لڑکوں کو گرفتار کر لیں۔ اس ہنگامہ نے دوسرے لوگوں کو بھی متوجہ کیا اور جلد ہی دو سے زیادہ نوجوان وہاں آ گئے اور انہوں نے دونوں

طرف سے گلی کی ناکہ بندی کر دی۔ آہستہ آہستہ وہ افسر اور اس کے آدمیوں کی طرف بڑھنے لگے۔ ایک سپاہی تو اتنا ڈرا کہ اس کا پیشاب خطا ہو گیا اور وہ رحم کی بھیک مانگنے لگا۔ انہوں نے اسے چھوڑ دیا۔ دوسروں نے تلواریں اٹھائیں۔ یہ بہت ہلاکت خیز تھا۔ لوگوں نے سپاہیوں کو اتنا دھکیلا کہ وہ دیوار کے ساتھ کچلے گئے۔ پھر تیل فروش کے بیٹے وہاب نے زمین سے ایک تلوار اٹھائی جو ایک سپاہی کے ہاتھ سے گر گئی تھی۔ وہ سیدھا افسر کی طرف بڑھا اور گھسیٹ کر اسے گلی کے درمیان لے آیا "اماں" اس نے کھڑکی میں سے جھانکتی ہوئی بیوہ کو آواز دی۔ "ہاں۔ بیٹے" اس نے مسرت بھرے چہرے سے جواب دیا۔ ابن وہاب نے کہا "اس ذلیل کو کیا سزا دوں؟" بڑھیا نے اپنے گلے پر انگلی رکھی۔ سارا مجمع ساکت ہو گیا۔ افسر۔ جس کا نام بیریونیو تھا۔ زمین پر گر پڑا اور رحم کی درخواست کرنے لگا۔ وہ جال میں پھنسے ہوئے جانور کی طرح نظر آ رہا تھا۔ اس کا سر ابن وہاب کے قدموں پر تھا۔ عین اسی وقت اٹھی ہوئی تلوار گری۔ بس ایک وار کافی تھا۔ بیریونیو کا کٹا ہوا سر گلی میں گر پڑا۔ سقوں کی گلی میں ابھی تک خون کی نالی بہہ رہی ہے۔

"اور وہ سارے سپاہی؟" زہیر نے پوچھا۔ "انہوں نے سپاہیوں کے ساتھ کیا کیا؟"

"ابھی چوک میں ان کی قسمت کے متعلق فیصلہ ہو رہا ہے۔ باب الرملا میں سینکڑوں مسلح لوگ سپاہیوں پر پہرہ دے رہے ہیں"

"آؤ" زہیر نے کسی قدر معتبر بنتے ہوئے اپنے دوستوں سے کہا۔ "ہمیں بھی اس گفتگو میں شریک ہونا چاہئے۔ غرناطہ میں ایک ایک مسلمان کی زندگی کا انحصار ان کے فیصلہ پر ہے۔"

مجمع اتنا زیادہ تھا کہ گلیوں کے اس جال میں قدم اٹھانا بھی مشکل تھا۔ یا تو لوگ ہجوم کے ساتھ کھنچتے جا رہے تھے یا اپنے مقام پر کھڑے تھے۔ اور لوگ ابھی تک آ رہے تھے۔ ربادالہ بگان کے چرم ساز ننگی ٹانگوں چلے آئے تھے اور ان کے جسم پر ابھی تک مختلف رنگوں کے دھبے نظر آ رہے تھے۔ ربادالدفاف میں تمبورہ سازوں نے اپنی دکانیں چھوڑ دی تھیں اور ہجوم میں شامل ہو گئے تھے۔ وہ اپنے تنبوروں سے حد درجہ شور مچا رہے تھے۔ ربادا لفجارین سے کوزہ گر ٹوٹے پھوٹے برتنوں کو تھیلے میں ڈالے انہیں ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے کے لئے لے آئے تھے اور ان کے ساتھ ساتھ پوری طرح مسلح اینٹیں بنانے والے تھے جو ربادا تواجین سے آئے تھے۔

اچانک زہیر نے ایک ایسا منظر دیکھا جس نے اسے ہلا کر رکھ دیا۔ بیسیوں عورتیں

بوڑھی اور جوان نقاب میں اور بے نقاب عربوں کے ریشمی سفید اور سبز جھنڈے اٹھائے آ رہی تھیں جو ان کے آباؤ اجداد اور خود وہ پانچ سو برس سے ربادا لنبود میں سیتی اور کاڑھتی آئی تھیں سینکڑوں چھوٹے چھوٹے چاندی کے ہلال بچوں میں بانٹ رہی تھیں۔ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں ہلال حاصل کرنے کے لئے ایک دوسرے سے مقابلہ کر رہے تھے۔ زہیر کو یزید کا خیال آیا۔ وہ یہاں کتنا خوش ہوتا اور اپنے ہلال کو پاکر کتنا فخر محسوس کرتا۔ زہیر نے سوچا کہ وہ اب کبھی یزید کو نہ دیکھ سکے گا لیکن چونکہ عیسائی بہادروں سے دست بدست لڑائی کا اس کا منصوبہ ناکام ہو چکا تھا اور مصلحتاً" سیسنروس کو قتل کرنے کا منصوبہ بھی فی الحال ملتوی کر دیا گیا تھا اس لئے زہیر نے ایک مرتبہ پھر مستقبل کے متعلق سوچنا شروع کیا اور اس کے ذہن سے اپنے چھوٹے بھائی کی مطالعہ میں مصروف شکل محو نہ ہو سکی۔ ہر گلی، ہر کوچہ خون کا دریا بنا ہوا تھا جو باب الرملا کی سمت ہجوم کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ نعرے لہروں کی طرح اٹھ رہے تھے۔ ہر شخص طوفان کا منتظر تھا۔

زہیر اس پر تلا ہوا تھا کہ سپاہیوں کو چھوڑ دینے کے حق میں بات کرے۔ اچانک اس نے محسوس کیا کہ وہ ربادالکحل میں پہنچ گئے ہیں جہاں سرمہ بنانے والے رہتے ہیں۔ یہاں چاندی کی صراحیوں میں وہ کاجل بھرا جاتا تھا جس نے ان گنت آنکھوں کو حسن بخشا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ چچا حشام کے محل سے دور نہیں تھے اور اس بہت بڑے محل کے نیچے ایک راستہ تھا جو سیدھا باب الرملا کو جاتا تھا۔ گھر کی تعمیر کے وقت یہ راستہ بنایا گیا تھا۔ خصوصاً اس لئے کہ اگر کوئی تاجر یا رئیس دشمنوں سے بچنا چاہتا تو اس راستہ سے بچ کر نکل سکتا تھا۔ ایسے درباری جھگڑے محل میں اکثر ہوتے رہتے تھے جن کی وجہ سے شہر سہما سہا سا رہتا۔

زہیر نے اپنے دوستوں کو اشارہ کیا کہ خاموشی سے اس کے پیچھے پیچھے پہنچ آئیں۔ اس نے ہاشم کے گھر کے سادہ سے مصنوعی دروازے پر دستک دی۔ پہلی منزل کی ایک پردہ پڑی ہوئی کھڑکی سے گھر کے ایک ملازم نے جھانکا اور زہیر کو پہچان لیا۔ وہ دوڑ کر نیچے آیا۔ دروازہ کھولا اور ان سب کو اندر بلا لیا لیکن وہ بہت ڈرا ہوا تھا۔

"مالک نے مجھے قسم دی ہے کہ سوائے گھر کے افراد کے میں کسی کو اندر نہ آنے دوں۔ ہر جگہ جاسوس پھیلے ہوئے ہیں۔ بڑا گھناؤنا جرم کیا گیا ہے اور شیطان کا چیلہ پادری خون کا بدلہ خون سے لے گا۔"

"پرانے رفیق" زہیر نے مشفقانہ نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ "ہم یہاں ٹھہرنے کے لئے

نہیں آئے ہیں بلکہ غائب ہونے کے لئے آئے ہیں۔ تم انہیں بتانا بھی نہیں کہ ہم آئے تھے۔ مجھے زمین دوز راستہ کا علم ہے۔ اللہ پر بھروسہ رکھو"

بوڑھا ملازم اس کی بات سمجھ گیا۔ وہ انہیں خفیہ راستہ کی طرف لے گیا اور ایک پتھر اٹھایا جس کے نیچے سے ایک چھوٹا سا کنڈا نظر آیا۔ زہیر مسکرایا۔ کتنی مرتبہ راتوں کو وہ اور ابن حشام کے بچے اس راستہ سے اپنے محبوبوں سے ملنے کے لئے جاتے رہے تھے۔ اس نے آہستہ سے کنڈے کو کھینچا اور چوکور ڈھکنے کو اٹھایا جس کو چھ پتھروں سے بڑی ہشیاری سے چھپایا گیا تھا۔ پہلے اس نے اپنے دوستوں کو نیچے اتارا پھر خود بھی ان میں شامل ہو گیا۔ لیکن پہلے وہ اس ملازم سے گلے ملا جو ہمیشہ سے وہاں رہ رہا تھا۔

"اللہ کرے آج آپ سب خیریت سے رہیں" ملازم نے پتھر دوبارہ رکھتے ہوئے کہا اور سکون سے واپس لوٹ گیا۔ چند منٹوں کے اندر اندر وہ پرانے بازار میں تھے۔ زہیر کو ڈر تھا کہ کہیں ہجوم کی وجہ سے دروازے کے پتھر کو اٹھانے میں وقت پیش نہ آئے۔ لیکن قسمت ان پر مہربان تھی۔ ڈھکنا بغیر کسی مشکل کے اٹھ گیا۔ سات آدمی زمین کے نیچے سے نکلے اور بازار کے برآمدے مین داخل ہوئے تو لوگوں نے حیرانی سے انہیں دیکھا۔ ان کے پیچھے ایک ہتھیار بھی چلا آ رہا تھا جس کا بظاہر کوئی اٹھانے والا نہیں تھا۔ زہیر نے آگے جاتے ہوئے ابن باسط کو نیچے ہی تلوار تھما دی تھی۔ اب وہ بھی باہر آیا۔ اور جلدی سے پتھر کو واپس رکھ دیا تاکہ کسی کو اصل راستہ کا پتہ نہ ہوں سکے

ان کے سامنے ایک ناقابل فراموش منظر تھا' باب الرملا میں اکٹھے ہونے والے ہزاروں مردوں عورتوں اور بچوں کی پیٹھ ان کی طرف تھی۔ یہ سب انتقام کے لئے بے قرار تھے۔ یہی وہ مقام تھا جہاں سے ۱۴۹۲ء میں انہوں نے الحمرا کے ہلال کو گرتے ہوئے دیکھا تھا۔ عیسائی منا جاتیں پڑھ رہے تھے اور گرجا کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ یہی وہ مقام تھا جہاں پچھلے سال انہوں نے خاموشی سے سیسنروس' جسے وہ شیطان کا پادری کہتے تھے' کے حکم پر کتابوں کو جلتے ہوئے دیکھا تھا اور اسی چوک میں اسی واقعہ کے دو مہینہ بعد عیسائی سپاہیوں نے دو لائق احترام اماموں کی پگڑیاں اتار دی تھیں۔

غرناطہ کے عرب کوئی سخت یا اکھڑ لوگ نہیں تھے لیکن انہوں نے عیسائیوں سے ہار مان لی تھی اس لئے کہ ان کو مدافعت کرنے سے روک دیا گیا تھا اور اس کا انہیں بہت دکھ تھا۔ آٹھ برس کا رکا ہوا یہ غصہ اب ظاہر ہو رہا تھا۔ وہ کسی بھی خطرناک اقدام کے لئے تیار تھے۔ وہ الحمرا پر ٹوٹ پڑنا چاہتے تھے۔ زمنس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینے پر تلے ہوئے

تھے۔ وہ گرجوں کو جلانے اور پادریوں کو نامرد بنانے کے لئے بیقرار تھے۔ وہ بہت خطرناک لگ رہے تھے۔ دشمن کو اتنے نہیں جتنے خود اپنے آپ کو۔ اپنے آخری بادشاہ کی طرف سے مدافعت کی اجازت نہ ملنے کا وہ اس وقت مداوا کرنا چاہتے تھے۔

عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ اگر کہیں ایک درجن سے زیادہ لوگ اکٹھے ہو جائیں تو کوئی بھی شعلہ نوا مقرر انہیں بھڑکا سکتا ہے اور پھر وہ صرف احمقانہ اقدام ہی کر سکتے ہیں۔ ایسے نظریات اس وجہ سے قائم ہوئے ہیں کہ اکثر اس بات کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ وہ کس مقصد کے لے جمع ہوئے ہیں۔ تمام سیاسی اور کاروباری تضادات بھلا دیئے گئے تھے۔ خاندانی جھگڑے ختم کر دئے گئے تھے۔ متحارب مذہبی فرقوں کے درمیان صلح ہو گئی تھی۔ اسلامی اندلس عیسائیوں کے خلاف صف آرا ہو گیا تھا۔ جو بات بیوہ کے بچوں کی جان بچانے سے شروع ہوئی تھی اب اچھی خاصی بغاوت میں تبدیل ہو گئی تھی۔

ابن وہاب، سرکاری افسر کا سر پھرا قاتل جس کو اس کام پر بہت فخر تھا، فوری طور پر تیار کئے ہوئے لکڑی کے سٹیج پر چڑھا۔ وہ اس وقت آسمان پر پہنچا ہوا تھا۔ وہ الحمرا کے تصور میں گم تھا اور سوچ رہا تھا کہ وہ ازابیلا کے ان ایلچیوں سے کس طرح پیش آئے گا جو اس سے پناہ کی درخواست کرنے آئیں گے۔ بدقسمتی سے تقریر کی پہلی کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کو بار بار ٹوکا گیا:

"تم کیا مم کر رہے ہو؟"

"تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"اونچا بولو"

"تم کیا سمجھتے ہو کہ کس سے خطاب کر رہے ہو؟" "تمہاری داڑھی پر ایک بال بھی نہیں"

اس بدتمیزی سے جھلا کر ابن وہاب نے واعظوں کی طرح اپنی آواز بلند کی۔ وہ کوئی آدھ گھنٹہ بڑے شاعرانہ مقفیٰ اور مسجع الفاظ میں تقریر کرتا رہا اس نے دمشق سے مغرب تک تمام فتوحات کی کچھ اس طرح باتیں کیں کہ وہ بھی جو اس کے حامی تھے کہہ اٹھے کہ وہ خالی خولی شور کر رہا ہے۔ مطلب کی کوئی بات نہیں۔

صرف یہی واضح بات اس نے کی اور وہ تھی کہ سپاہیوں کو فوراً تہہ تیغ کر دیا جائے، اور ان کے سر نیزوں پر چڑھا دئے جائیں۔ لوگ اس پر خاموش رہے تو ایک قاضی نے پوچھا کہ کیا کوئی اور بھی کچھ کہنا چاہتا ہے۔

"ہاں"۔ زہیر چلایا۔ اس نے تلوار اپنے سر پر بلند کی اور شانے اٹھا کر اور چہرہ اوپر کر کے سٹیج کی طرف بڑھا۔ اس کے ساتھی اس کے پیچھے پیچھے تھے۔ اور مجمع نے اس عجیب و غریب جلوس کو دیکھ کر راستہ دے دیا۔ کئی لوگ اسے پہچان گئے کہ وہ خاندان بنی حزیل سے ہے۔ قاضی نے ابن وہاب سے نیچے آنے کو کہا اور کئی ہاتھوں نے اٹھا کر زہیر کو سٹیج پر چڑھا دیا۔ اس سے پہلے وہ کبھی کسی جلسہ میں نہیں بولا تھا۔ اور پھر یہ مجمع بھی اتنا بڑا تھا۔ وہ خزاں زدہ پتوں کی طرح کانپ رہا تھا۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" زہیر نے بڑے روایتی انداز میں بولنا شروع کیا۔ اس نے اپنے مذہب کی عظمت یا ماضی کی شان و شوکت پر زیادہ گفتگو نہیں کی۔ اس نے صرف ان کے اوپر پڑی ہوئی اس آفت کا ذکر کیا اور بتایا کہ اس سے بھی بڑی مصیبتیں آنے والی ہیں۔ اسے خود تعجب ہوا کہ وہ بڑے مانوس سے فقرے بول رہا تھا۔ واقعی یہ اس نے زندیق سے سیکھے تھے اور ابوزید سے۔ اس نے ایک ناگوار سی بات پر تقریر ختم کی:

"اس وقت جب میں آپ سے مخاطب ہوں تو وہ سپاہی جو موقع پر موجود تھا الحمرا میں تمام تفصیلات بیان کر رہا ہے۔ ذرا خود کو اس کی جگہ رکھ کر دیکھیں۔ وہ خوف سے بری طرح ہلا ہوا تھا۔ اپنے آپ کو بہادر ثابت کرنے کے لئے وہ ہر بات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرے گا۔ جلد ہی کیپٹن جنرل اپنے سپاہیوں کو لے کر آئے گا اور ان کی رہائی کا مطالبہ کرے گا جن کو آپ لوگوں نے پکڑ رکھا ہے۔ ابن وہاب کے برخلاف میں ان کو ماردینے کے حق میں نہیں ہوں۔ میرا مشورہ ہے کہ آپ انہیں چھوڑ دیں۔ اگر ہم ایسا نہیں کریں گے۔ تو عیسائی اپنے ایک ایک آدمی کا بدلہ ہمارے دس دس آدمیوں کو مار کر لیں گے۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا ان کی زندگی کسی ایک بھی مسلمان کی قیمت کے برابر ہے؟ اس وقت ان کو چھوڑنا ہماری کمزوری نہیں بلکہ جرات کی مثال ہو گی۔ ان کو چھوڑنے کے بعد ہمیں ایک نمائندہ جماعت کا انتخاب کرنا چاہئے جو ہماری طرف سے بات کرے۔ مجھے اور بھی بہت کچھ کہنا ہے۔ لیکن میں خاموش ہو جاتا ہوں تاکہ آپ ان کی قسمت کا فیصلہ کر سکیں۔ میں ان کی موجودگی میں مزید اور کچھ کہنا نہیں چاہتا۔"

وہ حیران تھا کہ اس کی باتوں پر لوگوں نے تالیاں بجائیں اور اس کی حمایت میں سر ہلائے۔ جب قاضی نے لوگوں سے پوچھا کہ قیدیوں کو چھوڑا جائے یا قتل کیا جائے تو اکثریت نے ان کی رہائی کی حمائت کی، زہیر اور اس کے دوستوں نے مزید ہدایات کا انتظار کئے بغیر تیزی سے قیدیوں کے پاس جا کر تلوار سے ان کی رسیاں کاٹ دیں۔ پھر زہیر انہیں لے کر

مجمع کے آخری سرے تک گیا اور تلوار کے اشارے سے انہیں الحمرا کی سمت دوڑا دیا۔ حیرت زدہ سپاہیوں نے اظہار تشکر کے لئے سرہلائے اور تیزی سے دوڑ گئے۔

محل میں، جیسا کہ زہیر نے کہا تھا، جس سپاہی کو پہلے چھوڑ دیا گیا تھا وہ اس خیال سے کہ اب تک اس کے ساتھیوں کا کام تمام ہو گیا ہو گا، بڑی بڑھ چڑھ کر باتیں بنا رہا تھا۔ آرچ بشپ نے خاموشی سے ایک ایک لفظ سنا۔ پھر بغیر ایک لفظ بولے کھڑا ہو گیا۔ اور سپاہیوں کو اشارے سے اپنے پیچھے بلاتے ہوئے ٹنڈیلا کے کاؤنٹ کے کمروں کی طرف چلا۔ اسے فوراً ہی بلا لیا گیا اور سپاہی نے اپنی درد بھری داستان ایک بار پھر دہرائی۔

"جناب عالی یقیناً اتفاق کریں گے"۔ زمنس نے بات شروع کی "کہ جب تک ہم اس بغاوت کو سختی سے نہیں دبائیں گے اس شہر میں بادشاہ اور ملکہ کی تمام فتوحات خطرے میں پڑ جائیں گی۔"

"میرے عزیز آرچ بشپ" کاؤنٹ نے بناوٹی دوستانہ انداز اختیار کرتے ہوئے جواب دیا۔ "کاش چرچ کے مقدس عہدوں پر آپ جیسے کچھ اور لوگ بھی ہوتے۔ تخت کے اتنے وفادار اس کی املاک بڑھانے کے اتنے خواہش مند اور چرچ کا اثر ورسوخ بڑھانے کے لئے اس قدر کوشاں۔

"البتہ میں ایک بات واضح کر دینا چاہتا ہوں۔ مجھے آپ کے خیال سے اتفاق نہیں۔ یہ کمینہ جھوٹ بول رہا ہے تاکہ ہرمنیو کے، قاتلوں کے پیروں پر گرنے کا کوئی جواز پیدا کر سکے۔ میں ایک منٹ کے لئے بھی یہ ماننے کو تیار نہیں ہوں کہ اس ہجوم سے آپ کی فوجی قوت کو کوئی خطرہ ہے۔ میرا تو یہ خیال ہے کہ آپ کو غصہ اس بات پر ہے کہ روح مقدس (Holy spirit) خطرے میں ہے"

زمنس کو ان باتوں پر بہت غصہ آیا۔ خصوصاً اس لئے کہ یہ باتیں ایک سپاہی کے سامنے کہی گئی تھیں اور وہ انہیں اپنے دوستوں میں بیان کرے گا اور چند گھنٹوں میں سارے شہر کو پتہ چل جائے گا۔ اس نے ضبط سے کام لیا اور ہاتھ کے اشارے سے سپاہی کو باہر جانے کا حکم دیا۔

"جناب عالی اس بات کی اہمیت کو نہیں سمجھتے کہ اگر ان لوگوں کو دبایا نہ گیا اور ان سے چرچ کا احترام نہ کرایا گیا تو یہ کبھی حکومت کے وفادار نہیں بنیں گے۔"

"ملکہ کے وفادار ہونے کے باوجود لگتا ہے کہ آپ ان معاہدوں کو بھول گئے ہیں جو فتح کے وقت سلطان کے ساتھ طے پائے تھے۔ یہ پہلا موقع نہیں ہے کہ مجھے وہ وعدے یاد

دلانے پڑ رہے ہیں جو عربوں سے کئے گئے تھے۔ انہیں اپنے طریقہ پر عبادت کی آزادی ہو گی۔ وہ نبیؐ پر ایمان رکھ سکیں گے اور اس سے انہیں کوئی نہیں روکے گا۔ وہ اپنی زبان استعمال کر سکیں گے۔ وہ شادی بیاہ اور اموات کی رسمیں اسی روایتی طریقے سے ادا کرتے رہیں گے جیسے وہ صدیوں سے کرتے چلے آ رہے ہیں۔ یہ آپ ہیں۔ عزیز آرچ بشپ۔ جنہوں نے اس بغاوت کی چنگاری چھوڑی ہے۔ آپ نے انہیں بری طرح تنگ کیا ہے اور جبھی وہ مدافعت کرتے ہیں تو آپ معصوم بن جاتے ہیں۔ وہ جانور نہیں ہیں۔ انسان ہیں۔ وہ ہمارا گوشت ہیں ہمارا خون ہیں"

"کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ ایک ہی مادر کلیسا کی دو اولادیں اتنی مختلف کیسے ہو سکتی ہیں جیسے ڈومینکن اور فرانسکن، قابیل اور ہابیل، مجھے ایک بات بتائیں، فرائر سینروس، جب آپ کو خانقاہ میں تربیت دی جا رہی تھی تو ٹولیڈو میں انہوں نے آپ کو کیا پلا دیا تھا؟"

سینروس سمجھتا تھا کہ کپتان جنرل کے غصہ کی وجہ یہ ہے کہ امن بحال کرنے کے لئے فوج کی مداخلت ناگزیر ہے۔ یہ اس کی فتح تھی۔ اس نے کاؤنٹ کی دلجوئی کی کوشش کی۔

"مجھے تعجب ہے کہ آپ جیسا عظیم فوجی لیڈر اتنی فرصت کہاں سے نکال سکا کہ وہ مادر کلیسا کے مختلف فرقوں کا مطالعہ کر سکے۔ قابیل اور ہابیل نہیں، جناب عالی، نہیں بالکل نہیں، آپ انہیں ایک بیوہ کے عزیز بچوں کی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ پہلا بیٹا مستعد اور تربیت یافتہ ہے جو اپنی ماں کو ہر قسم کے نامناسب حقداروں سے بچاتا ہے۔ دوسرا، جو اتنا ہی چہیتا ہے۔ کچھ ست اور سہل انگار ہے۔ وہ گھر کے دروازے کھلے چھوڑ دیتا ہے اور اسے کوئی پروا نہیں کہ کون آتا ہے کون جاتا ہے۔ ماں کو دونوں کی ضرورت ہے اور وہ دونوں کو چاہتی ہے۔ لیکن جناب عالی خود ہی سوچئے کہ اس کی زیادہ حفاظت کون کرتا ہے؟"

ڈون اینگو آرچ بشپ کے اس عیارانہ دوستی اور شفقت کے لہجے سے بہت رنجیدہ ہوا۔ اس کے غرور کو چوٹ لگی تھی۔ ایک نودولتیا پادری اور ایک مینڈوزا سے بے تکلفی کی جسارت کرے؟ سینروس کو اتنی جرات کیسے ہوئی۔ اس نے حقارت سے پادری کی طرف دیکھا۔

"تقدس مآب۔ آپ کو یقیناً بیواؤں اور ان دو بیٹوں سے بہت واسطہ رہا ہے۔ کیا ایک ہی ایسی بیوہ اور اس کے دو بیٹوں کے لئے آپ نے آج شاہی افسر کو موت کے منہ میں نہیں دھکیل دیا؟"

آرچ بشپ کو اندازہ ہو گیا کہ آج وہ جو کچھ بھی کہے گا اسے جھاڑ پڑے گی۔ اس لئے

وہ اٹھا اور اجازت چاہی۔ کاؤنٹ کی مٹھیاں ڈھیلی پڑ گئیں۔ اس نے زور سے تالی بجائی۔ جب دو ملازم سامنے آئے تو اس نے احکامات کی بوچھاڑ کر دی۔

میرا زرہ بکتر اور گھوڑا تیار کرو۔ ڈون الونزہ سے کہو کہ مجھے باب الرملا جانے کے لئے تین سو سپاہی درکار ہیں۔ میں ایک گھنٹہ سے پہلے پہلے روانہ ہونا چاہتا ہوں۔

شہر میں فضا کافی حد تک بدل چکی تھی۔ سپاہیوں کی رہائی سے لوگوں میں بہت زیادہ اعتماد پیدا ہو گیا۔ وہ اب اپنے آپ کو اپنے دشمنوں سے بہت برتر سمجھتے تھے۔ اب وہ کسی چیز سے خوفزدہ نہیں تھے۔ کھانے پینے کی چیزیں بیچنے والے نمودار ہو گئے تھے۔ نان بائیوں نے اپنی دکانیں بند کر دی تھیں اور باب الرملا میں پیسٹریوں کے سٹال لگ گئے تھے۔ کھانے اور مٹھائیاں بڑی فراخ دلی سے تقسیم کی جا رہی تھیں۔ بچے گیت گا رہے تھے اور رقص کر رہے تھے۔ کشیدگی غائب ہو چکی تھی۔ زہیر کو معلوم تھا کہ یہ سکون عارضی ہے۔ خوف کچھ دیر کے لئے دب گیا تھا۔ اس کی جگہ ایک جشن کے سے عالم نے لے لی تھی۔ لیکن ابھی ایک گھنٹہ پہلے اس نے دل کی دھڑکنیں سنی تھیں۔

زہیر اس دن کا ہیرو تھا۔ بزرگ شہری اس کے دادا کے کارنامے مزے لے لے کر بیان کر رہے تھے۔ اکثر اس نے پہلے ہی سن رکھے تھے اور باقی شاید زیادہ قابل یقین نہیں تھے۔ وہ سفید ریش بزرگوں کی ہاں میں ہاں ملا رہا تھا اور مسکرا رہا تھا لیکن ان کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ اس کا ذہن الحمرا میں تھا اور وہیں گم رہتا اگر ایک مانوس سی آواز اسے خیالوں کی دنیا سے واپس نہ لے آتی۔

"تم سوچ رہے۔ کیوں؟۔ کہ بہت بڑی مصیبت آنے والی ہے۔"

"زندیق" زہیر اپنے پرانے دوست سے بغلگیر ہوتے ہوئے چلایا۔ "تم کتنے بدلے ہوئے نظر آ رہے ہو۔ صرف دو ہفتہ میں تمہارے اندر اتنی تبدیلی کیسے آ گئی؟ زہرہ کی موت؟"

"بوڑھے ہوتے ہوئے آدمی کو وقت کا نوالہ بننا پڑتا ہے۔ زہیر الفہم۔ ایک روز۔ جب تمہاری عمر ستر برس سے تجاوز کر جائے گی تو پھر تمہیں بھی یہ بات سمجھ آ جائے گی"۔

"اگر میں اتنی عمر تک جیتا رہا" زہیر نے جیسے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ اسے زندیق سے مل کر بہت خوشی ہوئی اور یہ صرف اس لئے نہیں کہ وہ اس سے کچھ نئی باتیں سیکھ لے۔ وہ خوش تھا کہ زندیق نے اسے اس کی صلاحیتوں کی معراج پر دیکھ لیا تھا۔ جب غرناطہ والے اسے داد دے رہے تھے۔ لیکن بڈھے شکی کی طبیعت پر کوئی اثر نہ ہوا۔

"میرے نوجوان دوست" اس نے زہیر کو بڑی شفقت سے بتایا۔ "ہماری زندگیاں ایک محراب میں گزرتی ہیں جو پیدائش سے قبر تک پھیلی ہوئی ہے۔ بڑھاپا اور موت ہی جوانی کے مزے کا احساس دلاتے ہیں۔ اور یہ کہ مستقبل جوانی کی نظر میں کتنا حقیر ہے۔"

"ہاں" زہیر اب کچھ کچھ گفتگو کے رخ کو سمجھنے لگا تھا۔ "لیکن جوانی اور بڑھاپے کے درمیان کا خلاء اتنا حتمی نہیں جتنا تم سمجھ رہے ہو"

"وہ کیسے؟"

"ذرا سوچو کہ ایک شخص جو ساٹھویں برس میں ہو' ہمارے اس خطہ میں کتنا کمیاب ہے"۔ وہ الحزیل کے باہر ٹہل رہا تھا کہ اس نے تین لڑکے دیکھے۔ وہ سب اس سے پچاس برس سے بھی زیادہ چھوٹے تھے۔ وہ ایک درخت پر سب سے اونچی شاخ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک لڑکے نے اس کی داڑھی کو کسی جانور کے چوتڑوں سے تشبیہ دی۔ تجربہ تو یہ ہے کہ بزرگ لوگ ایسی باتوں کو نظر انداز کر کے آگے چلے جاتے ہیں۔ لیکن وہ بہت حیران ہوئے جب وہ بڈھا سیدھا درخت پر چڑھ گیا۔ جس لڑکے نے اس سے بدتمیزی کی تھی وہ اس کا عمر بھر کا دوست بن گیا۔

زندیق منہ ہی منہ میں ہنسا

"میں درخت پر اس لئے چڑھا تھا کہ تمہیں یہ سبق دے سکوں کہ کسی بات کو ایسے ہی نہیں مان لینا چاہئے۔"

"بالکل ٹھیک ہے۔ مجھے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آ گئی"

"تو پھر۔ میرے دوست۔ اچھی طرح سمجھ لو کہ تم ان لوگوں کو کسی جال میں تو نہیں پھنسا رہے وہ لڑکی جو الحامہ کے قتل عام سے بچ گئی تھی' بارش کو نہیں دیکھ سکتی اس لئے کہ وہ اسے سرخ نظر آتی ہے"

"زہیر بن عمر' ابن باسط' ابن وہاب ریشم بازار میں اس وقت "چالیس" کا جلسہ ہو رہا ہے۔"

زہیر نے زندیق کا شکریہ ادا کیا ور جلدی سے اس سے رخصت چاہی۔ وہ ریشم کے سوداگر کے ایک وسیع کمرے میں داخل ہوا جو اسے اس مقصد کے لئے دے دیا گیا تھا۔ بوڑھے نے دیکھا کہ اس کے دوست کی چال میں فرق آ گیا ہے۔ اپنی طبیعت کے مطابق اسے دوڑ کر جلسہ میں جانا چاہئے تھا لیکن وہ بڑی احتیاط سے قدم اٹھاتا ہوا چلا اور اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ خود کو کس قدر اہم سمجھتا تھا۔ زندیق نے مسکرا کر سر ہلایا۔

اسے لگا جیسے ابن فرید کی روح آ گئی ہے۔

شہریوں نے چالیس آدمیوں کی ایک کمیٹی منتخب کی تھی اور اسے پورے شہر کی طرف سے مذاکرات کرنے کا اختیار دیا تھا۔ زہیر اور اس کے ساتوں دوست بھی منتخب کر لئے گئے تھے اور ساتھ ہی ساتھ ابن وہاب بھی۔ باقی منتخب لوگوں میں ان عرب شرفاء کی اکثریت تھی جو غیر مسلح کئے جا چکے تھے۔ جس وقت زہیر وہاں پہنچا الحمرا کے مطبخ سے ایک پیغام رساں بڑے پرجوش لہجے میں محل کے اندر جوابی حملہ کی تیاریوں کی تفصیل بتا رہا تھا۔

"کیپٹن جنرل کا جنگی لباس تیار کیا جا رہا ہے۔ اس کے ساتھ تین سو سپاہی ہوں گے۔ جب میں وہاں سے چلا ہوں تو ان کی تلواریں سیقل کی جا رہی تھیں۔"

"ہمیں چاہئے کہ گھات مار کر ان پر حملہ کریں" ابن وہاب نے مشورہ دیا "ان پر تیل چھڑک کر آگ لگا دو"

"نادان دوست سے دانا دشمن بہتر ہے" قاضی نے اس مشورہ پر منہ بناتے ہوئے کہا۔

"ہمیں اپنے منصوبہ کے مطابق تیاری کرنی چاہئے" جلسہ کے برخواست ہوتے ہوئے زہیر نے کہا اور پھر وہ "چالیس" چوک میں واپس آ گئے۔

قاضی پلیٹ فارم پر چڑھا اور اس نے اعلان کیا کہ سپاہی روانہ ہو چکے ہیں۔ مسکراہٹیں غائب ہو گئیں۔ ریڑھیوں والے اپنا سامان سمیٹنے اور جانے کی تیاری کرنے لگے۔ ہجوم میں تشویش کی لہر دوڑ گئی اور ہر طرف پریشانی کے عالم میں تبصرے ہونے لگے۔ قاضی نے لوگوں کو پرسکون رہنے کے لئے کہا۔ عورتوں' بچوں اور عمر رسیدہ لوگوں کو گھروں میں بھیج دیا گیا۔

اس خطرے کے پیش نظر کہ عیسائی شہر کے قلب پر قبضہ کرنے کی کوشش نہ کریں' ہر ایک کو مخصوص مقامات پر متعین کر دیا گیا۔ لوگ طے شدہ جگہوں پر چلے گئے۔ احتیاطی تدابیر پہلے ہی اختیار کر لی گئی تھیں۔ اور اب دفاعی منصوبے پر عمل شروع ہو گیا۔ آدھے گھنٹے کے اندر اندر ایک موثر حصار قائم کر دیا گیا۔ بھٹہ مزدوروں' راج مزدوروں اور ترکھانوں نے اپنی اپنی ٹولیاں بنائیں۔ حفاظتی دیوار کو بڑی مہارت سے بنایا گیا تھا اور اہل ایمان کے شہر (یہ نام اسے قاضی نے دیا تھا) کے تمام راستے بند کر دئے گئے۔

زہیر کو حیرت تھی کہ یہ سارا کام انہوں نے خود ہی کر لیا تھا۔ قاضی کو ماضی کی شان یا اللہ کی عظمت انہیں یاد نہیں دلانا پڑی۔ اس نے مڑ کر زندیق کو ڈھونڈھا۔ لیکن بڈھا رات بھر کے لئے پناہ گاہ میں چلا گیا تھا اور زہیر کو تعجب ہوا کہ ابوزید اور اس کے پاگل الموریوں

کا وہ ٹولہ کہاں گیا؟ وہ یہاں کیوں نہیں؟ ہمارے لوگوں کر قوت دیکھ کے اگر ہمارے طرز حیات کو بچانے کے لئے کوئی نئی پود تیار کی جائے تو یہی لوگ اس کے سپاہی ہوں گے۔ یہ نہ ہوں تو ہم تباہ ہو جائیں گے۔"

"سپاہی!" کسی نے نعرہ لگایا اور باب الرملا پر خاموشی چھا گئی۔ دور سے پتھریلی سڑک پر فوجیوں کے قدموں کی آواز تیز سے تیز تر ہوتی رہی۔

"کیپٹن جنرل اپنی پوری شان وشوکت سے ان کی قیادت کر رہا ہے" دوسرا مخبر چلایا۔

زہیر نے اشارہ دیا جسے چوک کے مختلف حصوں سے پانچ رضا کاروں نے دہرایا۔ تین سو نوجوانوں کا ایک گروہ جس نے پتھروں سے بھرے ہوئے تھیلے اٹھائے ہوئے تھے' مستعدی سے تیار ہو گیا۔ پتھر پھینکنے والوں کی پہلی قطار اپنے مقام پر آ گئی۔ سپاہوں کے قدموں کی آواز بہت تیز ہو گئی۔

ٹنڈیلہ کے کاؤنٹ' غرناطہ میں عیسائیوں کے کیپٹن جنرل نے اپنے سامنے ایک زبردست رکاوٹ دیکھ کر گھوڑے کی لگام کھینچی اور ساکت کھڑا ہو گیا۔ لکڑی کے دروازے جنہیں ان کے قبضوں سے اکھاڑا گیا تھا۔ ٹوٹی ہوئی اینٹوں کے ڈھیر' لوہے کے سریے اور طرح طرح کی الا بلا کو اکٹھا کر کے ایسی قلعہ بندی کی گئی تھی کہ کاؤنٹ نے پہلے کبھی جنگ کے میدانوں میں ایسی کوئی دیوار نہیں دیکھی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اس رکاوٹ کو گرانے کے لئے کئی سو سپاہی درکار ہوں گے۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اگر یہ رکاوٹ گرائی گئی تو عرب خاموش تماشائی بن کر کھڑے نہیں رہیں گے۔ یہ بات اور تھی کہ آخیر میں کامیاب وہی ہوتا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا لیکن اس میں بہت قتل وغارت کا امکان تھا۔ اس نے بلند آواز میں رکاوٹ کے پاس سے پکارا "اپنے بادشاہ اور ملکہ کے نام پر میں آپ سے کہتا ہوں کہ آپ اس رکاوٹ کو ہٹا دیں اور مجھے اور میرے سپاہیوں کو شہر میں داخل ہونے دیں۔"

پتھر پھینکنے والے حرکت میں آ گئے۔ عیسائی سپاہیوں کی ڈھالوں پر اینٹوں کے پڑنے سے ایک خوفناک شور پیدا ہوا۔ کاؤنٹ اس کا مطلب سمجھ گیا۔ عرب عمائدین نے شاہی محل سے تعلقات توڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

"میں اپنے اور آپ کے درمیان اس تفرقہ کو نہیں مانتا" کیپٹن جنرل چلایا۔ "اگر آپ نے ایک گھنٹے کے اندر اندر مجھے اندر نہ آنے دیا تو میں مزید کمک لے کر آؤں گا۔"

وہ اپنے سپاہیوں کا انتظار کئے بغیر غصہ میں واپس لوٹ گیا۔ سپاہیوں کو اپنے لیڈر کے پیچھے دوڑتے ہوئے دیکھ کر غرناطہ والوں کو بڑا مزا آیا۔

"چالیس" اتنے زیادہ خوش نہیں تھے۔ وہ جانتے تھے کہ جلد یا بدیر انہیں نینڈوزا سے مذاکرات کرنے پڑیں گے۔ ابن وہاب ہر قیمت پر جنگ چاہتا تھا اور اسے کچھ حمایت بھی حاصل ہو گئی تھی لیکن اکثریت نے فیصلہ کیا کہ الحمرا میں ایک قاصد بھیجا جائے جو پیغام دے کہ لوگ بات کرنے کو تیار ہیں۔

جب کاؤنٹ واپس آیا تو اندھیرا ہو چکا تھا۔ محافظوں نے رکاوٹ ہٹا دی تھی۔ لوگ کیپٹن جنرل کو مشعلوں کی روشنی میں ریشم بازار لائے۔ "چالیس" نے اس کمرے میں اس کا استقبال کیا جہاں وہ میٹنگ کرتے رہے تھے۔ اس نے ایک ایک چہرے کو غور سے دیکھا تاکہ ان کے نقوش ذہن نشین کر سکے۔ باری باری سب سے اس کا تعارف کرایا گیا۔ اس کا ایک معاون ایک رجسٹر میں سب کے نام لکھتا رہا۔

"تم عمر بن عبداللہ کے بیٹے ہو؟"

زہیر نے ہاں' میں سر ہلایا

"میں تمہارے والد سے اچھی طرح واقف ہوں۔ کیا انہیں معلوم ہے کہ تم یہاں ہو؟"

"نہیں" زہیر نے جھوٹ بولا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے گھر والوں پر کوئی آفت آئے ڈون اینگو آگے بڑھتا گیا۔ کہ اس کی نظر ابن امین پر پڑی۔

"تم؟" اس نے بلند آواز میں کہا "ایک یہودی میرے حکیم کا بیٹا' اس سازش میں شریک ؟

تمہارا اس سے کیا تعلق؟"

"میں شہر میں رہتا ہوں جناب عالی۔ آرچ بشپ ہم سے ایک جیسا ہی سلوک کرتا ہے۔ یہودی' مسلمان۔ عیسائی' گمراہ عیسائی اس کے لئے سب ایک ہیں"

"مجھے معلوم نہیں تھا کہ غرناطہ میں گمراہ عیسائی بھی رہتے ہیں؟"

"کچھ تھے لیکن آرچ بشپ کے آنے پر شہر چھوڑ گئے۔ لگتا ہے کہ اس کی شہرت سے واقف تھے"

"میں آپ سے یہاں مذاکرات کرنے نہیں آیا" جب "چالیس" کے نام لکھے جا چکے تو کیپٹن جنرل نے بات شروع کی۔ "آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں اس شہر کو اپنی ہتھیلی سے مسل سکتا ہوں۔ آپ نے ایک شاہی افسر کو قتل کر دیا ہے۔ جس نے شاہی ملازم کو قتل کیا ہے وہ سزا سے نہیں بچ سکتا۔ یہ کوئی نیا دستور نہیں ہے۔ تمہارے سلطان اور امیر

بھی اس طرح انصاف کیا کرتے تھے۔ میں چاہتا ہوں کہ صبح تک اس شخص کو میرے سپاہیوں کے حوالے کر دیا جائے۔ آج سے آپ کو ہمارے بادشاہ اور ملکہ کے بنائے ہوئے قوانین کو تسلیم کرنا ہو گا۔ سارے قوانین۔ آپ میں سے جو ہمارا مذہب اختیار کرے وہ اپنے مکان اور زمینیں اپنے پاس رکھ سکتے ہیں۔ اپنا لباس پہن سکتے ہیں۔ اپنی زبان بول سکتے ہیں لیکن جو محمدؐ کے مذہب پر قائم رہنے پر اصرار کریں گے ان کو سزا دی جائے گی۔

"میں آپ سے یہ بھی عہد کرتا ہوں کہ میں آئندہ پانچ سال تک کلیسائی عدالت کو اس شہر میں نہیں آنے دوں گا لیکن اس کے بدلے میں کل سے آپ پر عائد کردہ شاہی ٹیکس دوگنے ہو جائیں گے۔ مزید برآں۔ یہاں پر متعین سپاہیوں کی تنخواہ بھی آپ کو دینی پڑے گی۔ ایک بات اور ہے۔ میں نے شہر کے دوسو سرکردہ خاندانوں کی فہرست بنائی ہے۔ وہ سب اپنا ایک ایک بیٹا مجھے بطور یرغمال دیں۔ لگتا ہے آپ کو بہت دھچکا لگا۔ یہ ہم نے آپ کے حکمرانوں سے ہی سیکھا ہے۔ میں کل شاہی محل میں اپنی تجاویز کے جواب کا منتظر رہوں گا۔"

یہ الفاظ کہنے کے بعد جو کسی سپاہی کی تلوار سے بھی زیادہ مہلک تھے ڈوزا اینگو ٹنڈیلہ کے کاؤنٹ نے رخصت چاہی اور چلا گیا۔ چند منٹ تک کوئی نہیں بول سکا۔ جس ظلم کے وہ منتظر تھے اب اس کے بوجھ کو محسوس کرنے لگے تھے۔

"شاید؟" ابن وہاب نے بڑی مری ہوئی سی رحم طلب اور خوفزدہ آواز میں کہا۔ "مجھے خود کو ان کے حوالے کر دینا چاہئے۔اس طرح ہمارے لوگ پھر امن سے رہنے لگیں گے"

"اس نے جو کچھ کہا ہے بالکل واضح ہے۔ اگر ہم اپنے مذہب پر قائم رہے تو ہمیں وہ آرام سے رہنے دیں گے۔ لیکن صرف قبرستان میں" زہیر نے کہا "اب اعلیٰ ظرفی کے اظہار کا وقت گزر چکا ہے اور قربانیاں بے کار ہیں"

"ہمیں جو راستہ دکھایا جا رہا ہے بالکل سادہ ہے" ابن باسط بولا "یا مذہب چھوڑ دیں یا موت کو گلے لگا لیں"

پھر۔ قاضی جو وہاں موجود لوگوں میں ابن وہاب کے بعد سب سے زیادہ خطرے میں تھا غیر جذباتی لہجے میں بولا۔

"پہلے وہ اچھی طرح جم کر بیٹھتے ہیں اور پھر گھوڑے کو چابک لگا تے ہیں۔ اللہ نے ہمیں سخت ترین سزا دی ہے۔ وہ عرصے سے اس خطے میں ہماری حرکتوں کو دیکھ رہا ہے وہ جانتا ہے کہ ہم نے اس کے نام پر کیا کچھ کیا ہے۔ کس طرح مسلمان نے مسلمان کو مارا۔

کیسے ہم نے ایک دوسرے کی سلطنتیں تباہ کیں۔ ہمارے حاکم، محکوموں سے اس قدر علیحدہ زندگیاں گزارتے تھے کہ خود ان کے اپنے لوگ بھی ان کی حمایت میں نہیں اٹھے۔ وہ افریقیوں سے فوجی مدد کی درخواست کرنے پر مجبور ہوئے جس کا نتیجہ تباہ کن تھا۔ آپ نے دیکھا ہے کہ یہاں جب لوگوں کو مدد کے لئے بلایا گیا تو ان کا رویہ کیا تھا۔ کیا آپ ان کے نظم وضبط اور ان کی وفا داری پر فخر نہیں کرتے تھے؟ قرطبہ میں اور اشبیلیہ میں ماریہ اور بلانسیا میں سارا کتہ الغرب میں ایسا ہی ہونا چاہئے تھا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ آپ سب جوان لوگ ہیں۔ آپ کی زندگیاں آپ کے سامنے ہیں۔ آپ جو مناسب سمجھیں وہی کریں۔ جہاں تک میرا تعلق ہے مجھے پورا یقین ہے کہ میری رخصت میں اب دیر نہیں ہے۔ میں اس زندگی سے آزاد ہو جاؤں گا۔ میں ایسا ہی مروں گا جیسے پیدا ہوا تھا۔ اپنے ایمان کے ساتھ۔ کل صبح میں جا کر مینڈوزا کو اپنے فیصلے سے آگاہ کر دوں گا۔ میں اسے یہ بھی بتا دوں گا کہ میں الحمرا اور اپنے لوگوں کے درمیان واسطہ نہیں بننا چاہتا۔ وہ اپنا غلیظ کام خود ہی کریں۔ آپ اپنے متعلق فیصلہ کریں۔ میں اب آپ سے رخصت چاہتا ہوں۔ جو کان نہیں سنتا وہ زبان نہیں دہرا سکتی۔ اسلام علیکم میرے بچو"

زہیر کا سر دکھ سے جھک گیا۔ زمین کیوں نہ پھٹ گئی۔ وہ کیوں نہ اس میں سما گیا؟ کہیں بہتر ہوتا اگر وہ گھوڑے پر چڑھتا اور الحزبل لوٹ جاتا لیکن جب اس نے اپنے چاروں طرف مایوس چہرے دیکھے تو اس نے سوچا کہ وہ چاہے یا نہ چاہے۔ اس کا مستقبل اب ان سے وابستہ ہو گیا ہے اب ان سب پر ایک اجتماعی آفت آئے گی۔ اب وہ انہیں چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ ان کے دل ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے۔ سب سے ضروری بات یہ تھی کہ اب وقت ضائع نہ کیا جائے۔

ابن باسط بھی اسی انداز سے سوچ رہا تھا اور پھر وہ کھڑا ہوا تاکہ میٹنگ کو برخاست کر دے۔ "دوستو! اب وقت آگیا ہے کہ آپ جائیں اور سب سے رخصت ہو لیں۔جو سرکردہ خاندانوں سے قربت رکھتے ہیں وہ جا کر انہیں خبردار کر دیں کہ کیپٹن جنرل یرغمال طلب کر رہا ہے۔ اگر ان کے بڑے بیٹے ہمارے ساتھ آنا چاہیں تو جہاں تک ہو سکا ہم ان کی حفاظت کریں گے اب ہمیں کب اکٹھا ہونا چاہئے؟"

"کل۔ علی الصبح" زہیر نے بڑے اعتماد سے کہا۔" ہم گھوڑوں پر سوار ہو کر بازار میں اپنے دوستوں سے جا ملیں گے۔ وہ عیسائیوں کے خلاف لڑنے کے لئے فوج تیار کر رہے ہیں۔ میں پہلی اذان پر فندق کے صحن میں ملوں گا۔ السلام علیکم"

زہیر اعتماد کے ساتھ قدم اٹھاتا ہوا روانہ ہو گیا لیکن اپنی پوری زندگی میں کبھی اس نے خود کو اتنا تنہا محسوس نہیں کیا تھا۔ فندق کے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے اس نے سوچا "میں نے اپنے لئے کیسا دکھی اور سیاہ نصیب منتخب کیا ہے۔" وہ ہر قیمت پر زندیق کو ڈھونڈنا چاہتا تھا تاکہ اس کے ساتھ ایک جام کا لطف اٹھائے اور اپنے خدشات اور خطرات پر تبادلہ خیالات کرے لیکن بوڑھا شہر سے جا چکا تھا۔ زندیق الحزبل کے راستہ پر رواں تھا جہاں وہ زہیر کے فکر مند گھر والوں کو غرناطہ کے واقعات سے مطلع کرنا چاہتا تھا۔

"زہیر بن عمر۔ اللہ تمہیں امان میں رکھے"

زہیر چونک گیا۔ اسے کوئی نظر نہیں آیا۔ پھر اندھیرے میں سے ایک سایہ سا اٹھ کر اس کے سامنے آیا۔ یہ اس کے چچا کے گھر کا پرانا ملازم تھا۔

"اسلام علیکم۔ دوست۔ تم ادھر کیسے؟"

"مالک آپ کے ساتھ رات کا کھانا کھانا چاہتے ہیں۔ مجھے آپ کو لانے بھیجا ہے"

"میں خوشی سے تمہارے ساتھ چلوں" گا زہیر نے جواب دیا۔ "چچا سے مل کر مجھے بہت مسرت ہو گی" ابن حشام باہر کے احاطہ میں پھر رہا تھا۔ اسے اپنے بھتیجے کی آمد کا بے چینی سے انتظار تھا۔ دن کے واقعات سے وہ بہت اداس اور گھبرایا ہوا تھا لیکن دل ہی دل میں وہ عمر کے بیٹے کے طرز عمل پر فخر محسوس کر رہا تھا۔ جب زہیر آیا تو چچا نے اسے گلے لگایا اور بوسے دیئے۔

"میں تم سے ناراض ہوں۔ زہیر۔ تم اس گھر کے راستے کہیں اور گئے۔ میرے بھائی کے بیٹے نے کب سے اس شہر میں سرائے میں ٹھہرنا شروع کیا ہے۔؟ یہ تمہارا گھر۔ جواب دو۔ لڑکے۔ پیشتر اس کے کہ میں تمہیں کوڑے لگاؤں۔"

نہ چاہتے ہوئے بھی زہیر اس شفقت کے اظہار سے بہت متاثر ہوا۔ وہ مسکرایا۔ اسے عجیب سا احساس ہوا۔ اس نے خود کو قصوروار ٹھہرایا گویا وہ پھر دس برس کا بچہ ہو گیا تھا جسے اس کے چچا نے بھاگتے ہوئے پکڑ لیا تھا۔

"میں آپ کو کسی مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ چچا۔ آپ کو میری حرکتوں سے ضرر کیوں پہنچے۔؟ بہتر یہی تھا کہ میں فندق میں ہی ٹھہرتا۔"

"کیا بک رہے ہو۔ کیا میرے مذہب تبدیل کرنے سے میرے خون کے رشتے بھی بدل گئے؟ تمہیں غسل کی ضرورت ہے۔ میں تمہارے لئے کپڑے بھی نکلواتا ہوں۔"

"چچی کیسی ہیں؟ میرے بھائی کس حال میں ہیں؟" زہیر نے حمام کی طرف جاتے ہوئے پوچھا "وہ کلثوم کے ساتھ ہی اشبیلیہ میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ چند ہفتوں تک لوٹ آئیں

گے۔ تمہاری چچی اب بڑھاپے کی منزل میں داخل ہو رہی ہیں۔ پہاڑ پر انہیں گٹھیا کی شکایت ہو جاتی ہے۔ اشبیلیہ میں اس قدر ٹھنڈ نہیں ہے"

دو ملازموں نے اسے اچھی طرح مل مل کر نہلایا۔ زہیر حمام میں ستانے لگا۔ وہ گھر بھی جاسکتا تھا۔ حشام کی تسلیوں کے باوجود اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ اپنے چچا کے مستقبل کے لئے خطرات پیدا کر رہا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ کسی نے انہیں گھر میں آتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ لیکن ملازموں سے بات نکل سکتی تھی۔ ہو سکتا ہے وہ دوستوں میں فخریہ بیان کریں کہ زہیر نے مالک کے ساتھ کھانا کھایا۔ کل تک سارے شہر میں یہ داستان بڑھا چڑھا کر سنائی جانے لگے گی اور آرچ بشپ کے کسی جاسوس کے کان میں پڑ سکتی ہے۔

معمول کے مطابق اور سادہ سا کھانا کھانے کے بعد گفتگو کا رخ اس طرف مڑ گیا کہ ان کے مذہب پر کیسا برا وقت آگیا تھا۔

"قصور ہمارا ہی ہے۔ بیٹے۔ ہمارا ہی۔" ابن حشام نے بغیر کسی تذبذب کے کہا۔ ہم صرف دشمنوں پر ہی سارا الزام ڈال دیتے ہیں۔ لیکن خرابی ہمارے اپنے اندر ہے۔ ہمیں بہت جلد کامیابی حاصل ہو گئی۔ رسولؐ اللہ کا انتقال بے وقت ہو گیا۔ ابھی تو وہ اپنے نظام کو مستحکم بھی نہیں کر پائے تھے۔ ان کے جانشینوں نے ظالم قبائلی سرداروں کی طرح ایک دوسرے کا خون کیا۔ اس کے بجائے کہ ہم مفتوح تہذیبوں کی اچھی باتیں اپناتے ہم نے ان پر اپنا غیر مستحکم نظام مسلط کرنا چاہا۔ اندلس میں بھی ایسا ہی ہوا۔ بڑے خوبصورت لیکن بے معنی تکلفات۔ مسلمان جانوں کی بے مقصد قربانیاں۔ خالی خولی شجاعت کا اظہار...."

"معاف کیجئے۔ چچا۔ لیکن آپ کی بات لفظ بہ لفظ عیسائیوں پر بھی صادق آتی ہے۔ آپ کی وضاحت مناسب نہیں ہے۔"

اس رات ایسی ہی باتیں ہوتی رہیں۔ حشام بھتیجے کو مطمئن نہیں کر سکا اور زہیر اپنے چچا کو یہ نہیں سمجھا سکا کہ اب جنگ کرنے کا وقت آگیا تھا۔ یہ بات زہیر پر واضح ہو گئی تھی کہ اس کے چچا کی تبدیلی مذہب محض ایک دکھاوا تھی۔ وہ مسلمان شرفا کی طرح گفتگو کر رہا تھا اور اس کا طور طریقہ بھی وہی تھا۔ اس کے کھانے میں سور کی غلاظت شامل نہیں تھی۔ باورچی خانہ میں اور گھر میں اہل ایمان بھرے ہوئے تھے۔ اور اگر بوڑھا ملازم سچ بول رہا تھا تو حشام روزانہ مشرق کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتا تھا۔

"احمقانہ معرکہ آرائیوں میں اپنی جوانی برباد نہ کرو۔ تاریخ ہمیں پیچھے چھوڑ گئی ہے۔ تم یہ تسلیم کیوں نہیں کرتے؟"

"میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھا نہیں رہوں گا اور ہر ظلم کو خاموشی سے برداشت نہیں کروں گا۔ یہ وحشی ہیں اور وحشیوں کا مقابلہ کرنا چاہئے۔ چرچ کا غلام ہونے سے مر جانا بہتر ہے۔"

ابن حشام نے اس کو اعتماد میں لیتے ہوئے کہا "گزشتہ چند ماہ میں مجھ پر ایک ایک بات واضح ہوئی ہے۔ یہ نئی دنیا جس میں ہم رہ رہے ہیں اس میں مرنے کا بھی ایک نیا طریقہ ہے اگلے وقتوں میں ہم ایک دوسرے کو مارا کرتے تھے۔ دشمن ہمیں مار دیتا اور بات ختم ہو جاتی لیکن اب مجھے معلوم ہوا ہے کہ مکمل لا تعلقی بھی اتنی ہی ظالمانہ موت ہے جتنی دشمن کی تلوار سے مارے جانا"

"لیکن آپ کے تو ہمیشہ بہت دوست رہے ہیں..."

"وہ سب اپنی اپنی راہ چلے گئے۔ اگر صرف ظاہری حیثیت سے دیکھا جائے تو لگے گا کہ لوگ اس طرح کی آفتوں سے' جو ہم پر گزر رہی ہے' بڑے آرام سے گزر جاتے ہیں لیکن زندگی بہت پیچیدہ ہے۔ ہمارے اندر سب کچھ بدل جاتا ہے۔ میں نے ذاتی مفادات کی خاطر مذہب تبدیل کیا ہے لیکن اس نے مجھے اور بھی تنہا کر دیا ہے۔ میں ان کے درمیان کام کرتا ہوں لیکن چاہے کتنی بھی کوشش کروں میں ان میں سے نہیں ہو سکتا۔"

"اور میں سمجھتا تھا کہ اپنے پورے خاندان میں' میں ہی وہ واحد شخص ہوں جو تنہائی کا مطلب سمجھتا ہے۔"

"اس میں کوئی شکایت کی بات نہیں۔ دنیا میں میرے بھی بڑے متحمل دوست تھے۔ آج کل میں زیادہ تر ان ہی سے باتیں کرتا ہوں۔ میرے احاطے کے پتھر"

وہ دونوں اٹھے اور زہیر نے بغلگیر ہو کر اپنے چچا کو الوداع کہا۔

"مجھے خوشی ہے چچا کہ میں آپ سے ملنے آیا۔ میں اس ملاقات کو کبھی نہیں بھولوں گا"

"مجھے ڈر ہے کہ یہ شاید ہماری آخری ملاقات ہو۔"

زہیر اپنے بستر میں لیٹا دن بھر کے واقعات پر غور کرتا رہا۔ کس قدر بے دردی سے کاؤنٹ نے ان کی امیدوں پر پانی پھیر دیا تھا۔ آرچ بشپ جیت گیا تھا۔ عیار۔ سخت گیر۔ سینیروس۔ اب شہر پر اس کا قبضہ تھا اور وہ اسے اندر سے تباہ کر دے گا۔ غرناطہ والوں کی روح کو کچل دے گا۔ انہیں اپنی ہی نظروں میں ذلیل اور بدشکل بنا دے گا' غرناطہ ختم ہو جائے گا۔ کہیں بہتر ہوتا اگر اسے مسمار کر دیا جاتا اور صرف اس کی اصلی حالت باقی رہتی

یعنی ایک خوبصورت میدان۔ اس میں بہتی ہوئی ندیاں اور ان پر مرجھائے ہوئے درخت۔ یہی وہ حسن تھا جس نے اس کے آباؤاجداد کو اپنی طرف کھینچا تھا اور یہی وہ جگہ تھی جہاں انہوں نے یہ شہر بسایا تھا۔

اب اس کا دھیان چچا کے ساتھ گزاری ہوئی شام کی طرف پلٹ گیا۔ زہیر کو اس شام کی تلخ نوائی اور احساس ذلت سے بہت حیرانی ہوئی تھی لیکن ساتھ ہی ساتھ بہت سکون بھی ملا تھا۔ اگر اس کا چچا ہشام جو اتنا سمجھدار تھا اور جس کے پاس اتنی دولت تھی' عیسائی بننے سے خوش نہیں ہوا تو پھر وہ خود جس راستے پر جا رہا تھا وہی ٹھیک تھا۔ اس دولت اور شان و شوکت کا کیا فائدہ اگر انسان اندر سے دکھی اور بے مایہ ہو؟

اس رات زہیر کو ایک بہت برا خواب نظر آیا۔ وہ کانپتا ہوا' پسینہ میں ڈوبا' اٹھا۔ اس نے دیکھا کہ الحزیل میں اس کا گھر سفید چادر کے شامیانے میں لپٹا ہوا ہے۔ وہ صرف یزید کو پہچان سکا جو ہنس رہا تھا لیکن یہ اس کی مانوس ہنسی نہیں تھی بلکہ وہ بوڑھے آدمی کی طرح ہنس رہا تھا۔ شطرنج کے بڑے بڑے مہرے زندہ ہو گئے تھے اور اسکو گھیرے ہوئے تھے اور عجیب سی زبان میں بول رہے تھے۔ آہستہ آہستہ وہ یزید کی طرف بڑھے اور اس کا گلا گھونٹنے لگے۔ بھیانک قہقہہ خرخراہٹ میں بدل گیا۔

زہیر پڑا ہوا کانپتا رہا۔ نیند پھر نہیں آئی۔ وہ بستر میں لیٹا رہا' پوری طرح جاگتا ہوا۔ کمبل میں لپٹا ہوا' بڑی بے صبری سے صبح کی پہلی آوازوں کا انتظار کرتا ہوا۔

"لا الہ اللہ محمد الرسول اللہ"

وہی الفاظ' وہی لے' آٹھ مختلف آوازیں' آٹھ گونجتی ہوئی آوازیں' ایک دوسرے سے مقابلہ کرتی ہوئی۔ اہل ایمان کی آٹھ مسجدیں۔ آج۔ لیکن کل؟ زہیر پہلے ہی پریشان تھا۔ نیچے بڑے احاطہ میں گھوڑوں کے سموں کی آواز سنائی دی۔ اس کے گھوڑے پر زین کسی جا رہی تھی اور اصطبل کا ملازم لڑکا جو عمر میں یزید سے کچھ زیادہ بڑا نہیں تھا اسے گڑ کی بھیلی کھلا رہا تھا۔ گھوڑوں کے ٹاپوں کی اور آوازیں آئیں۔ اس نے ابن باسط اور ابن امین کی آوازیں سنیں۔

وہ سوار ہو کر فندق سے نکل گئے۔ تنگ گلیوں میں سے ہوتے ہوئے صبح کے دھندلکے میں جبکہ غرناطہ ابھی نیند سے جاگ ہی رہا تھا وہ باہر آ گئے۔ دروازے کھل رہے تھے اور لوگ گروہ در گروہ مسجدوں کی طرف دوڑ رہے تھے۔ کچھ کھلے ہوئے دروازوں میں زہیر کو لوگ وضو کرتے ہوئے نظر آئے جو اپنے چہروں سے نیند کے میل کو دھو رہے تھے۔

شہر اب سنسان نہیں تھا۔ جیسا کہ چچا کے گھر سے فندق آتے ہوئے شام کی روشنی میں وہ زہیر کو اداسی میں ڈوبا لگا۔ ابن باسط کو یاد نہیں آ رہا تھا کہ پہلے کبھی اس نے اتنے لوگوں کو نماز فجر کے لئے تیزی سے جاتے دیکھا ہو۔

شکست سے پہلے جمعہ کی نماز میں خاصا مجمع ہوا کرتا تھا۔ یہ مذہبی اجتماع ہونے کے ساتھ ساتھ سیاسی اور سماجی اجتماع بھی ہوتا تھا۔ اکثر امام سیاسی اور عسکری معاملات پر گفتگو کرتا اور مذہبی باتیں ان دنوں میں ہوتیں جب کچھ نہیں ہو رہا ہوتا۔ عام طور پر لوگوں میں اطمینان پایا جاتا۔ اسکے برخلاف آج بڑی گھٹی ہوئی خاموشی نظر آ رہی تھی۔

"زہیر الفحل" ابن امین نے بڑے جوش سے کہا۔ "ابن باسط اور میں دو تحفے الحمرا بھیج رہے ہیں۔ تم ہمارے ساتھ وہاں تک چلو گے؟ دوسرے دوست شہر کے باہر ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔ "چالیس" اب "تین سو" ہو گئے ہیں"

"کیسے تحفے؟" زہیر نے پوچھا۔ اس کی نظر دو خوبصورت ڈبوں پر پڑی جنہیں ریشم کے دھاگوں سے باندھا گیا تھا۔ "عطر کی بدبو بہت تیز ہے"

"ایک ڈبہ زمنس کے لئے ہے" ابن باسط نے بڑی مشکل سے چہرے پر سنجیدگی طاری کرتے ہوئے کہا "اور دوسرا۔ کاؤنٹ کے لئے۔ یہ الوداعی تحفہ ہے جسے یہ معزز شخص کبھی نہیں بھولیں گے"

زہیر کو یہ انداز غیر ضروری نظر آیا۔ یہ آداب جنگ کے ساتھ مذاق تھا لیکن وہ ان کے ساتھ جانے پر راضی ہو گیا۔ چند منٹ میں وہ شاہی محل کے دروازے پر پہنچ گئے۔

"جہاں ہو۔ وہیں ٹھہر جاؤ" دو نوجوان سپاہی تلواریں کھینچ کر ان کی طرف دوڑے "تمہیں کیا کام ہے؟"

"میرا نام ابن امین ہے۔ کل کیپٹن جنرل شہر میں ہمارے پاس آئے تھے اور انہوں نے ہمیں اپنے ساتھ ناشتہ کی دعوت دی تھی۔ انہوں نے کچھ خواہش بھی ظاہر کی تھی اور صبح تک ہمارا جواب چاہتے تھے۔ ہم ان کے لئے اور تقدس ماب ٹولیڈو کے آرچ بشپ کے لئے تحفہ لائے ہیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم ٹھہر نہیں سکتے۔ کیا آپ ہماری طرف سے معذرت کر دیں گے اور یہ تحفے جو ہماری عقیدت کا ایک حقیر اظہار ہے صبح اٹھتے ہی ان دونوں کو دے دیں گے؟"

سپاہی مطمئن ہو گئے اور انہوں نے بڑی خوش اخلاقی سے تحفے وصول کئے۔ نوجوان مڑے اور تیزی سے گھوڑے دوڑاتے ہوئے اپنے ساتھیوں سے جا ملے جو شہر کے باہر اکٹھا

ہو گئے تھے۔ دروازے پر متعین سپاہیوں نے گھورتے ہوئے انہیں گزرتے ہوئے دیکھا۔

تین سو مسلح سوار جن میں اکثر ابھی بیس برس کے بھی نہیں تھے ایسے موقع پر ان سے خاموشی کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ وہ چلا رہے تھے۔ سرگوشیاں کر رہے تھے اور زور زور سے قہقہے لگا رہے تھے۔ پہاڑوں کی ٹھٹھرتی ہوئی سرد ہوا میں آدمی اور گھوڑے سب بھاپ میں لپٹے ہوئے تھے۔ دیوراوں پر سے فکر مند مائیں چادروں میں لپٹی ہوئی انہیں الوداع کہہ رہی تھیں۔ زہیر کو یہ شور ناگوار گزرا لیکن سپاہیوں کے پاس پہنچنے پر اس کا موڈ بدل گیا۔ یہ ایک شاندار منظر تھا اور اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ غرناطہ کے عربوں نے ابھی امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا۔ جیسے ہی تینوں دوست اس مجمع کے قریب پہنچے تو پرجوش نعروں سے ان کا استقبال کیا گیا۔ درپیش خطرات سے وہ سب آگاہ تھے اس کے باوجود ان کے حوصلے بلند تھے۔

"کیا تم نے تحائف پہنچا دیئے؟" شہر سے نکلتے ہوئے ابن وہاب نے پوچھا۔ ابن امین نے ہاں میں سر ہلایا اور ہنسا۔

"واللہ۔ زہیر نے پوچھا۔ ہنسی کی کیا بات ہے؟"

"تم واقعی جاننا چاہتے ہو؟" ابن باسط نے چھیڑتے ہوئے کہا۔ "ابن امین تم بتاؤ۔"

اس بات پر کاؤنٹ کے ذاتی معالج کا بیٹا اتنی زور سے ہنسا کہ زہیر کو ڈر ہوا کہ اس کا سانس نہ رک جائے۔

"عطر کی بدبو! تم نے ہمارا جرم سونگھ لیا" جب ہنسی رکی تو ابن امین' بولا "ان بکسوں میں گلاب کے عطر میں لپٹا ہوا ایک بہت ہی نادر تحفہ ہے جو آرچ بشپ اور کاؤنٹ کے ذائقے کے لئے ہے اس پر چاندی کے ورق چڑھے ہیں۔ ہم نے انہیں جو تحفہ بھیجا ہے زہیرالفحل' وہ ہمارے فضلے ایک حصہ ہے۔ یہ آج ہی صبح تازہ تازہ اسی یہودی نے خارج کیا ہے اور دوسرا ایک بڑے پکے عرب ابن باسط کی انتڑیوں سے نکلا ہوا۔ ان دونوں کے نام ہم نے اپنا نام ظاہر کئے بغیر یہ تحفے بھیجے ہیں اور ہمیں امید ہے کہ وہ اس ناشتہ کو پسند کریں گے"

یہ بڑی طفلانہ حرکت تھی۔ زہیر نے بڑی مشکل سے ہنسی ضبط کی۔ وہ بے اختیار کھانسنے لگا اس بات کو تمام لوگوں تک پہنچنے میں کچھ دیر لگی۔ چند منٹ کے اندر اندر تین سو جوانمرد قہقہوں پر قہقہے لگا رہے تھے۔

زہیر نے کہا"اور سوچا جائے تو یہ کچھ زیادہ جذباتی حرکت تھی" اس پر اس کے دوست

اور بھی ہنسے۔

وہ چند گھنٹے سفر کرتے رہے۔ سورج طلوع ہو چکا تھا۔ ہوا رکی ہوئی تھی۔ ٹوپیاں اور چادریں اتار دی گئی تھیں اور کوئی سو کے قریب ملازم جو ان کے ساتھ سفر کر رہے تھے ان کو پکڑا دی گئی تھیں۔ دو گھنٹے تک چلتے رہنے کے بعد انہوں نے سواروں کا ایک چھوٹا سا دستہ دیکھا جو ان کی طرف آ رہا تھا۔

"اللہ اکبر"۔ زہیر نے نعرہ لگایا جس کا غرناطہ کے نوجوانوں نے جواب دیا۔

سامنے سے آنے والے سواروں کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ زہیر نے اپنے دستے کو رکنے کا حکم دیا۔ اسے خطرہ تھا کہ وہ گھیرے میں نہ آجائیں۔ جب سوار نزدیک آئے تو زہیر نے انہیں پہچان لیا۔ اس کا حوصلہ بڑھ گیا۔

"ابو زیدالمعریٰ!" وہ خوشی سے چلایا "اسلام علیکم! دیکھا۔ میں نے تمہارے کہنے پر عمل کیا اور کچھ دوستوں کو بھی ساتھ لے آیا۔"

"تمہیں دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی ہے۔ زہیر بن عمر۔ میں جانتا تھا تم اس طرف آ رہے ہو بہتر ہے کہ تم ہمارے پیچھے پیچھے آؤ اور اس راستے سے ہٹ جاؤ۔ یہ بہت عام راستہ ہے اور اب تک سپاہی تمہاری تلاش میں نکل پڑے ہوں گے اور اندازہ لگا رہے ہوں گے کہ تم رات کہاں گزارو گے"

زہیر نے اسے کاؤنٹ اور آرچ بشپ کو بھیجے ہوئے تحفوں کے متعلق بتایا۔ وہ حیران تھا کہ ابو زید ہنسا نہیں۔

"تم نے بڑی حماقت کی ہے میرے دوستو۔ الحمرا کے باورچی خانے میں تو شاید لوگ اس مذاق پر خوش ہوں لیکن شاہی محل میں ان کی کوئی حیثیت نہیں۔ تم نے کاؤنٹ اور پادری کو متحد کر دیا ہے صرف پادری کو تحفہ بھیجتے تو کافی ہوتا۔ اس میں شاید کاؤنٹ کو بھی لطف آتا اور وہ تم پر حملے کو ٹال دیتا۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ تم پہلے شخص ہو جنہوں نے اتنی توہین آمیز بات کی ہو۔ تمہاری طرح سارے اندلس میں بڑے لوگوں نے ایسی ہی حماقتیں کی ہیں۔ دیر ہو رہی ہے ہمیں جتنی جلدی ہو سکے اس علاقے سے نکل جانا چاہئے۔"

زہیر آپ ہی آپ ہنسا۔ وہ جراتمند نوجوان تھا لیکن عقل سے بالکل عاری نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس میں بے ضابطہ پہاڑی فوج کی قیادت کرنے کی اہلیت نہیں ہے۔ ابوزید کی موجودگی میں اس کے سر کا یہ بوجھ کافی ہلکا ہو گیا تھا۔

چلتے چلتے پورا دن نکل آیا تھا۔ آسمان پر ایک بادل بھی نہیں تھا اور سورج کی شعاعیں

سیدھی پڑ رہی تھیں اور پہاڑوں کی خاک ان کی ناک میں گھسی جا رہی تھی۔ ان کے سامنے ایک وسیع ویرانہ تھا۔

اسی شام زندیق نے زبیر کا خط عمر کو دیا اور گزشتہ دو روز کے واقعات دوہرائے۔ اس کی روئیداد خاموشی سے سنی گئی۔ یزید نے بھی کوئی سوال نہیں پوچھا۔ جب بوڑھا بات ختم کر چکا تو اماں زور زور سے رونے لگی۔

"اب سب ختم ہے۔" اس نے روتے ہوئے کہا۔ "سب ختم ہو گیا"

"لیکن اماں" یزید نے جواب میں کہا

"زبیر زندہ ہے اور خیریت سے ہے۔ انہوں نے جہاد شروع کر دیا ہے۔ اس سے تمہیں خوش ہونا چاہئے اداسی نہیں۔ تم اس طرح کیوں رو رہی ہو؟"

"مجھ سے مت پوچھو ابن عمر۔ اس بڑھیا کو تنگ نہ کرو"

زبیدہ نے یزید کو اشارہ کیا کہ وہ اس کے اور عمر کے پیچھے پیچھے کمرے سے باہر نکل آئے۔ جب اماں نے دیکھا کہ وہ زندیق کے ساتھ تنہا رہ گئی ہے تو اس نے اپنے آنسو پونچھے اور اس صبح زبیر کے حلیے کی تفصیلات پوچھیں۔

"کیا اس نے گہری نیلی پگڑی باندھی ہوئی تھی جس پر سنہری ہلال لگا تھا؟"

زندیق نے ہاں میں سر ہلایا۔

"میں نے اسی صورت میں رات اسے خواب میں دیکھا"

زندیق کا لہجہ دھیما تھا۔ "خوابوں سے ہمیں زیادہ خود آگاہی ہوتی ہے۔ عامرہ" "تم میری بات نہیں سمجھتے۔ احمق بوڑھے" اماں نے غصے سے کہا۔ "میرے خواب میں زبیر نے یہی صافہ باندھا ہوا تھا۔ لیکن سرزمین پر تھا۔ خون میں ڈوبا ہوا۔ جسم تھا ہی نہیں"

زندیق نے سوچا کہ وہ پھر رو پڑے گی۔ لیکن اس کا چہرہ بے رنگ ہو گیا اور وہ زور زور سے اور بے قاعدہ سانس لینے لگی۔ اس نے اسے پانی پلایا اور سہارا دے کر اس کے کمرے میں لے گیا۔ ایک چھوٹی سی کوٹھڑی جس میں اس نے گزشتہ پچاس برس گزارے تھے۔ وہ لیٹ گئی اور زندیق نے اسے کمبل اڑھا دیا۔ اسے گزرے ہوئے دن یاد آئے۔ آدھی ان کہی باتیں، خود فریبیاں، اور زہرہ کے ساتھ اس کی محبت سے جو اماں کو دکھ پہنچا تھا، اس نے محسوس کیا کہ اس کی وجہ سے اماں کی زندگی برباد ہو گئی۔

بڑھیا نے جیسے اس کے خیالات کو بھانپ لیا تھا۔

"مجھے اس جگہ گزاری ہوئی زندگی کے ایک لمحہ کا بھی افسوس نہیں ہے۔"

وہ اداسی سے مسکرایا۔ "کسی اور جگہ ہوتیں تو تم اپنی مالک آپ ہوتیں۔ صرف خود کو جوابدہ" اس نے زندیق کی طرف التجا بھری آنکھوں سے دیکھا۔

"میں نے اپنی زندگی ضائع کر دی۔ عامرہ" اس نے کہا۔ "اس گھر نے مجھے ہمیشہ کے لئے مردود قرار دے دیا۔ کاش میں نے کبھی اس احاطہ میں قدم نہ رکھا ہوتا۔ سچ یہی ہے۔"

ایک دم سے اسے یاد آیا جب وہ اٹھارہ برس کا تھا۔ گھنے سیاہ بال اور ہنستی ہوئی آنکھیں یہ یاد ہی بہت تھی۔

"اب تم جاؤ" اماں نے کہا "اور مجھے سکون سے مرنے دو"

زندیق کے لئے سکون سے مرنے، بغیر کسی آہ و زاری کے گزر جانے کا خیال ہی ناقابل یقین تھا اور اس نے اماں سے یہی کہا۔

"میں نے تو یہی سیکھا ہے۔" اماں نے تسبیح کو مضبوطی سے پکڑتے ہوئے کہا۔ "اللہ پر بھروسہ"

اماں اس روز نہیں مری بلکہ دوسرے دن بھی نہیں۔ وہ ایک ہفتہ تک سسکتی رہی اور آہستہ آہستہ سب سے رخصت ہوتی رہی۔ اس نے عمر کے ہاتھ چومے۔ یزید کے آنسو خشک کیے۔ زبیدہ کے سامنے اس گھر کی خیریت کے متعلق تشویش کا اظہار کیا اور اس سے منتیں کیں کہ بچوں کو لے کر وہاں سے چلی جائے۔ اس نے بڑے ضبط سے کام لیا لیکن زبیر کو یاد کرتے ہوئے صبر کا دامن اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

"اس کے لئے اب میرے بعد وہ خاص مشروب کون بنائے گا؟" وہ رو پڑی

غرناطہ سے زبیر کے فرار کے تین روز بعد وہ سوتے میں گزر گئی۔ اسے خاندانی قبرستان میں زہرہ کے قریب دفن کر دیا گیا۔ یزید چھپ چھپ کر روتا رہا۔ اسے احساس ہونے لگا تھا کہ وہ بڑا ہو رہا ہے اور اسے ہمت کا مظاہرہ کرنا چاہئے اور یوں سب کے سامنے جذبات سے بے قابو نہیں ہونا چاہئے۔

باب 11

ہر صبح ناشتہ کے بعد یزید اپنی کتابیں اٹھاتا اور برج میں چلا جاتا۔

"یہاں میرے پاس بیٹھ کر پڑھو" زبیدہ منت کرتی لیکن وہ اداسی سے مسکرا دیتا۔

"میں اکیلے میں پڑھنا چاہتا ہوں۔ برج میں بہت سکون ہے۔"

زبیدہ نے بھی کبھی زور نہیں دیا۔ چنانچہ شروع میں جو اپنے بڑے ہونے کے ساتھ ساتھ خودمختاری کا ایک اظہار تھا زندگی کا معمول بن گیا۔ یہ دو ماہ پہلے اس وقت شروع ہوا تھا جب غرناطہ کے واقعات کے بعد تین سو آدمی زہیر کی سربراہی میں وہاں سے فرار ہو گئے تھے۔

یزید کو اپنے بھائی پر بہت فخر تھا۔ گاؤں میں اس کے دوست اس کو رشک کی نظر سے دیکھتے اور اسے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ گھر میں اس قدر مایوسی کی فضا کیوں ہے۔ اماں نے بھی جو اس قدر سکون کے ساتھ مری تھی اپنے خدشات کا اظہار کیا تھا۔

"ابن عمر' اس مہم جوئی سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔" اس نے یزید سے کہا تھا۔ اس وقت اسے معلوم نہیں تھا کہ مرنے والی کے آخری الفاظ یہی تھے۔

اس کی اس تشویش کی وجہ سے ہی یزید کو سارے معاملہ پر ازسرنو غور کرنا پڑا۔ یہ اماں ہی تھی جو اس خاندان کے کسی بھی مرد کی جرات کی داد دیتی اور حمایت کرتی خواہ یہ حرکت کتنی ہی احمقانہ ہوتی۔ اس نے یزید کے سر میں کبھی نہ ختم ہونے والی بہادری کی داستانیں ٹھونس دی تھیں خصوصاً ابن فرید کے نمایاں کارناموں کے حوالے سے۔ اگر اماں کو زہیر کے متعلق تشویش تھی تو یقیناً حالات بہت سنگین ہوں گے۔

برج پر سے یزید نے دیکھا کہ ایک سوار گھر کی طرف آ رہا ہے۔ روزانہ جب وہ اوپر

جاتا تو یہی خواہش ہوتی وہ یہی دعائیں کرتا کہ ایسی کوئی صورت نظر آئے اور وہ صورت اس کے بھائی کی ہو- سوار گھر کے دروازے پر پہنچ گیا تھا- اس کا دل ڈوب گیا- یہ زہیر نہیں تھا- قطعی نہیں-

یزید کو کبھی گھر اتنا خالی خالی نہیں لگا تھا- اس کا سبب محض زہیر کی عدم موجودگی یا اماں کی موت نہیں تھی- یہ صدمے بڑے تھے- لیکن زہیر کو ایک دن آنا ہی تھا اور اما' وہ تو ایک دن بقول اس کے جنت میں مل ہی جائے گی- وہ ساتویں آسمان پر ملیں گے دودھ کی شیریں نہر کے پاس- اما اسے بہت یاد آتی تھی- گو وہ اس بات کو مانتا نہیں تھا- بہرحال اس کی جگہ زندیق نے لے لی تھی جسے چاند ستاروں کی چالوں سے زیادہ واقفیت تھی- جب اس نے زندیق سے جنت میں اما سے ملنے کی بات کی تو بوڑھا اپنے پوپلے منہ سے ہنسا اور اس نے ایک عجیب سی بات کی

"تو عامرہ کا خیال تھا کہ وہ سیدھی ساتویں آسمان پر پہنچ جائے گی- واقعی! مجھے یقین نہیں- یزید بن عمر! تمہیں پتہ ہے وہ بے گناہ نہیں تھی- میرا خیال ہے کہ وہ پہلے آسمان سے بھی مشکل سے ہی گزرے گی اور کون جانے وہ اسے دوسری طرف ہی بھیج دیں؟"

نہیں- یہ تو ہند کی شادی اور اس کی رخصتی تھی جس پر اسے حیرانی تو نہیں تھی لیکن اس کا اس پر بہت اثر ہوا تھا- تمام گھروالوں میں وہی ہند کے سب سے زیادہ قریب تھا- لیکن وہ جا چکی تھی- یہ صحیح ہے کہ اس نے والدین سے درخواست کی تھی کہ وہ اس کو بھی کچھ دیر کے لئے اس کے ساتھ سمندر پار جانے دیں- اس نے وعدہ بھی کیا تھا وہ خود ہی چند ماہ بعد اسے واپس چھوڑ جائے گی- لیکن زبیدہ بیٹے سے جدائی برداشت نہیں کر سکتی تھی-

"اب صرف یہی تو گھر میں رہ گیا ہے- میں اپنے یہ لعل کسی قیمت پر بھی اپنے سے چھیننے نہیں دوں گی- تمہیں بھی نہیں- ہند"

چنانچہ ہند' بھائی کے بغیر رخصت ہو گئی- اپنے آبائی گھر سے بھی زیادہ اسے یزید سے چھٹ جانے کا دکھ تھا اور وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روئی اور ملاکا سے تانجا کے لئے ابن داؤد کے ساتھ جہاز پر سوار ہوتے ہوئے بھی وہ اسی لئے روئی تھی-

کوئی دوڑتا ہوا برج کی سیڑھیوں پر چڑھ رہا تھا- یزید اپنے خیالوں سے نکل آیا اور نیچے اترنے لگا- آدھی سیڑھیوں میں ہی اس کی ملاقات اپنی ماں کی ملازمہ سے ہوئی- عمیمہ کا چہرہ جذبات سے سرخ ہو رہا تھا-

"یزید بن عمر- تمہارے بھائی کا قاصد آیا ہے- وہ بی بی زبیدہ اور تمہارے والد کے ساتھ ہے لیکن جب تک تم نہ آؤ وہ کوئی بات نہیں کرے گا-"

یزید تیزی کے ساتھ اس کے پاس سے گزرتا ہوا نیچے کی طرف دوڑا- نیچے اتر کر وہ آندھی کی طرح احاطہ میں سے بھاگا- عمیمہ کا سانس پھول گیا تھا- اب وہ پہلے کی طرح جوان نہیں رہی تھی کہ ہرن کی طرح الفحل سے دوڑ لگا سکے- گزشتہ چند ماہ میں اسکا پیٹ نکل آیا تھا-

یزید ہانپتا ہوا ملاقات کے کمرے میں پہنچا-

"یہ یزید ہے" عمر نے کہا- اس کے چہرے پر خوشی کی لہریں دوڑ رہی تھیں-

"تمہارے بھائی نے تمہیں بہت سا پیار بھیجا ہے" ابن باسط نے کہا-

"وہ کہاں ہے؟ اچھی طرح ہے؟ میں اس سے کب ملوں گا؟"

"بہت جلد تم اس سے مل لو گے- ایک شام جب اندھیرا چھا جائے گا تو وہ یہاں آئے گا اور صبح ہونے سے پہلے ہی پہلے لوٹ جائے گا- اس کے سر کے لئے انعام رکھا گیا ہے"

عمر کے چہرے پر غصہ کے آثار نظر آنے لگے-

"کیوں؟ کیسے؟"

"آپ نے نہیں سنا؟"

"کیا نہیں سنا؟"

"گزشتہ ہفتہ کے واقعات- آپ نے یقیناً ان کے متعلق سنا ہو گا- غرناطہ میں یہ ہر ایک کی زبان پر ہیں- زہیر کا خیال تھا کہ ابن حشام نے یہ بات پہنچا دی ہو گی"

عمر کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی- وہ اپنی ڈاڑھی کے بالوں کو بل دے رہا تھا اور زبیدہ جو جانتی تھی کہ یہ کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ ہے- اس کے غصہ کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہی تھی-

"ہمیں اس کے متعلق کچھ معلوم نہیں- ابن باسط جلدی سے بتاؤ- تم جانتے ہو کہ ہم زہیر کی خیریت جاننے کے لئے کتنے بے تاب ہیں"

"یہ سب کچھ نو روز پیشتر ہوا- ابو زیدالمعری ہمیں پہاڑوں میں اپنے خفیہ ٹھکانے پر لے جا رہا تھا کہ ہمیں کچھ عیسائی نظر آئے- انہوں نے بھی ہمیں دیکھ لیا تھا اور لڑائی ناگزیر تھی ہم صرف تین سو تھے اور گھوڑوں کے قدموں کی اڑائی ہوئی دھول سے ہم نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ اگر زیادہ نہیں تو ہم سے دوگنے ہوں گے-

"ان کا ایک غیر مسلح قاصد ہماری طرف آیا ہمارا سردار' اس نے کہا معزز ڈون الانسوڈی ایکیولر آپ کو سلام بھیجتا ہے۔ اگر آپ ہتھیار ڈالیں تو ہم آپ سے اچھا سلوک کریں گے لیکن اگر آپ نے مزاحمت کی تو پھر وہ صرف آپ کے خالی گھوڑے ہی غرناطہ واپس لے کر جائے گا۔' ہم پھنس گئے تھے۔ ابو زید کو بھی کوئی بات نہیں سوجھی۔ اس وقت زہیر ابن عمر گھوڑے پر سوار آگے بڑھا۔ اس نے ایسی بلند آواز میں جو میلوں سنی جا سکتی تھی' پکارا اپنے سردار کو کہو کہ ہم کوئی غیر اہم لوگ نہیں ہیں۔ ہماری ایک تاریخ ہے۔ ہم عرب سردار ہیں جو اپنا دفاع کر رہے ہیں۔ اس سے کہو کہ میں زہیر ابن عمر عظیم سپہ سالار ابن فرید کا پڑپوتا ہوں۔ ڈون الانزو سے دست بدست لڑنا چاہتا ہوں۔ آج جو جیتے گا وہی دوسروں کی قسمت کا فیصلہ بھی کرے گا"

"ڈون الانسو کون ہے؟" یزید بیچ میں بول پڑا۔ وہ سہا ہوا تھا۔

"ڈون الانسو فوج کا سب سے بہادر اور سب سے تجربہ کار سپہ سالار ہے" ابن باسط نے جواب دیا۔ "دوست دشمن سب اسی سے ڈرتے ہیں۔ بہت بدمزاج ہے۔ اس کے ماتھے پر زخم کا ایک نشان ہے جو الحامہ میں ایک عرب سپاہی نے اسے لگایا تھا۔ کہتے ہیں اسی نے تن تنہا اس بدنصیب شہر میں سو آدمی مارے تھے۔ اس پر اللہ کی لعنت"

"بات جاری رکھو" زبیدہ نے التجا کی اور اپنی آواز سے کوئی تشویش ظاہر نہ ہونے دی

"ہمیں بہت تعجب ہوا کہ ڈون الانسو نے چیلنج قبول کر لیا۔ عیسائی سپاہی چراگاہ کے ایک حصے میں جمع ہونے شروع ہو گئے۔ ہم میں سے دو سو دوسری طرف چلے گئے"

"باقی کہاں تھے؟" یزید نے پوچھا۔ وہ اپنے جذبات پر قابو نہیں پا سکتا تھا

"یوں ہوا کہ ابو زید نے فیصلہ کیا کہ چاہے ہم جیتیں یا ہاریں اچانک ہلہ بولنا بھی ضروری ہے۔ اس نے سو آدمی لئے اور انہیں چراگاہ کے اوپر پہاڑیوں میں مختلف جگہ کھڑا کر دیا۔ منصوبہ یہ تھا کہ جیسے ہی مقابلہ ختم ہو ہم عیسائیوں پر جا پڑیں پیشتر اس کے کہ وہ جنگ کے لئے تیار ہوں۔"

"لیکن یہ تو کوئی اصول نہیں" عمر نے احتجاج کیا

"ٹھیک ہے۔ لیکن ہم شطرنج تو نہیں کھیل رہے۔ بہرحال زہیر کے ہاتھ میں ایک خوبصورت کڑھا ہوا جھنڈا تھا جو اسے غرناطہ میں ایک خاتون نے دیا تھا جس نے قسم کھا کے کہا تھا کہ ابن فرید اسے لے کر کئی جنگوں میں شریک ہوا تھا۔ اس کے سبز عمامہ پر ایک چمکتا ہوا چاندی کا ہلال۔ اس نے اپنے لوگوں کے سامنے جھنڈے کو گاڑا۔ کچھ فاصلے پر ہم

نے دیکھا کہ ڈون الالنسو نے ایک طلائی صلیب زمین میں گاڑ دی۔ اشارہ ہوتے ہی ڈون الانسو نے دھوپ میں جھلملاتے ہوئے نیزے سے زہیر کے دل کو نشانہ بنایا۔ دونوں نے ڈھالیں پھینک دی تھیں۔

"زہیر نے تلوار نکالی اور پاگلوں کی طرح بھاگا۔ غصہ سے اس کا چہرہ بگڑ گیا تھا۔ جیسے ہی وہ ڈون الانسو کے قریب پہنچا سب نے اس کے نعرے کی آواز سنی۔ لا الہ اللہ محمد الرسولؐ اللہ' اب وہ ایک دوسرے کے قریب پہنچ گئے تھے۔ زہیر نیزہ کی زد سے ہٹ گیا اور اس کا گھوڑا گرتے گرتے بچا۔ کیا غضب کی شہ سواری تھی۔ پھر ہم نے دیکھا کہ ابن فرید کی تلوار بجلی کی طرح لپکی۔ چند لمحے ایسا لگا کہ دونوں ہی بچ گئے تھے لیکن جب ڈون الانسو کا گھوڑا قریب آیا تو ہم نے دیکھا کہ اس کے سوار کا سر اڑ چکا تھا۔طولے طولا میں اب ایسی تلواریں نہیں بنتیں۔

"ہماری طرف سے بڑا زبردست نعرہ بلند ہوا۔ عیسائیوں کے حوصلے پست ہو گئے تھے اور وہ واپسی کی تیاری کر ہی رہے تھے کہ ابوزید ان پر جھپٹ پڑا۔ انہیں زبردست جانی نقصان ہوا۔ ہم نے پچاس قیدی بنائے لیکن زہیر کے اصرار پر انہوں نے ڈون الانسو کا جسم اور اس کا سر اسے غرناطہ واپس لے جانے دیا۔ سردار سے کہو' زہیر نے انہیں کہا کہ یہ جنگ ہم نے شروع نہیں کی۔ اس کا ایک بہادر سپہ سالار مارا گیا ہے اس لئے کہ کیپٹن جنرل بزدل اور ظالم پادری کے ایک کرایے کے سپاہی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا'"

یزید اس داستان سے مسحور ہو گیا۔ اسے اپنے بھائی پر اس قدر فخر کا احساس ہوا کہ اس نے اپنے والدین کے چہروں کے بدلتے ہوئے رنگ کو نہیں دیکھا۔ زندیق نے جو زہیر کی فتح کے نتیجہ سے خوفزدہ ہو گیا تھا ابن باسط سے پوچھا۔

"کیا ابو زید نے الحمرا کے ردعمل کے متعلق کچھ بتایا؟"

"ہاں" ابن باسط نے بوڑھے کی طرف حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا "اس نے دو دن بعد بہت کچھ بتایا"

"کیا بتایا؟" زبیدہ نے پوچھا۔

"کاؤنٹ اتنے غصہ میں تھا کہ اس نے زہیر بن عمر کے سر کے لئے ایک ہزار طلائی اشرفیاں دینے کا اعلان کیا۔ اس نے ہمیں ہمیشہ کے لئے کچلنے کے واسطے ایک زبردست فوج بھی تیار کرنی شروع کر دی ہے لیکن ابو زید پریشان نہیں ہے۔ اس کے پاس ایک منصوبہ ہے وہ کہتا ہے کہ جہاں اب وہ ہمیں لے جا رہا ہے وہاں خدا بھی زہیر کو نہیں ڈھونڈ سکے

گا"

"یہ پھر اس کا شیطان بولا" عمر نے کہا

"جاؤ اور غسل کرو ابن باسط" زبیدہ نے اس کے خاک آلود چہرے اور کپڑوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے زہیر کے کپڑے تمہیں آجائیں گے۔ پھر تم سے کھانے پر ملاقات ہو گی۔ تمہارا کمرہ تیار کر دیا گیا ہے اور تم جب تک جی چاہے ٹھہرو"

"شکریہ محترمہ۔ میں خوشی سے غسل کروں گا اور آپ کے ساتھ کھانا کھاؤں گا لیکن مجھے افسوس ہے کہ میں آرام کرنے کی عیاشی نہیں کر سکتا۔ مجھے گیجار پیغام پہنچانے ہیں اور غروب آفتاب کے وقت تک لنجاروں پہنچنا ہے جہاں میرے والد میرا انتظار کر رہے ہیں۔ آپ سب اتنے پریشان کیوں ہیں؟ زہیر زندہ ہے اور خیریت سے ہے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہم چھ مہینے میں غرناطہ پر دوبارہ قبضہ کر سکتے ہیں"

"کیا؟" عمر چلایا

زندیق نے اس گفتگو کو زیادہ دیر جاری نہیں رہنے دیا۔ "عقلمند کی زبان' میرے عزیز باسط" وہ دھیمے سے بولا "اس کے دل میں ہوتی ہے۔ بے وقوف کا دل اس کے منہ میں ہوتا ہے۔ خادم حمام پر آپ کے منتظر ہیں۔ نوجوان دوست"

یزید نے مہمان کو حمام تک پہنچایا اور حمام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے زہیر کے دوست سے کہا "غسل کا لطف اٹھایئے ابن باسط" اور باورچی خانے کی طرف دوڑا جہاں بونا' ثمیمہ اور دوسرے ملازم جمع تھے۔ اس نے زہیر کی لڑائی کی داستان اور ڈون الانسو کی موت کا واقعہ حرف بہ حرف دوہرایا۔

"خدا کا شکر ہے" ثمیمہ نے کہا "ہمارے چھوٹے مالک زندہ ہیں"

انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا لیکن یزید کی موجودگی میں کوئی بات نہیں کی۔ اس کے چہرے پر جوش و جذبے کو دیکھ کر باورچی خانے کے ملازموں پر بہت اثر ہوا۔ صرف بونا کچھ متاثر نہیں لگتا تھا۔ یزید کے جانے کے بعد اس نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

"نبی حزیل موت کی دعوت دے رہے ہیں اور انجام دور نہیں ہے۔ زمنس انہیں چین سے نہیں بیٹھنے دے گا"

"لیکن ہمارا گاؤں تو محفوظ رہے گا؟" ثمیمہ بولی۔ "ہم نے تو کسی کا کچھ نہیں بگاڑا"

بونے نے کندھے جھٹکائے۔

"مجھے معلوم نہیں" اس نے کہا "لیکن اگر میں تمہاری جگہ ہوتا ثمیمہ' تو میں اشبیلیہ جا کر بی بی کلثوم کی خدمت کرتا۔ یہ بہت اچھا ہو گا کہ تمہارا بچہ الحزیل میں پیدا نہیں ہوا"

نوجوان عورت کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔

"سارا گاؤں جانتا ہے کہ تمہارے اندر زہیر کا بیج ہے"

اس پر ایک بھونڈا سا قہقہ بلند ہوا جو ثمیمہ کے لئے بہت زیادہ تھا۔ وہ روتی ہوئی باورچی خانے سے بھاگی لیکن اس نے سوچا کہ بونا شاید ٹھیک ہی کہہ رہا ہو۔ وہ آج رات ہی بی بی زبیدہ سے اشبیلیہ میں بی بی کلثوم کی خدمت میں جانے کی درخواست کرے گی۔

یزید اپنی ہی دنیا میں کھویا ہوا تھا۔ وہ اناروں کے جھنڈ میں کسی عرب سپہ سالار کی طرح حرکتیں کر رہا تھا۔ ایک چھڑی کو اس نے تلوار بنایا ہوا تھا جس کی نوک چاقو سے تیز کی گئی تھی۔ اسی چاقو سے جو زہیر نے اسے اس کی دسویں سالگرہ پر دیا تھا اور جسے وہ مہمانوں کے سامنے بڑے فخر سے اپنی پیٹی میں لگاتا تھا۔ وہ بڑے جوش میں چھلانگیں لگا رہا تھا اور اپنی فرضی تلوار سے ان کے سر اڑا رہا تھا۔ جلد ہی وہ اس کھیل سے تھک گیا اور گھاس پر بیٹھ کر ایک ٹوٹے ہوئے انار کا رس چوسنے لگا اور منہ بھر بھر کے بیج تھوکنے لگا۔

"تمہیں معلوم ہے ہند؟ میرا خیال ہے زہیر مر گیا۔ ابو اور امی کا بھی یہی خیال ہے۔ ابن باسط جب لڑائی کے متعلق تفصیلات بتا رہا تھا تو مجھے ان کے چہروں سے ایسا ہی لگا تھا۔ کاش امی مجھے تمہارے ساتھ جانے دیتیں۔ میں کبھی کشتی پر سوار نہیں ہوا۔ میں نے کبھی سمندر پار نہیں کیا۔ کبھی فیض کو نہیں دیکھا۔ کہتے ہیں یہ بالکل غرناطہ جیسا ہے"

یزید یکایک رک گیا۔ اسے لگا کہ جیسے قدموں کی آہٹ آ رہی ہے اور جھاڑیاں سرسرا رہی ہیں۔ جب سے ثمیمہ اور دوسرے ملازموں نے اسے چھپے ہوئے پکڑا تھا تب سے وہ بہت چوکنا ہو گیا تھا۔ کاش اس نے ابن داؤد اور ہند کو بوس و کنار کرتے ہوئے نہ دیکھا ہوتا۔ اگر یہ بات وہ اپنی امی کو نہ بتاتا تو وہ ہند سے اس کا ذکر نہ کرتی اور یوں شاید شادی کچھ دیر کے لئے ملتوی ہو جاتی اور پھر ہند اب یہیں ہوتی۔ یہ کیسی عجیب و غریب شادی تھی۔ نہ کوئی دعوت ہوئی۔ نہ جشن ہوا۔ نہ آتش بازی چلی۔ صرف گاؤں کا قاضی اور گھر کے لوگ۔ وہ اس بات کو یاد کر کے ہنس پڑا کہ اس نے ابن داؤد کے سر پر قرآن کو قریب قریب پھینک ہی دیا تھا جس سے قاضی بھی مسکرا اٹھا تھا۔ بونا اس روز بڑے زوروں پر تھا۔ خصوصاً مٹھائی تو ایسے لگ رہی تھی جیسے جنت سے آئی ہو

تین روز بعد ہند جا چکی تھی۔ یہ بڑی اداسی کا وقت تھا لیکن ہند نے ابن داؤد سے

زیادہ اسی کے ساتھ دن گزارا تھا۔ وہ لمبی ٹہل پر نکل گئے تھے۔ ہند نے پہاڑوں میں اور دریا کے کنارے اسے اپنی پسندیدہ جگہیں دکھائیں اور وہ اس کے ساتھ ہمیشہ کی طرح سنجیدگی سے گفتگو کرتی رہی۔

"میری خواہش تھی کہ تم کچھ دیر کے لئے ہمارے ساتھ چلتے۔ میرا بڑا جی چاہتا تھا" جانے سے ایک دن پہلے اس نے کہا تھا۔ "میں تمہیں نہیں صرف اس گھر کو چھوڑ رہی ہوں۔ میں یہاں ابن داؤد کے ساتھ رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ ہم وہیں رہیں گے جہاں سکون محسوس ہو اور جہاں ہر چیز پر اس کا اختیار ہو۔ یہ ابو کا گھر ہے اور ان کے بعد یہ تمہارا' زہیر کا اور اس کے بچوں کا ہو گا۔ تم میری بات سمجھے ہو۔ یزید؟ مجھے اب تم سے پہلے سے بھی زیادہ محبت ہے اور میں ہمیشہ تمہیں یاد کرتی رہوں گی۔ شاید اگلے سال ہم یہاں آئے تو ایک دو ماہ کے لئے تمہیں اپنے ساتھ لے جائیں"

جواب میں یزید زیادہ کچھ نہ کہہ سکا۔ صرف گھر کی طرف لوٹتے ہوئے اس مضبوطی سے اس کا ہاتھ پکڑے رکھا' یزید اب اس بات کے متعلق زیادہ سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ اور اسے ایک تسلی سی ہوئی جب اس نے یہ آواز سنی

"اوہ۔ چھوٹے مالک خود تشریف لا رہے ہیں۔ مگر یہاں آپ اکیلے کیا کر رہے ہیں؟"

یہ مانوس لیکن مکروہ آواز اسکے والد کے ملازموں کے سربراہ عبیداللہ کی آواز تھی جو اس سے پہلے اپنے باپ کے طریقہ کے مطابق جاگیر کا سارا حساب کتاب رکھتا تھا۔ اسے اس بات کا زیادہ علم تھا کہ عمر کی زمین کتنی تھی' اس سے پہلے اپنے باپ اور گاؤں سے کتنا کرایہ وصول ہوتا تھا' یا خشک میوہ کی فروخت سے کتنی آمدنی ہوئی۔ یا تہہ خانوں میں کتنا گندم اور چاول جمع کیا ہوا تھاا ور یہ گودام کہاں کہاں تھے۔

یزید عبیداللہ کو اچھا نہیں سمجھتا تھا۔ اس کی کھلی بے ایمانی اور عقیدت کا مصنوعی اظہار اس بچے کو دھوکہ نہیں دے سکے تھے۔

"میں ٹہل رہا تھا۔" یزید نے اٹھتے ہوئے اور چہرہ پر بزرگی طاری کرتے ہوئے روکھی آواز میں کہا۔ "اور اب میں کھانا کھانے کے لئے گھر جا رہا ہوں اور تم۔ عبید اللہ۔ تم اس وقت یہاں کیسے آئے؟"

"میرا خیال ہے کہ میں اس بات کا جواب براہ راست آقا کو ہی دوں گا۔ کیا میں آپ کے ساتھ چلوں؟"

"جیسے تمہاری مرضی" یزید نے کمر پر سے دونوں ہاتھ آگے لاتے ہوئے گھر کی طرف

چلنا شروع کر دیا۔ اس نے اماں کو ہزار بار یہ کہتے سنا تھا کہ عبیداللہ بدمعاش ہے۔ چور ہے۔ وہ برسوں سے زمین خوراک اور پیسے یہاں سے چراتا آ رہا ہے جن سے اس کے بیٹے نے تین دوکانیں کھولی ہیں۔ دو قرطبہ میں اور ایک غرناطہ میں۔ اس نے طے کیا کہ وہ سارے راستے اس شخص سے بات نہیں کرے گا۔ لیکن خود اس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔

"مجھے ایک بات بتاؤ عبیداللہ!" یزید نے جاگیردار کے سے بڑے مخصوص اور تحکمانہ انداز میں کہا۔ "تمہارے بیٹے کی دوکانیں کیسی چل رہی ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ ہر طرح کا آسائشی سامان وہاں مل جاتا ہے"

وہ ملازم اس سوال پر حیران ہو گیا۔ بد دماغ کتے کا بچہ۔ اس نے خود سے کہا اس نے ضرور باورچی خانے میں ایسی اوٹ پٹانگ باتیں سنی ہوں گی۔ عمر بن عبد اللہ کبھی اس سے ایسی گھٹیا بات نہیں پوچھے گا۔ لیکن جب وہ بولا تو اس کا لہجہ مضحکہ خیز حد تک خوشامدانہ تھا۔

"آپ کی بڑی عنایت ہے کہ آپ میرے لئے سوچتے ہیں چھوٹے مالک! اس کا کاروبار ٹھیک چل رہا ہے۔ اللہ کا شکر ہے اور یقیناً آپ کے گھر کی عنایت ہے۔ آپ کے والد ہی نے اس کی تعلیم پر خرچہ اٹھایا تھاا ور اصرار کیا تھا کہ وہ شہر میں کام ڈھونڈے۔ میں یہ قرض کبھی نہیں چکا سکتا۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کتابیں پڑھنے کے بڑے شوقین ہیں چھوٹے مالک ! گاؤں میں سب یہی باتیں کرتے ہیں۔میں نے ان سے کہا ذرا انتظار کرو۔ یزید بن عمر جلد ہی خود بھی کتابیں لکھنے لگے گا"

اس کی طرف دیکھے بغیر' یزید اس کے ان تعریفی کلمات پر مسکرایا۔ اس خوشامد کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس کی وجہ صرف یہی نہیں تھی کہ یزید عبیداللہ کا اعتبار نہیں کرتا تھا۔ اس میں وہ بڑی حد تک اپنے ماں باپ کی طرح تھا۔ خوشامدی الفاظ اس پر سے اس طرح پھسل جاتے تھے جیسے فوارے کا پانی پتوں پر سے۔ یہ ایک موروثی احساس تفاخر تھا۔ ایک احساس کہ بنی حزیل فطرتاً" اتنے برگزیدہ تھے کہ انہیں کسی کی تعریف کی ضرورت نہیں تھی۔ یزید کے لئے اس کے باپ اور دادا کی طرح کھجوروں کے شیرہ میں بنائے ہوئے پکوڑے عبداللہ اور اس کے بیٹے کے پیش کئے ہوئے ریشمی شالوں کے تحائف سے کہیں زیادہ حقیقی تھے۔ وہ یہ دیکھتے تھے کہ تحفے دینے والے کی نیت کیا ہے۔

عبیداللہ بولے چلا جا رہا تھا لیکن لڑکا اس کو سن نہیں رہا تھا۔ اسے اس کی کسی بکواس پر یقین نہیں تھا۔ لیکن یہ کہ اس نے عبیداللہ کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ اس سے ایسے ہی گفتگو

کرے جیسے زہیر سے کرتا تھا' یزید کے لئے بڑی اہمیت کی بات تھی۔ جب وہ صدر دروازے سے گزر رہے تھے جسے گاؤں میں اس کے بنانے والے کے نام پر باب الفرید کہا جاتا تھا' عبیداللہ جھک کر آداب بجا لایا۔ یزید نے ہلکی سی سر کی جنبش سے اس کے سلام کا جواب دیا اور دونوں اپنی اپنی راہ ہو لئے۔ معمر شخص باورچی خانہ کی طرف دوڑا۔ لڑکے نے اپنی متانت برقرار رکھی اور جب تک گھر میں داخل نہیں ہوا وہ بہت معتبر بنا رہا۔

"آپ کہاں تھے؟" امیمہ نے کھانے کے کمرے کے باہر آہستہ سے پوچھا۔ "سب فارغ ہو چکے ہیں" یزید نے اس کی بات سنی ان سنی کر دی اور تیزی سے کمرے میں داخل ہو گیا۔ سب سے پہلی بات جو اس نے محسوس کی وہ ابن باسط کی عدم موجودگی تھی۔ وہ اداس ہو گیا۔ اس کا چہرہ لٹک گیا۔ گلے میں لٹکے ہوئے اس تعویز سے کھیلتے ہوئے جو ہند جاتے ہوئے اسے نشانی کے طور پر دے گئی تھی' وہ خیالوں میں گم ہو گیا۔ اس تعویذ میں اس کے بالوں کی ایک لٹ تھی۔

"وہ چلا گیا ہے۔ ابو؟"

پھلوں سے سجی ہوئی چاندی کی رکابی میں سے ایک گہرا سرخ انگور اٹھاتے ہوئے اس کے باپ نے سر کے اشارے سے بتایا کہ وہ چلا گیا ہے۔ زبیدہ نے یزید کو سیاہ اور سرخ مرچ کے ساتھ تلے ہوئے کھیرے کھانے کو دیئے۔ وہ جلدی سے انہیں کھا گیا اور پھر اس نے گاجر پیاز اور ٹماٹر کا سلاد کھایا جو دہی اور لیموں کے عرق سے بنا ہوا تھا۔

"کیا ابن باسط نے کچھ اور بھی کہا؟ کیا اس نے بتایا کہ زہیر کب تک ہمارے پاس آئے گا؟"

زبیدہ نے "نہیں" میں سر ہلایا۔

"اسے صحیح دن تو معلوم نہیں تھا لیکن اس کا خیال تھا کہ وہ جلد ہی آئے گا۔ اب تم کچھ پھل لے لو یزید۔ اس سے تمہارا چہرہ بحال ہو جائے گا"۔

جب چار ملازم میز صاف کرنے کے لئے آئے تو ان میں جو سب سے بڑا تھا اس نے زمین پر بیٹھ کر مالک کے کان میں کچھ کہا۔ عمر کے چہرے پر حقارت کے آثار نظر آنے لگے

"اس وقت اسے کیا کام ہے۔ اسے میرے کتب خانے میں لے جاؤ اور جب تک میں نہ آؤں اس کے پاس ٹھہرے رہو"

"عبیداللہ؟" زبیدہ نے پوچھا۔

عمر نے سر ہلا کر ہاں کی۔ اس کا چہرہ متفکر لگنے لگا۔ یزید نے دانت نکالتے ہوئے

عبیداللہ سے اپنی ملاقات کا ذکر کیا۔

"کیا یہ سچ ہے ابو کہ اب اس کے پاس بھی اتنی ہی جاگیر ہے جتنی ہمارے پاس ہے؟"

عمر اس سوال پر ہنس پڑا۔

"میرا خیال نہیں۔ لیکن یہ بات مجھ سے نہیں پوچھنی چاہئے۔ میں جا کر دیکھتا ہوں کہ بدمعاش کیا چاہتا ہے۔ یہ اس کا طریقہ نہیں کہ جب میں آرام کرنے جا رہا ہوں تو وہ مجھے پریشان کرے۔"

عمر کے جانے کے بعد زبیدہ اور یزید ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اندرونی احاطہ میں ٹہلتے رہے اور سردیوں کی دھوپ کا لطف لیتے رہے۔ جب وہ انار کے اس درخت کے نیچے سے گزرے جہاں اماں نے سردیوں کے بڑے دن گزارے تھے تو اس نے یزید کی آنکھوں میں جھانکا۔

"کیا وہ تمہیں بہت یاد آتی ہے۔ میرے بچے؟"

جواب میں اس نے اپنے ہاتھ کی گرفت سخت کر دی۔ وہ جھکی اور اس نے اس کے گالوں اور آنکھوں کے بوسے لئے۔

"ایک دن سب کو مرنا ہے یزید۔ ایک روز تم اسی سے پھر ملو گے۔"

"نہیں امی۔ یہ بات نہ کہئے۔ ہند کو جنت کی باتوں پر کوئی اعتقاد نہیں تھا۔ نہ زندیق کو ہے اور نہ ہی مجھے۔"

زبیدہ نے ہنسی ضبط کی۔ اسے بھی اعتقاد نہیں تھا لیکن عمر نے اس کو منع کیا ہوا تھا کہ ایسی کفر کی باتیں بچوں سے نہ کرے۔ اس نے سوچا کہ بہرحال زہیر اور کلثوم اس کے ساتھ اعتقاد میں شریک ہیں۔

اور میرے ساتھ ہند اور یزید ہیں۔

"امی۔" اس نے التجا کی "ہم سب جا کر فیض میں کیوں نہیں رہتے۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ ہم ابن داؤد اور ہند کے گھر میں رہیں بلکہ اپنا گھر لے کر رہیں"

"میں اس گھر کو' اس کی ندیوں اور دریاؤں کو' جو ہماری زمینوں کو سیراب کرتے ہیں' اس گاؤں کو اور اس میں بسنے والوں کو دنیا کے کسی شہر کے لئے نہیں چھوڑ سکتی۔ نہ قرطبہ کے لئے۔ نہ غرناطہ کے لئے اور نہ ہی فیض کے لئے۔ گو ہند مجھے بھی اتنی ہی یاد آتی ہے جتنی تمہیں۔ وہ میری دوست بھی تھی یزید۔ لیکن نہیں۔ میں کسی چیز کے لئے بھی یہ جگہ نہیں چھوڑ سکتی..... السلام علیکم۔ زندیق!"

"آپ۔ میری مالکہ اور آپ یزید بن عمر۔"

"تم کہاں؟" زبیدہ بولی

"برج میں- میں وہاں آرام کروں گا اور مطالعہ کروں گا"

زندیق نے بڑی شفقت سے جاتے ہوئے لڑکے کو دیکھا "اس بچے میں کتنی ذہانت ہے کہ بزرگ بھی شرمندہ ہو جاتے ہیں لیکن کوئی تبدیلی آ گئی ہے مالکن- کیا ایسا نہیں ہے؟ یہ کیا ہے؟ یزید بن عمر ایسے لگتا ہے جیسے مستقلاً" سوگ میں ہے- کیا یہ عامرہ کی وجہ سے ہے"

زبیدہ نے اس سے اتفاق کیا- "مجھے لگتا ہے کہ اس بچے کو سب کچھ معلوم ہے- جیسا تم نے کہا وہ ان باتوں کو بھی جانتا ہے جو اس سے بڑے اور اس سے زیادہ سمجھدار لوگ نہیں جانتے- جہاں تک اس کے دکھی ہونے کی بات ہے- میرا خیال ہے کہ مجھے اس کا سبب معلوم ہے- نہیں- یہ اماں کی موت نہیں ہے- گو اسے اس کا بہت دکھ تھا اور گو اس نے یہ دکھ ظاہر بھی نہیں ہونے دیا- اس کی وجہ ہند ہے- جب سے وہ گئی ہے اس کی آنکھوں کی شوخی جاتی رہی- مجھے اس کی اداس اور بجھی بجھی آنکھیں دیکھ کر بہت دکھ ہوتا ہے-"

"بچے ہماری نسبت جلد دکھوں کو بھول جاتے ہیں- میری مالکن"

"یہ دکھ نہیں" زبیدہ نے کہا- "اس سے یہ دکھ سنبھل نہیں رہا ہے-وہ سمجھتا ہے کہ جذبات کا اظہار مردانگی نہیں ہے- ہند اس کی ہمراز تھی- ڈر' خوشی' رازداری' ہر ایک بات میں- وہ اسے سب باتیں بتا دیتا تھا-"

عمر کے لوٹ آنے کی وجہ سے وہ بوڑھے کے مشورے سے مستفید نہ ہو سکی-

"السلام علیکم زندیق" بوڑھا مسکرایا تو عمر نے مزاحاً" اپنی بیوی سے کہا "تم سوچ بھی نہیں سکتیں کہ عبیداللہ مجھ سے ملنے کیوں آیا تھا-"

"پیسوں کے لئے نہیں؟"

"کیا میں یہ سوچنے میں حق بجانب ہوں" زندیق بولا "کیا ہمارے محترم' ملازم خاص کو ان کا ضمیر پریشان کر رہا ہے؟"

"تم نے ٹھیک کہا- بڑے میاں- بالکل ٹھیک- ہاں یہی اس کا مسئلہ ہے- اس نے مذہب بدلنے کا فیصلہ کیا ہے اور مجھ سے اجازت طلب کرنے آیا تھا- عبیداللہ' میں نے اسے خبردار کیا کہ "کیا تمہیں اندازہ ہے کہ تمہیں پادری کے سامنے اپنی تمام غلطیوں کا اعتراف کرنا پڑے گا اس کے بعد ہی وہ تمہیں اپنے مذہب میں داخل کریں گے؟ تمہاری تمام کو

تاہیاں عبیداللہ' اور اگر انہیں پتہ لگ گیا کہ تم جھوٹ بول رہے ہو تو وہ تمہیں جھوٹے عیسائیوں کی طرح زندہ جلا دیں گے' وہ اس بات سے کافی پریشان ہو گیا تھا- اس نے جلدی جلدی اپنے ذہن میں ان چھوٹے موٹے جرائم کا تخمینہ لگایا جو چرچ کے علم میں آ سکتے تھے اور اس نے طے کیا کہ وہ کسی خطرے میں نہیں ہے- آئندہ ہفتہ وہ غرناطہ جائے گا اور وہ اور اس کا احمق بیٹا عیسائیت قبول کرنے کی رسوم ادا کریں گے- ان کے خون کا خون' ان کے گوشت کا گوشت' لکڑی کے دو تختوں پر نصب خون آلود آدمی کے سامنے دعائیں کر کے اپنی نجات کی کوشش کریں گے- زندیق مجھے ایک بات بتاؤ- ان کے عقیدے میں انسانی قربانی کی اتنی اہمیت کیوں ہے؟"

عیسائی مذہب پر ایک مفصل بحث شروع ہونے ہی والی تھی اور ابھی بوڑھا کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ ایک زبردست چیخ ہوا کو چیرتی ہوئی گزر گئی- یزید دوڑتا ہوا احاطہ میں داخل ہوا- اس کا سانس پھولا ہوا تھا اور چہرہ دوڑنے سے سرخ ہو گیا تھا-

"سپاہی' سینکڑوں سپاہی' انہوں نے ہمارے گھر اور گاؤں کے گرد گھیرا ڈال دیا ہے- آئیں دیکھیں"

عمر اور زبیدہ لڑکے کے ساتھ برج پر گئے- زندیق بڑھاپے کی وجہ سے سیڑھیاں نہیں چڑھ سکتا تھا اور ایک ٹھنڈا سانس لے کر اناروں کے سائے میں ایک بنچ پر بیٹھ گیا-

"ہمارا مستقبل ہمارے ماضی میں تھا" اس نے منہ ہی منہ میں کہا-

یزید کو کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی تھی- وہ گھیرے میں آ گئے تھے- ایک خوفزدہ ہرن کی طرح پھنس گئے تھے- عمر نے غور سے دیکھا تو اسے عیسائی جھنڈے اور انہیں اٹھائے ہوئے سپاہی نظر آئے- ایک شخص گھوڑے پر سوار بڑے جوشیلے انداز میں سپاہیوں کے ایک گروپ سے دوسرے گروپ میں تیز تیز آ جا رہا تھا- ظاہر ہے کہ وہ انہیں ہدایات دے رہا تھا- وہ بہت کم عمر لگتا تھا اور یقیناً کپتان تھا-

"مجھے فوراً گاؤں میں جانا چاہئے" عمر نے کہا- "ہم سوار ہو کر ان لوگوں کے پاس جاتے ہیں اور ان سے پوچھتے ہیں کہ وہ کیا چاہتے ہیں-"

"میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا-" یزید نے کہا-

"آپ گھر پر ٹھہریں- بیٹے- آپ کی ماں کی حفاظت کرنے والا اور کوئی نہیں ہے-"

عمر برج سے نیچے اترا تو اس نے دیکھا کہ گھر کے تمام ملازم تلواریں اور نیزے سنبھالے احاطہ میں جمع ہو گئے تھے- وہ صرف ساٹھ لوگ تھے اور ان میں پندرہ برس سے

لے کر پینسٹھ برس تک کے ہر عمر کے جوان اور بوڑھے شامل تھے۔ لیکن انہیں دیکھ کر عمر کا دل بھر آیا۔ وہ اس کے ملازم تھے اور وہ ان کا آقا لیکن مشکل حالات میں ان کی وفاداری ان باتوں سے بلند تھی۔

اس نے گھوڑے پر زین چڑھائی اور چار نوجوانوں کے ساتھ وہ گاؤں کی طرف روانہ ہو گیا۔ جیسے ہی وہ بڑے دروازے سے باہر نکلے ایک عقاب شکار کی تلاش میں ان کے اوپر سے اڑتا ہوا گزرا۔ ملازموں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ شگون اچھا نہیں تھا۔

کچھ فاصلے سے انہیں کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ انہیں بھی خطرے کا احساس ہو گیا تھا۔ کوئی شخص بھی کسی کام میں مصروف نہیں تھا۔ کھیتوں میں کام کرنے والے مرد اور عورتیں جو روزانہ صبح سویرے کام پر چلے جاتے اور دن ڈھلے لوٹتے سپاہیوں کو دیکھ کر بھاگ گئے تھے۔ گاؤں کی چھوٹی چھوٹی تنگ گلیاں لوگوں سے بھری ہوئی تھیں۔ لیکن دکانیں بند تھیں۔ اس طرح کا منظر عمر نے آخری مرتبہ اس وقت دیکھا تھا جب اس کا باپ گھوڑے پر سے گر کر مر گیا تھا۔ اس دن بھی سب کاروبار بند ہو گیا تھا۔ وہ میت کے ساتھ ساتھ خاموشی سے چل کر ان کے گھر تک آئے تھے۔

سلام دعا کا سلسلہ جاری تھا لیکن چہرے پریشان اور اترے ہوئے تھے۔ غیر یقینی کا ایک خوف طاری تھا۔ بوڑھی یو آن ان کی طرف دوڑا۔

"یہ بڑا بدقسمت دن ہے۔ آقا" اس نے غصہ سے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں کہا۔ "بدنصیب دن' شیطان نے ہمیں ڈرانے اور تباہ کرنے کے لئے اپنے چیلے بھیجے ہیں۔"

عمر گھوڑے سے اترا اور اس نے یو آن کو گلے لگایا۔

"تم اس طرح کیوں بول رہے ہو۔ میرے دوست؟"

"میں ابھی ان کے کیمپ سے آیا ہوں۔ انہیں معلوم تھا کہ میں عیسائی ہوں اس لئے انہوں نے مجھے بلا بھیجا تھا۔ مجھ سے انہوں نے ہر طرح کے سوالات پوچھے۔ کیا میں زہیر الفل کو جانتا ہوں؟ کیا مجھے معلوم ہے کہ ایسا راز میں اس کے ساتھ اور کتنے لوگ لڑائی میں شریک تھے؟ کیا مجھے معلوم ہے کہ انہوں نے محترم ڈون الانسو کو اس وقت مارا جب وہ واپس لوٹ رہا تھا اور اس کی پیٹھ ان کی طرف تھی۔ آخری سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ جو روئداد میں نے سنی ہے وہ اس سے مختلف ہے۔ اس پر ان کا نوجوان کپتان جس کی آنکھوں سے حقارت برس رہی تھی' میری طرف بڑھا اور اس نے میرے منہ پر تھپڑ مارا۔ 'تم عیسائی ہو؟' میں نے جواب دیا کہ میرے خاندان نے کبھی مذہب نہیں بدلا اور ہم'

جب سے الحزبل آباد ہوا ہے یہیں رہ رہے ہیں۔ ہم سے کبھی کسی نے اشارۃ" بھی نہیں کہا کہ ہم محمدؐ کا دین قبول کر لیں۔ ہم یہاں امن وامان سے رہ رہے ہیں۔ تب اس نے مجھ سے کہا۔ 'کیا تم ان ہی کے ساتھ رہنا چاہو گے یا ہمارے ساتھ آؤ گے؟ ہم نے ایک خیمہ میں ایک چھوٹی سی عبادت گاہ بھی تیار کر لی ہے اور وہاں ایک پادری بھی ہے جو تمہارا اعتراف سنے گا۔' میں نے کہا کہ میں بخوشی پادری کے سامنے اعتراف کروں گا لیکن میری خواہش ہے کہ میں اسی گھر میں رہوں جہاں میں پیدا ہوا تھا اور جہاں مجھ سے پہلے میرے باپ اور دادا پیدا ہوئے تھے۔ اس پر وہ ہنسا۔ یہ عجیب ہنسی تھی۔ فوراً ہی اس کے برابر کھڑے ہوئے نوجوان بھی اسی طرح ہنسے۔ 'اعتراف رہنے دو اور اپنے بے دین دوستوں میں لوٹ جاؤ'"

"اگر وہ زہیر کے متعلق کچھ جاننا چاہتے ہیں تو انہیں مجھ سے پوچھنا چاہئے۔" عمر نے کہا۔ "میں خود جا کر ان سے ملتا ہوں۔"

"نہیں" ایک تیز آواز آئی۔ "آپ کسی حالت میں بھی ایسا نہ کریں۔ میں آپ ہی سے بات کرنے جا رہا تھا۔"

یہ ابن حد تھا۔ موچی ابن حد' میگوئل کا فطری بھائی' عمر کا چچا' لیکن آج پہلی مرتبہ اس نے ایک فرد خاندان کی حیثیت سے بات کی تھی۔ عمر نے آنکھیں اٹھا کر اس کی طرف یوں دیکھا جیسے وہ اس جسارت کا سبب جاننا چاہتا ہو۔

"السلام علیکم۔ عمر بن عبداللہ۔ لیکن لوہار ابن حریسہ ابھی واپس آیا ہے۔ وہ آج صبح اسے نالیں باندھنے کے لئے گھسیٹ کر لے گئے تھے۔ اس نے کوئی خاص بات نہیں سنی۔ لیکن نوجوان کپتان کی آنکھوں نے اسے ہیبت زدہ کر دیا۔ وہ کہتا ہے کہ خود عیسائی سپاہی بھی اس سے ایسے ڈرتے ہیں جیسے وہ کوئی شیطان ہو۔

"اور"۔ یو آن نے بات جاری رکھی۔ "وہ ذلیل عبیداللہ اپنے ساتھ پندرہ آدمی ان کے کیمپ میں لے گیا۔ ظاہر ہے کہ وہ اپنی جان بچانے کے لئے کیسی کیسی کہانیاں بنائے گا۔ آپ گھر لوٹ جائیں آقا' اور جب تک یہ شورش ختم نہ ہو دروازے بند رکھیں۔"

"میں گاؤں میں ہی ٹھہروں گا" عمر نے حتمی انداز سے کہا جس کے بعد کسی اختلاف کی گنجائش نہیں تھی۔ "ہم عبیداللہ کی واپسی کا انتظار کریں گے تاکہ اس سے پوچھیں کہ ان کے مطالبات کیا ہیں۔ پھر' اگر ضروری ہوا تو میں خود جاؤں گا اور کپتان سے بات کروں گا۔"

باب 12

بے داڑھی مونچھ سرخ سر والا کپتان گھوڑے سے نیچے نہیں اترا۔ وہ ابھی تک گھوڑے پر سوار کیوں ہے۔ یہ سوال عبیداللہ کو پریشان کر رہا تھا۔ پچاس برس سے زیادہ عرصہ تک جاگیر کا کام سنبھالتے ہوئے اور لوگوں سے کام لیتے ہوئے اسے اتنا علم اور اتنا تجربہ ہو گیا تھا جتنا کتابوں سے نہیں ملتا' اسے انسانی نفسیات پر عبور حاصل ہو گیا تھا۔ اس نے دیکھا کہ کپتان کے چہرے پر اس کے خالق کی لعنت جھلکتی ہے اس کا قد' جو ایک سپاہی کے لئے کوئی کم اہمیت کی بات نہیں ہوتی' قطعی طور پر اس کے مزاج کے مطابق نہیں تھا۔ وہ گٹھا ہوا اور پستہ قد تھا۔ اس کی عمر سولہ سال سے زیادہ نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ وہ حقائق تھے جو عبیداللہ کو یقین تھا کہ اس کی عسکری مہارت کے باوجود اس کے حق میں نہیں جاتے تھے۔

ایک مرتبہ یہ جائزہ لینے کے بعد عبیداللہ عیسائیوں کے کمانڈر کے سامنے دو زانو ہو گیا۔ خود کو اتنا ذلیل کرتے دیکھ کر' گاؤں والوں کو' جو اس کے ساتھ تھے اس سے بڑی کراہت ہوئی "سؤر کا بچہ" ایک نے دبی سی آواز میں گالی دی۔ عبیداللہ کو اس ردعمل سے کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ اس نے کپتان کو بڑی پھونک دی۔ اس دن اور کسی چیز کی اہمیت نہیں تھی۔ برسوں بنو حزیل کی خدمت کرنے کے بعد اس ملازم پیشہ شخص میں وہ صفات پیدا ہو گئی تھیں جو آج اس کے کام آئیں۔

"تم کیا چاہتے ہو؟" کپتان نے ناک میں سے آواز نکالتے ہوئے پوچھا۔

"میرے آقا! ہم آپ کو یہ بتانے آئے ہیں کہ سارا گاؤں اس وقت عیسائی ہونے کے لئے تیار ہے آپ سے یہ درخواست ہے کہ آپ پادری کو ہمارے پاس بھیج دیں اور خود

تشریف لا کر ہماری عزت افزائی فرمائیں۔"

اس درخواست کے جواب میں پہلے تو خاموشی رہی۔ کپتان لگتا تھا کہ بالکل ساکت ہو گیا ہے۔ اس نے اپنی بھاری بھاری گہری نیلی آنکھوں سے اپنے سامنے جھکے ہوئے شخص کو دیکھا۔ کپتان ابھی سولہ برس کا ہوا ہی تھا لیکن وہ ابھی سے میدان جنگ کا ہیرو بن گیا۔ الیجاراز کی تین لڑائیوں میں اس کی بہادری کو سراہا گیا تھا۔ اسکی نڈر' وحشیانہ بہادری نے اس کی شہرت اعلیٰ حلقوں تک پہنچا دی تھی۔

"کیوں؟" وہ جھپٹ کر عبیداللہ سے بولا۔

"میری سمجھ میں نہیں آیا جناب عالی"

"تم نے مقدس کلیسائے روم میں شمولیت کا فیصلہ کیوں کیا؟"

"یہ نجات کا واحد راستہ ہے" عبیداللہ نے جو حق و باطل میں کوئی تمیز نہیں کر سکتا تھا جواب دیا "تمہارا مطلب ہے کہ اپنی جان بچانے کا یہی ایک راستہ ہے؟"

"نہیں۔ نہیں جناب عالی۔" بوڑھا ملازم بسور نے لگا "ہم اہل اندلس کسی بھی بات کا فیصلہ کرنے میں بہت وقت لگاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم سینکڑوں برس ایسے حاکموں کے ماتحت رہے ہیں جو سارے فیصلے خود ہی کرتے تھے۔ ہر اہم معاملے میں ہمارے لئے فیصلے وہی کرتے تھے۔ اب ہم آہستہ آہستہ آزادی سے سوچنے لگے لیکن پرانی عادتوں کو چھوڑنا آسان نہیں ہے۔ ہم خود فیصلے کر رہے ہیں لیکن ہمیں وقت لگتا ہے اور ہم ہر بات میں بال کی کھال نکالتے ہیں..."

"گاؤں میں تم کتنے لوگ ہو؟"

"آخری مردم شماری کے مطابق دو ہزار سے کچھ اوپر"

"ٹھیک ہے۔ میں تمہاری اس تجویز کا مناسب وقت پر جواب دوں گا۔ تم گاؤں میں جاؤ اور ہمارے فیصلے کا انتظار کرو"

جیسے ہی عبیداللہ اٹھنے لگا' کپتان نے ایک اور سوال اس پر دے مارا اور وہ ملازم پھر دو زانو ہو گیا۔ "کیا یہ سچ ہے کہ ایک پرانا علم جس پر سنہری زمین پر ایک نیلی چابی بنی ہوئی ہے اور تمہاری زبان میں اس پر کچھ لکھا ہوا ہے' ابن فرید کے محل میں لٹکا ہوا ہے؟"

"وہ ہے۔ جناب عالی! ابن فرید کے ایک مورث اعلیٰ کو اشبیلیہ کے بادشاہ نے یہ تحفہ میں دیا تھا۔ عربی کی تحریر کا مطلب یہ ہے کہ سوائے اللہ کے کوئی فاتح نہیں ہے"

"یہ چابی مغرب کی فتوحات کے آغاز کی علامت ہے۔ یہ ٹھیک ہے؟"

"میں یقین سے نہیں کہہ سکتا جناب عالی!"

"تم یقین سے نہیں کہہ سکتے لیکن مجھے یقین ہے" کپتان نے بڑی بے نیازی اور رعونت سے جواب دیا جس سے وہ یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ وہ مزید گفتگو نہیں چاہتا۔ "آرچ بشپ کی خواہش ہے کہ اسے اپنی انکھوں سے دیکھے۔ تم ابن فرید کے گھروالوں کو اطلاع کر دو کہ میں یہ علم لینے آؤں گا۔ اب تم جا سکتے ہو"

عبیداللہ اور اس کے ساتھیوں کے جانے کے بعد کپتان اسی طرح گھوڑے پر سوار دو افسروں کے قریب گیا جو دور سے سب باتیں سن رہے تھے اور انہیں ہدایت کی کہ سپاہیوں کو اکٹھا کریں۔ وہ گاؤں میں جانے سے پہلے ان سے خطاب کرنا چاہتا تھا۔ جب سب اکٹھے ہو گئے تو کپتان نے تقریر شروع کی۔ اس کا لہجہ دوستانہ لیکن تحکمانہ تھا۔

"ہمارا مقصد سیدھا سا ہے۔ تم اس گاؤں کو خاک میں ملا دو گے اور اس میں جو بھی کچھ ہے اسے مٹا دو گے۔ یہی میری ہدایات ہیں۔ گاؤں میں چھ یا غالباً سات سو جوان ہوں گے۔ اس کا کوئی امکان نہیں کہ وہ تھوڑا سا بھی دفاع کر سکیں۔ یہ کوئی خوشگوار کام نہیں ہے لیکن سپاہیوں کو رحم دلی اور شرافت کی تربیت نہیں دی جاتی۔ مقدس سربراہ کلیسا کے احکامات بالکل واضح ہیں۔ کل صبح کو جغرافیہ دانوں کو یہ حکم دینے والے ہیں کہ جو نقشے وہ تیار کر رہے ہیں ان میں سے الحزبل کو بالکل خارج کر دیا جائے۔ آپ یہ بات سمجھ گئے؟"

"نہیں!" مجمع کے درمیان سے ایک آواز اٹھی۔

"جوان۔ آگے آؤ"

ایک طویل قامت سفید ریش سپاہی جو پچاس کے پیٹے میں تھا۔ جس کا باپ ابن فرید کے جھنڈے کے نیچے لڑا تھا' آگے بڑھا اور کپتان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"تم کیا چاہتے ہو؟"

"میں ایک پادری کا پوتا اور ایک سپاہی کا بیٹا ہوں۔ عیسائیوں میں کب سے یہ رواج پڑا ہے کہ عورتوں اور بچوں کو قتل کیا جائے؟" میں آپ کو یہاں پر اور ابھی یہ بتانا چاہتا ہوں کہ یہ تلوار کسی بچے یا عورت پر نہیں اٹھے گی۔ آپ جو چاہیں میرے ساتھ سلوک کریں"

"اس سے ظاہر ہوتا ہے سپاہی' کہ تم الیجاراز میں ہمارے ساتھ نہیں تھے"

"میں الحمرا میں تھا کپتان اور میں نے بہت کچھ دیکھا۔ میں دوبارہ اس کرب سے گزرنا نہیں چاہتا"

"وہاں تم نے دیکھا ہو گا کہ ان کی عورتیں ہمارے لوگوں پر جلتا ہوا تیل پھینک رہی تھیں۔ تم ہمارے احکامات پر عمل کرو ورنہ اس کے نتائج بھگتو گے۔"

سپاہی اپنی بات پر اڑ گیا۔

"آپ نے خود کہا ہے کپتان کہ آپ کو کسی دفاع کی امید نہیں ہے۔ تو پھر ہمیں کیوں حکم دے رہے ہیں کہ ہم بے گناہ لوگوں کو قتل کریں؟ آخر کیوں؟"

"بڈھے بے وقوف!" کپتان نے جواب دیا۔ اس کی آنکھیں غصے سے دہک رہی تھیں۔ "تم زیادہ دیر زندہ نہیں رہ سکو گے۔ تم ہماری جانوں کو کیوں ارزاں کرتے ہو؟"

"میں آپ کی بات سمجھا نہیں کپتان!"

"اگر تم ان کے مردوں کو مارو گے تو ان کی عورتیں اور بچے عیسائیوں سے اندھی نفرت کرنے لگیں گے۔ اپنی زندگیاں بچانے کے لئے وہ مذہب تبدیل کر لیں گے لیکن یہ ایک زہر ہو گا۔ میری بات سن رہے ہو؟ ایک زہر' جو مستقل ہماری جانوں میں جذب ہو جائے گا۔ ایک زہر' جس کا علاج مشکل سے مشکل تر ہوتا جائے گا۔ اب تمہاری سمجھ میں آیا؟"

بوڑھے سپاہی نے بے یقینی سے سر ہلایا لیکن صاف ظاہر تھا کہ وہ یہ حکم نہیں مانے گا۔ کپتان نے اپنے فطری جذبات کو دبایا۔ وہ عین لڑائی سے پہلے اپنے سپاہیوں کے حوصلے پست نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ باغی کو سزا نہ دی جائے۔

"تمہیں ڈیوٹی سے ہٹا لیا گیا ہے۔ تم غرناطہ لوٹ جاؤ اور ہماری واپسی کا انتظار کرو۔"

بوڑھے کو اپنی قسمت پر یقین نہیں آیا۔ وہ آگے بڑھا اور اس نے اپنے گھوڑے کو کھولا "میں واپس جاؤں گا۔" اس نے کیمپ سے واپس ہوتے ہوئے خود سے کہا "لیکن غرناطہ نہیں۔ میں وہاں جاؤں گا جہاں تم اور تمہارے مردود پادری مجھے کبھی نہیں پا سکیں گے۔"

فصیل کے درمیان جو دروازے تھے ان ہی سے بنو حزیل کے آبائی گھر میں آمد و رفت ہو سکتی تھی۔ ان کو اچھی طرح مقفل کر دیا گیا تھا۔ ٹھوس لکڑی کے بنے ہوئے چار انچ موٹے دروازے جن پر لوہے کی پٹیاں چڑھائی گئی تھیں ان کا وجود صرف دکھاوے کی حد تک تھا وہ کسی حملے کے خلاف ٹھہر نہیں سکتے تھے۔ یہ کبھی بند بھی نہیں کئے گئے تھے۔ اس لئے کہ نہ تو گاؤں کی نہ ہی اس گھر کی کوئی فوجی اہمیت تھی۔ ابن فرید اور اس کے آباؤاجداد نے یہیں سے اور اس کے ارد گرد دوسرے دیہاتوں سے اپنے سپاہی اور سردار

بھرتی کئے تھے۔ وہ دروازوں کے باہر اکٹھے ہوتے اور سلطنت کے دوسرے علاقوں میں لڑائیاں لڑنے کے لئے روانہ ہو جاتے۔

جب عبیداللہ نے نوجوان کپتان کا پیغام پہنچایا تو عمر اداسی سے ہنسا اور سب کچھ سمجھ گیا۔ یہ جوش وجذبہ دکھانے کا وقت نہیں تھا جس کی وجہ سے اس کے خاندان کے کئی افراد موت کے گھاٹ اتر چکے تھے۔ اس نے حکم دیا تھا کہ نیلے سمندر پر روپہلی چابی والا علم اسلحہ خانے کی دیوار سے اتار کر بڑے دروازے پر لٹکا دیا جائے۔

"اگر وہ یہی چاہتے ہیں" اس نے ملازم سے کہا۔ "تو ہم ان کے لئے یہ کام آسان بنا دیں گے"

کئی سو دیہاتیوں نے گھر کی دیوار کے پیچھے پناہ لے رکھی تھی۔ وہ باغوں میں کھانا کھا رہے تھے جبکہ بیرونی احاطہ بچوں سے بھرا ہوا تھا جو آنے والے خطرات سے بے نیاز اپنے کھیلوں میں مصروف تھے۔ یزید نے پہلے کبھی گھر میں اتنے لوگ نہیں دیکھے تھے اور نہ اتنا شور سنا تھا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ بھی کھیل میں شریک ہو جائے لیکن اس نے فیصلہ کیا کہ وہ برج میں واپس لوٹ جائے۔

باقی لوگوں کی طرح عبیداللہ کو بھی گھر میں پناہ لینے کی دعوت دی گئی لیکن اس نے گاؤں لوٹ جانے کو بہتر سمجھا۔ اس کے اندر یہ احساس تھا کہ وہ اپنے گھر میں ہی زیادہ محفوظ رہے گا۔ اس گھرانے سے آزاد ہو کر جس کی اس نے اتنے عرصے خدمت کی تھی۔ اس کی سوچ بدقسمتی سے صحیح نہیں تھی۔ جب وہ گاؤں کی طرف واپس جا رہا تھا تو گھوڑے پر سوار ایک سپاہی نے اپنے دوستوں کو اشارہ کیا۔ تلوار میان سے نکالی اور اسے بلند کر کے عبیداللہ کی طرف' جو خطرے سے بے نیاز تھا' بڑھا۔ چند لمحوں میں اس کا سر بڑی صفائی کے ساتھ اس کے جسم سے علیحدہ ہو کر خاک پر لوٹنے لگا۔

یزید باپ کی قباء سے چپکا ہوا تھا۔ عمر نے ابھی حکم دیا تھا کہ اسلحہ خانہ کھول دیا جائے اور سب مردوں اور عورتوں کو ہتھیار دے دیئے جائیں۔ زبیدہ کا اصرار تھا کہ وہ بھی لڑیں گی۔ الحماء کی یاد اس کے ذہن میں آگ کی طرح بھڑک رہی تھی۔

"ہم بے بسی سے ان کا انتظار کیوں کریں کہ پہلے وہ ہمارے جسموں کو مجروح کر دیں اور پھر ہمارے سینوں میں تلواریں بھونک دیں؟"

"ابو! ابو!" یزید بڑے اصرار سے بول رہا تھا۔

عمر نے اسے اٹھایا اور بوسہ دیا۔ لڑکے کو شفقت کا یہ بے ساختہ اظہار اچھا لگا لیکن

اسے غصہ بھی آیا۔ اس لئے کہ وہ مرد بننے کی زبردست کوشش کر رہا تھا۔

"کیا بات ہے' میرے بچے؟"

"برج پر چلئے ابھی"

زبیدہ نے المیے کو محسوس کیا۔ اس نے یزید کو اپنے باپ کے ساتھ برج پر نہیں جانے دیا۔

"مجھے تمہاری ضرورت ہے' یزید۔ میں یہ تلوار کیسے چلاؤں گی؟"

یہ مداخلت کارگر ثابت ہوئی۔ عمر اکیلا سیڑھیوں پر چڑھا۔ وہ جتنا چڑھتا گیا۔ خاموشی بڑھتی گئی اور پھر اس نے قتل عام دیکھا۔ گھروں کو آگ لگا دی گئی تھی۔ جہاں مسجد ہوتی تھی وہاں اس نے لاشیں بکھری ہوئی دیکھیں۔ سپاہیوں نے ابھی اپنا کام پورا نہیں کیا تھا۔ وہ پہاڑیوں میں جان بچا کر بھاگنے والوں کا پیچھا کر رہے تھے۔ اس نے کان لگا کر سنا تو عمر کو لگاکہ عورتوں کے بین کرنے کی آوازیں آ رہی ہیں۔ درمیان میں کتوں کے بھونکنے کی آوازیں بھی تھیں لیکن جلد ہی بالکل خاموشی ہو گئی۔ شعلے بھڑک رہے تھے۔ ہر طرف موت تھی۔ اس نے میز پر رکھے ہوئے نقشہ پر محدب شیشے سے گاؤں کا نقشہ دیکھا۔ اس کی قوت برداشت جواب دے چکی تھی۔ شیشہ اس کے ہاتھ سے چھٹ کر زمین پر گرا اور ریزہ ریزہ ہو گیا۔ اب عمر ابن عبداللہ نے اپنی آنکھیں پونچھیں۔

"ٹوٹے ہوئے شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں" اس نے پہرہ پر موجود اپنے دو ملازموں سے کہا۔ وہ بت بنے کھڑے تھے اور اپنے آقا کے چہرہ پر پھیلتی ہوئی مایوسی کو دیکھ رہے تھے۔ وہ تسلی دینا چاہتے تھے لیکن الفاظ ان کے ہونٹوں پر آ کر رک گئے۔

عمر آہستہ آہستہ سیڑھیوں سے اترا۔ برج سے اس نے سارا جائزہ لے لیا تھا۔ اب شک کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اس نے یزید کو اپنی بہن کے ساتھ جانے کی اجازت نہ دینے پر اپنے آپ کو ملامت کی' اندر کے وسیع احاطہ میں پہنچ کر اس نے ایک وحشت ناک خاموشی محسوس کی۔ بچوں نے کھیلنا چھوڑ دیا تھا۔ کوئی کھا پی نہیں رہا تھا۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ صرف لوہار کی تلواروں پر مسان چڑھانے کی آواز آ رہی تھی۔ ان سب نے جلتے ہوئے گاؤں کو دیکھا تھا اور اب زمین پر بیٹھے ہوئے ڈوبتے سورج کی روشنی میں شعلوں کو مدھم ہوتے دیکھ رہے تھے۔ ان کے گھر' ان کا ماضی' ان کا مستقبل' ان کے دوست' سب کچھ تباہ ہو گیا تھا۔ اس خاموشی کو برج سے آتی ہوئی ایک کربناک آواز نے توڑا۔

"عیسائی دروازے پر آ گئے ہیں"

ہر شخص مستعدی سے کھڑا ہو گیا۔ بوڑھی عورتوں اور بچوں کو باہر کے مکانوں میں بھیج دیا گیا۔ عمر بونے کو ایک طرف لے گیا۔

"میں چاہتا ہوں کہ تم یزید کو لے کر غلے کے گودام میں چلے جاؤ۔ جب تک تمہیں یقین نہ ہو جائے کہ سب جا چکے ہیں تم کسی صورت بھی باہر نہ نکلنا۔ اللہ تمہاری حفاظت کرے گا۔"

یزید نے والدین سے جدا ہونے سے انکار کر دیا۔ اس نے باپ سے حجت کی' ماں سے التجا کی۔

"دیکھئے" اس نے لوہار کی تیار کی ہوئی تلوار کو لہرا کر کہا۔ "میں اسے ایسے ہی چلا سکتا ہوں جیسے آپ"

زبیدہ کی منتوں نے آخر اسے بونے کے ساتھ جانے پر مجبور کر دیا۔ اس نے شطرنج کے مہرے اپنے ساتھ لے جانے پر اصرار کیا۔ انہیں لے کر وہ بونے کے ساتھ باغ کی طرف چلا۔ اس سے ذرا دور' دیوار کے بالکل نیچے ہر طرح کے پودوں اور درختوں کا ایک جھنڈ تھا۔ قریب ہی چنبیلی کے چھوٹے چھوٹے پودوں کے درمیان بڑی احتیاط سے چھپایا ہوا لکڑی کا ایک بنچ تھا۔ جب بونے نے اسے اٹھایا تو اسکے نیچے رکھا ہوا پتھر بھی اس کے ساتھ اٹھ آیا۔

"نیچے اترو۔ چھوٹے آقا"

یزید نے ایک لمحہ توقف کیا اور مڑ کر گھر کی طرف دیکھا۔ لیکن بونے نے اسے آگے بڑھایا اور وہ چھوٹی چھوٹی سیڑھیوں سے نیچے اترنے لگے۔ احتیاط سے پتھر کو دوبارہ اس کی جگہ رکھ کر بونا بھی اس کے پیچھے اترنے لگا۔ ان تاریک تہہ خانوں میں الحزیل اور سارے گاؤں کے لئے ایک برس کا چاول اور گندم کا ذخیرہ محفوظ تھا۔ ہنگامی حالت سے نبٹنے کے لئے الحزیل کے لئے خوراک محفوظ تھی تاکہ خراب فصل یا ناگہانی آفات کی صورت میں کام آ سکیں۔ بونے نے شمع جلائی۔ یزید کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

زمین پر عیسائی سپاہیوں کا سامنا کرنے کے لئے تیاری مکمل ہو گئی تھی۔ وہ اب دروازوں کو توڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ جب آخر کار ایک دروازہ ٹوٹا تو پہلا دستہ احاطہ میں داخل ہوا۔ لیکن یہ صرف پیش رو تھے اور ان کا کپتان ان کے ساتھ نہیں تھا۔ گاؤں کو اس قدر آسانی سے روندنے اور اتنی لاشوں کے اوپر سے گھوڑے دوڑاتے ہوئے ان میں ایک احساس تحفظ بیدار ہو گیا تھا۔ لیکن یہ ان کی غلط فہمی تھی۔

دفعتاً" ان کی نظر عرب سورماؤں پر پڑی جو گھوڑوں پر سوار تھے اور دائیں اور بائیں دونوں طرف سے حملہ کرنے کے لئے تیار تھے۔ حملہ آوروں نے تیزی سے بیرونی احاطہ کی طرف بھاگنے کی کوشش کی لیکن وہ بچ نہ سکے۔ عمر اور اس کے سواروں نے ہیبت ناک نعروں کے ساتھ ان پر حملہ کیا۔ عیسائی' جنہیں کسی مزاحمت کی امید نہیں تھی' جلدی سنبھل نہیں سکے۔ ہر ایک گھوڑے سے گرا اور مارا گیا۔ اس غیر متوقع کامیابی پر سب نے اللہ اکبر کے پرجوش نعرے لگائے۔

ان سپاہیوں کی لاشیں ان کے گھوڑوں پر لاد دی گئیں اور گھوڑوں کو بیرونی احاطہ کی طرف دھکیل دیا گیا۔ کافی انتظار کے بعد حملہ ہوا۔ اس کا سبب جلد ہی واضح ہو گیا۔ غرناطہ کی فوج دیوار کے شگاف کو بڑا کر رہی تھی تاکہ تین تین کی قطار میں حملہ کیا جائے۔

عمر جانتا تھا کہ دوسری مرتبہ مقابلہ اتنا آسان نہیں ہو گا "اب ہمارا زوال آ پہنچا ہے" اس نے خود سے کہا۔" اب صرف موت ہی نظر آ رہی ہے"

ابھی اس کے ذہن میں یہ خیال آیا ہی تھا کہ ایک آواز جو ابھی پوری طرح مردانہ بھی نہیں ہوئی تھی اس کے کان میں آئی۔ "کافروں پر کوئی رحم نہ کرو" یہ خود کپتان کی آواز تھی جو فوج کی قیادت کر رہا تھا۔ انہوں نے عربوں کی طرف سے حملہ کا انتظار نہیں کیا بلکہ سیدھے ان پر ٹوٹ پڑے۔ دست بدست خونریز جنگ ہوئی۔ تلواروں کی جھنکار اور ضربوں کی آواز کے ساتھ ساتھ اللہ اکبر اور مقدس مریم کے نعرے بھی جنگ کے شور میں شامل ہوتے رہے۔ چھتوں پر کھڑے ہوئے عرب تیر انداز اس ڈر سے حملہ نہ کر سکیں گے کہیں اپنے ہی لوگ نشانہ نہ بنیں۔ عرب تعداد میں بہت کم تھے اور جلد ہی اپنے خون میں نہا گئے۔

عمر کے گھوڑے کا پاؤں زخمی ہو گیا اور وہ بیہوش ہو کر گر گیا۔ سپاہی گھسیٹ کر اسے کپتان کے پاس لے گئے۔ دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں تو کپتان کی آنکھیں نفرت سے دہک رہی تھیں عمر نے خاموشی سے اپنے فاتح کو دیکھا۔

"تم اپنی آنکھوں سے ہمارے خدا کے قہر کو دیکھ رہے ہو۔" کپتان نے کہا۔

"ہاں۔" عمر نے جواب دیا۔ "ہمارے گاؤں کے مردوں کو ختم کر دیا گیا۔ عورتوں اور بچوں کو تہہ تیغ کر دیا گیا۔ ہماری مسجدیں جلا دی گئیں اور ہمارے کھیت تباہ کر دیئے گئے۔ تم جیسے لوگوں کو دیکھ کر مجھے ان مچھلیوں کا خیال آتا ہے جو ایک دوسرے کو کھا جاتی ہیں۔ یہ زمین پھر کبھی پھل پھول نہیں سکے گی۔ تمہاری آنکھوں میں جو خون نظر آ رہا ہے وہ ایک

دن تمہارے لئے ہی تباہی لائے گا۔ لا الہٰ اللہ محمدؐ رسول اللہ"

کپتان نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے زیر حراست شخص کے دائیں بائیں سپاہیوں پر نظر کی اور ایک اشارہ کیا۔ انہیں اور کسی مزید حکم کی ضرورت نہیں تھی۔ عمر بن عبداللہ کو دو زانو جھکا دیا گیا۔ پھر تیر چلے۔ دو تیر عمر کو قتل کے ارادے سے بڑھنے والے سپاہیوں کو لگے اور وہ گر گئے۔ کپتان چلایا۔ "اس محل کو آگ لگا دو" اس نے پھر دوسرے سپاہیوں کو آگے بڑھنے کا حکم دیا لیکن اب عمر نے ایک گرے ہوئے سپاہی کی تلوار اٹھالی تھی اور اس نے پھر لڑنا شروع کر دیا تھا۔

چھ آدمیوں نے حملہ کر کے بنو حزیل کے سربراہ پر قابو پایا۔ اس مرتبہ فوراً ہی اس کا سر قلم کر دیا گیا اور اس کا سر نیزہ پر بلند کر دیا گیا۔ اگلے احاطہ میں پھرا کر اس کو بیرونی احاطہ میں لے جایا گیا۔ چیخ و پکار کی آوازیں بلند ہوئیں اور تلواریں پھر ٹکرانے لگیں۔

ایک تیر انداز نے دوڑ کر زبیدہ کو عمر کے مارے جانے کی اطلاع دی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اس نے تلوار اٹھائی اور بیرونی احاطہ میں لڑنے والوں میں شامل ہو گئی۔

"آؤ" اس نے دوسری عورتوں کو پکارا۔ "ہم زندہ ان کے ہاتھ نہیں آئیں گے"

عورتوں نے جس بہادری کا ثبوت دیا عیسائی اس پر حیران رہ گئے۔ یہ حرم کی معمولی اور ناز پروردہ عورتیں نہیں تھیں جن کے متعلق انہوں نے بڑی افسانوی داستانیں سنی ہوئی تھیں۔ ایک بار پھر بنو حزیل کی عورتوں نے اس حیرت کا فائدہ اٹھایا۔ انہوں نے کپتان کی فوج کے کم از کم سو سپاہیوں کو قتل کیا لیکن آخر کار وہ بھی کام آ گئیں لیکن لڑتے ہوئے۔

دو گھنٹے کی سخت لڑائی کے بعد قتل و غارت کا بازار ٹھنڈا ہو گیا۔ تمام مزاحمت کرنے والے مارے گئے۔ جلاہے اور خطیب' پکے مومن اور کذاب' مرد اور عورتیں سب ایک ساتھ لڑے اور سب نے ایک دوسرے کے سامنے جان دی۔ بڑھئی یو آن' ابن حد اور بوڑھا مشکک زندیق' ان سب نے عمر کے مشورہ پر گودام میں پناہ لینے سے انکار کر دیا تھا۔ انہوں نے بھی زندگی میں پہلی مرتبہ تلوار اٹھائی تھی اور مارے گئے تھے۔

کپتان کو اتنے جانی نقصان پر بہت غصہ تھا۔ اس نے حکم دیا کہ گھر کو لوٹ لیا جائے اور اسے آگ لگا دی جائے۔ ایک گھنٹہ تک اور یہ لوگ جن کے منہ کو خون لگا ہوا تھا آگ اور خون کا بھیانک کھیل کھیلتے رہے۔ حماموں میں چھپے ہوئے بچوں کو باہر نکال کر مارا گیا۔ پھر انہوں نے اس قدیم حویلی کو آگ لگائی اور اپنے کیمپ میں لوٹ گئے۔

اپنے دو مددگاروں کے ساتھ گھومتا پھرتا ہوا کپتان اب گھوڑے سے اترا اور باغ میں بیٹھ گیا۔ اور گھر کو جلتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس نے جوتے اتارے اور باغ کے درمیان بہتی ہوئی نہر میں پاؤں ڈال دیئے۔

"وہ پانی کے کتنے دلدادہ تھے؟"

زمین کے نیچے یزید زیادہ انتظار نہ کر سکا۔ بہت دیر سے ہر طرف خاموشی تھی۔ بونے نے اسے روکنے کی بہت کوشش کی لیکن لڑکا بضد تھا۔

"تم یہاں ٹھہرو بونے" اس نے بوڑھے سے سرگوشی میں کہا۔ "میں جا کر دیکھتا ہوں کہ کیا صورت ہے اور پھر لوٹ آؤں گا۔ میرے ساتھ مت آؤ۔ ہم میں سے صرف ایک کو جانا چاہئے۔ اگر تم نے میری بات نہیں مانی تو میں چیخ اٹھوں گا۔"

بونا کسی طرح راضی نہ ہوتا تھا۔ یزید نے غنودگی کا بہانہ کیا اور یہ تاثر دیا کہ وہ بیٹھنے لگا ہے۔ جیسے ہی اس کے بازو پر گرفت ڈھیلی پڑی وہ ہاتھ چھڑا کر بھاگا۔ پیشتر اس کے کہ بونا اسے روک سکے وہ سیڑھیاں چڑھ گیا اور اس نے زینہ کا پتھر ہٹایا۔ جب وہ کھڑا ہوا تو سامنے جلتا ہوا گھر تھا اور لاشیں بکھری پڑی تھیں۔ وہ اس منظر کی تاب نہ لا سکا۔ اب اس کا ڈر نکل چکا تھا اور وہ اپنے والدین کو آوازیں دیتا ہوا احاطہ کی طرف دوڑنے لگا۔

کپتان اس آواز سے چونک اٹھا۔ باغ میں سے بھاگتے ہوئے دو سپاہیوں نے اسے پکڑ لیا۔ یزید نے بہت ہاتھ پاؤں چلائے۔

"مجھے چھوڑ دو۔ میں اپنے والد اور والدہ کے پاس جانا چاہتا ہوں"

"اس کے ساتھ جاؤ۔" کپتان نے اپنے آدمیوں سے کہا۔ "اسے بھی دیکھنے دو کہ ہمارا چرچ کتنا طاقتور ہے۔"

جب اس نے اپنے باپ کا سر نیزے پر دیکھا تو لڑکا گھٹنوں پر بیٹھ گیا اور رونے لگا۔ وہ آگے نہیں جا سکے اس لئے کہ شعلے بھڑک رہے تھے اور جلتی ہوئی لاشوں کی بو سخت تھی۔ یزید چاہتا تھا کہ شعلوں میں کود پڑے اور اپنی ماں کے پاس پہنچ جائے لیکن وہ اسے گھسیٹ کر کپتان کے پاس لے گئے جو اب گھوڑے پر سوار ہو رہا تھا۔

"دیکھا لڑکے" اس نے اس کی ہنسی اڑاتے ہوئے کہا۔ اب تم نے دیکھا کہ ہم کافروں سے کیا سلوک کرتے ہیں!"

یزید نے اس کی طرف دیکھا۔ غم کی وجہ سے وہ پتھر ہو گیا تھا۔

"تمہاری زبان نہیں ہے؟ لڑکے؟"

"کاش میرے پاس خنجر ہوتا" یزید کی آواز جیسے کہیں دور سے آ رہی تھی۔ "میں اسے تمہارے دل میں اتار دیتا۔ کاش آج سے صدیوں پہلے ہم نے تمہارے ساتھ یہی سلوک کیا ہوتا۔"

کپتان نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی باتوں سے متاثر ہوا۔ اس نے مسکرا کر یزید کو دیکھا اور پھر اپنے لوگوں پر نظر کی۔ اس کے ردعمل سے انہیں تسلی ہوئی۔ لڑکے کو قتل کرنے کا ان میں حوصلہ نہیں تھا۔

"تم نے دیکھا" اس نے کہا۔ "کیا میں نے آج ہی نہیں کہا تھا کہ بچ جانے والوں کی نفرت ایسا زہر ہو گی جو ہمیں تباہ کر دے گی۔"

یزید کچھ نہیں سن رہا تھا۔ اس کے باپ کا سر اس سے کہہ رہا تھا۔

"یاد رکھنا۔ بیٹے' ہم نے ہمیشہ اس بات پر فخر کیا ہے کہ ہم دشمن سے کس طرح پیش آتے ہیں۔ تمہارے پردادا ان نائٹس کو کھانے پر بلاتے تھے جو ان سے شکست کھا چکے ہوتے۔ وہ اپنے گھر ان کے ساتھ کھانا کھاتے۔ کبھی نہ بھولنا کہ ہم بھی اگر ان جیسے ہو گئے تو پھر ہم تباہی سے نہیں بچ سکیں گے۔"

"میں یاد رکھوں گا۔ ابو" یزید نے کہا۔

"تم نے کیا کہا۔ لڑکے؟" کپتان نے پوچھا۔

"کیا آپ آج ہمارے گھر مہمان رہیں گے؟

کپتان نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا جسے وہ اچھی طرح سمجھتے تھے۔ عام حالات میں وہ فوری حکم بجا لاتے تھے۔ لیکن ظاہر تھا کہ لڑکا اپنے حواس کھو چکا تھا۔ یہ تو بہت ہی سفاکانہ قتل ہو گا۔ وہ جھجکے۔ کپتان کو غصہ آیا۔ اس نے تلوار نکالی اور لڑکے کے سینہ میں گھونپ دی۔ یزید سینہ پر ہاتھ رکھے زمین پر گر پڑا۔ اسی وقت اس کی موت واقع ہو گئی۔ جس وقت وہ خون اگل رہا تھا اس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ تھی۔

کپتان گھوڑے پر سوار ہوا۔ اپنے دو نائبوں کی طرف دیکھے بغیر وہ دروازے سے باہر گھوڑے پر سوار نکل گیا۔

رات آ گئی۔ چند گھنٹے پہلے جو آسمان دہکتا ہوا جہنم لگتا تھا اب گہرا نیلا ہو گیا تھا۔ پہلے دو ستارے اور پھر ستاروں کا ایک جھرمٹ آسمان پر ابھرنے لگا۔ آگ بجھ چکی تھی۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔ ایسا ہی اندھیرا جو یہاں کسی ذی روح کے آنے سے پہلے ہزاروں برس قبل رہا ہو گا۔

بونا، جس کی آنکھیں خوف سے پتھرا گئی تھیں، یزید کی لاش کو اپنے ہاتھوں میں لئے ہوئے بیٹھا تھا، اور اسے جھولے دے رہا تھا۔ مردہ بچہ کے چہرہ پر اس کے آنسو گر رہے تھے اور اس کے خون میں جذب ہو رہے تھے۔

"یہ کیسے ہوا کہ صرف میں اکیلا ہی اس وقت زندہ ہوں؟"

وہ بار بار اس فقرہ کو دہراتا رہا، اسے معلوم نہیں کہ کب اور کس طرح وہ سو گیا اور کس وقت دوسری منحوس صبح نمودار ہوئی،

جب سے ابن باسط نے اسے بتایا تھا کہ کئی سو عیسائی سپاہی الحزیل کے باہر جمع ہیں زہیر نے اپنی گھوڑی کو تیز دوڑا کر اور بغیر کسی وقفہ کے بھگا کر تقریباً مار ہی ڈالا تھا حتیٰ کہ وہ گاؤں کے راستہ تک پہنچ گیا۔ اس کے چہرہ پر گہری شکنیں ابھر آئی تھیں جو آنکھوں سے ہونٹوں تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اس کی روشن سیاہ آنکھیں بے رنگ اور مردہ سی ہو گئی تھیں۔ دو مہینوں کی جنگ نے اسے قبل از وقت بوڑھا کر دیا تھا۔ جب زہیر چھوٹے سے درے میں داخل ہوا تھا، رات پڑ چکی تھی۔ آسمان صاف تھا۔ اس کو اس وقت اپنے ساتھیوں کا نہیں بلکہ اپنے گھر والوں کا خیال آ رہا تھا۔ وہ اپنے گھر کے متعلق سوچ رہا تھا۔

"السلام علیکم۔ زہیر بن عمر" ایک آواز آئی،

زہیر نے لگام کھینچی۔ یہ ابو زید کا ایک خفیہ قاصد تھا۔

"میں بہت جلدی میں ہوں بھائی"

"الحزیل پہنچنے سے پہلے میں تمہیں خبردار کرنا چاہتا تھا۔ وہاں کچھ بھی نہیں بچا ہے۔ زہیر بن عمر، عیسائی شراب میں مست ہیں اور غرناطہ میں ہر ایک کو بتاتے پھر رہے ہیں۔ وہ آج ہوش میں نہیں ہیں"

"وعلیکم السلام۔ دوست" زہیر نے خلاء میں گھورتے ہوئے کہا۔ "میں جاؤں گا اور خود دیکھوں گا" پندرہ منٹ کے اندر اندر وہ زندیق کے غار پر پہنچ گیا۔ دل کو تسلیاں دیتا ہوا، دعائیں کرتا ہوا کہ شاید بوڑھا اس کے خدشات کو دور کر دے۔ ساری جگہ ویران تھی۔ زندیق کے کاغذات اور اس کے مسودات سلیقہ سے بنڈلوں میں بندھے ہوئے رکھے تھے جیسے کہ بوڑھا وہاں سے جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ زہیر نے چند منٹ آرام کیا اور گھوڑے کو پانی پلایا۔ پھر وہ سوار ہو گیا۔ ایک چٹان سے گھومتے ہوئے اس نے گھوڑے کی لگام کھینچی اور دور مانوس جگہ پر نظر ڈالی۔ صبح کی پہلی روشنی جھلسی ہوئی چیزوں پر پڑ رہی تھی وہ یوں گھر کی طرف چلا جیسے اسے کسی چیز کا ہوش نہیں رہا تھا۔ بدترین خدشات صحیح ثابت

ہوئے۔ جب اس نے کچھ فاصلے سے اس قتل و غارت کے آثار کو دیکھا تو پہلے اسے انتقام کا خیال آیا۔ "میں انہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایک ایک کو قتل کروں گا۔ میں اپنے بھائی کے سر کی قسم کھا کر اللہ کے سامنے عہد کرتا ہوں کہ میں اس ظلم کا بدلہ لوں گا۔"

جب وہ احاطہ میں داخل ہوا تو اس نے اپنے باپ کا سر زمین میں گڑے ہوئے نیزے پر چڑھا دیکھا۔ زہیر گھوڑے سے کودا اور اس نے نیزے کو اٹھایا۔ بڑی محبت سے اس نے باپ کے سر کو دیکھا۔ وہ ندی پر گیا اور باپ کے چہرے سے اور بالوں سے خون دھویا۔ پھر وہ قبرستان میں گیا اور اپنے خالی ہاتھوں سے زمین کھودنے لگا۔ وہ اتنا بدحواس تھا کہ پاس ہی پڑا ہوا بیلچہ بھی اسے نظر نہیں آیا۔ جب وہ اپنے باپ کو دفن کر کے احاطہ میں واپس آیا تو اب اس نے بونے کو دیکھا جو یزید کو اپنے بازوؤں میں لئے ہوئے جیسے آہستہ آہستہ اسے لوری دے رہا تھا۔ ایک لمحہ کے لئے زہیر کا دل اس کے گلے میں اٹک گیا۔ کیا یزید زندہ ہے؟ پھر اس نے اپنے بھائی کے مردہ چہرے کو دیکھا جس پر خون جما ہوا تھا۔

"بونے۔ بونے۔ تم زندہ ہو۔ اٹھو بھائی"

گھبرا کر بونے نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کے ہاتھ بھی یزید کی لاش کی طرح پتھر کے ہو گئے تھے۔ زہیر کو دیکھ کر بونا بین کرنے لگا۔ زہیر نے باورچی کو سینہ سے لگایا اور آہستہ سے یزید کی لاش اس سے لے لی۔ اس نے اپنے بھائی کے گالوں کو بوسے دیئے "میں نے ابو کا سر دفن کر دیا ہے۔ اب ہم یزید کو غسل دے کر اسے دفن کرتے ہیں۔"

انہوں نے آہستہ آہستہ میت سے کپڑے اتارے اور اسے نہر میں غسل دیا۔ پھر وہ یزید کو اٹھا کر خاندانی قبرستان میں لے گئے۔ جب وہ اسے دفن کر چکے اور قبر کو بھر چکے تو زہیر جو اب تک بڑے ضبط سے کام لے رہا تھا ایک دم سے پھوٹ پڑا اور زور زور سے رونے لگا۔ دکھ کے اس طوفان میں آنسوؤں کا تار بندھ گیا جیسے یزید کی قبر پر مینہ برس رہا ہو۔

دونوں ایک دوسرے سے گلے ملے اور قبروں کے قریب گھاس کے ایک ٹیلے پر بیٹھ گئے۔

"میں سب کچھ جاننا چاہتا ہوں۔ بونے۔ ایک ایک بات۔ تمہیں جو کچھ بھی یاد ہو مجھے بتاؤ"

"کاش میں مر جاتا اور یزید زندہ رہتا۔ میں کیوں اب تک زندہ ہوں؟"

"بہتر ہے کہ کوئی تو زندہ بچ گیا ہے۔ بتاؤ کہ ہوا کیا"

بونے نے تفصیلات بتائی شروع کیں اور جب اس نے بتایا کہ کس طرح یزید اس سے ہاتھ چھڑا کر بھاگ گیا تو وہ بین کرنے لگا اور اپنے بال نوچنے لگا۔ زبیر نے اسے تسلی دی۔

"میں سمجھتا ہوں۔ سمجھتا ہوں۔ لیکن اب سب کچھ ختم ہو گیا ہے۔"

"نہیں انتہا نہیں ہوئی۔ اس نے ڈھکنا کھلا چھوڑ دیا تھا۔ میں نے انہیں اس کو پکڑتے ہوئے اور اس سے سوالات کرتے ہوئے سنا۔ اگر تم نے کپتان کو دیئے ہوئے اس کے جواب سنے ہوتے تو تمہیں اس پر کتنا فخر ہوتا۔ اس شیطان کو جو ہم سب کو قتل کرنے پر تلا ہوا تھا۔"

جب بونا تفصیلات بیان کر چکا تو زبیر بہت دیر تک سر کو گھٹنوں میں چھپائے بیٹھا رہا۔

"یہاں سب کچھ ختم ہو گیا ہے۔ انہوں نے ہمارے چاند کو ہمیشہ کے لئے گہنا دیا ہے۔ ہمیں یہاں سے چلنا چاہئے۔ یہ جگہ محفوظ نہیں ہے۔

بونے نے انکار میں سر ہلایا۔

"میں اس گاؤں میں پیدا ہوا تھا۔ میرا بیٹا یہیں آپ کے گھر کی حفاظت کرتے ہوئے مارا گیا۔ میں بھی یہیں مرنا چاہتا ہوں۔ میری زندگی اب زیادہ نہیں۔ تم ابھی جوان ہو۔ لیکن مجھ میں اب جینے کی کوئی خواہش نہیں۔ مجھے اکیلا چھوڑ دو اور آرام سے مرنے دو۔"

"بونے۔ میں بھی یہیں پیدا ہوا تھا۔ یہاں پہلے ہی بہت موتیں ہو چکی ہیں۔ اب ان کی تعداد بڑھانے سے کیا فائدہ؟ پھر مجھے ایک کام بھی کرنا ہے جو صرف تم سرانجام دے سکتے ہو۔ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔"

"میں جب تک یہاں ہوں آپ کی خدمت کے لئے حاضر ہوں"

"میں تمہیں ساحل سمندر تک لے جاؤں گا اور تمہیں تانجا جانے والے جہاز پر سوار کرا دوں گا۔ وہاں سے تم فیض جانا اور ابن داؤد اور میری بہن کو تلاش کرنا۔ میں اس کے لئے ایک خط لکھ دوں گا۔ اور پھر وہ جو کچھ جاننا چاہے تم اسے بتا دینا۔"

اس پر بونا پھر رونے لگا۔

"مجھ پر رحم کرو۔ زبیر بن عمرؒ میں بی بی ہند کا سامنا کیسے کر سکوں گا؟ میں کس منہ سے کہوں گا کہ میں نے یزید کو موت کے منہ میں جانے دیا۔ مجھے اس کے پاس بھیجنا مجھ پر ظلم ہو گا۔ مجھے اشبیلیہ میں بی بی کلثوم کے پاس جانے دو۔ تم فیض جاؤ اور وہیں رہو۔ وہ تمہیں اس سرزمین پر نہیں رہنے دیں گے"

"میں اپنی بہن ہند کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ اس سے بھی زیادہ جتنا وہ خود اپنے آپ

کو جانتی ہے۔ وہ صرف تم سے ہی سب کچھ کہنا چاہے گی۔ بونے' وہ اپنے پاس اس گھر کے کسی آدمی کی ضرورت محسوس کرے گی ورنہ وہ دکھ سے پاگل ہو جائے گی۔ کیا تم بنو حزیل کی یہ آخری خدمت نہیں کرو گے؟"

بونے کو اندازہ ہو گیا کہ اس کی نہیں چلے گی۔

"ابو نے بتایا تھا کہ تہہ خانوں میں ہمیشہ سونے سے بھرے ہوئے تھیلے موجود رہتے ہیں۔ بہتر ہے ہم انہیں لے چلیں۔ مجھے لڑائیاں لڑنے کے لئے ان کی ضرورت ہو گی اور ایک تم اپنے ساتھ لے جاؤ تاکہ فیض میں تمہارے کام آ سکیں۔"

جب سونے سے بھرے ہوئے تھیلے مل گئے تو زبیر نے اپنے گھوڑے کی زین کسی اور بونے کے لئے ایک اور تھیلا ڈھونڈا۔ اس نے بونے کے چھوٹے قد کے مطابق زین کو ٹھیک کیا۔ جب وہ گھر سے دور نکل آئے اور گاؤں پیچھے رہ گیا تو زبیر نے خاموشی کو توڑا۔

"ایک دفعہ رک کر پھر اس پر نظر کر لیں بونے' اس کی اصلی حالت کو ذہن میں لاؤ۔ یاد کرو۔"

باورچی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ الجزیرہ کے ساحلی شہر تک انہوں نے کوئی بات نہیں کی۔ انہیں کشتی مل گئی جو اگلی صبح روانہ ہونے والی تھی اور اس میں بونے کے لئے نشست مخصوص کرائی گئی۔ کچھ تلاش کے بعد انہیں ایک مناسب سرائے مل گئی جس میں ایک کمرہ اور دو بستر انہیں حاصل ہو گئے۔ جب وہ سونے لگے تو الحزیل سے روانہ ہونے کے بعد پہلی مرتبہ بونے نے زبان کھولی۔

"میں اس آگ اور اس آہ و بکا اور شور و غل کو کبھی نہیں بھول سکوں گا۔ نہ مجھے یزید کے چہرے کا وہ تاثر بھولے گا جو ان وحشیوں کے اسے قتل کرنے کے بعد اس کے چہرے پر ظاہر ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ پچھلی باتیں میرے ذہن میں نہیں رہی ہیں۔"

"مجھے معلوم ہے۔ لیکن میں صرف اسی ماضی کو یاد رکھنا چاہتا ہوں۔"

زبیر ہند کے لئے خط لکھنے میں مصروف ہو گیا۔ اس نے ڈون الانسو سے مقابلہ اور اس کے المناک انجام کا ذکر کیا۔ اس نے گھر اور گاؤں کے جلنے کا حال لکھا اور التجا کی کہ وہ کبھی واپس نہ آئے۔

"تم کتنی خوش قسمت ہو کہ تمہیں ایک ایسا شخص مل گیا ہے جو ہر طرح سے تمہارے لائق ہے اور دور اندیش ہے۔ ابن داؤد کو بہت پہلے معلوم ہو گیا تھا کہ ہم اپنی جنگ ہار چکے ہیں۔ وقت ہمارے ساتھ نہیں ہے۔ یہ جو بوڑھا تمہارے پاس یہ خط لا رہا ہے

اسے اپنے زندہ بچ رہنے کا بہت ملال ہے۔ اس کا خیال رکھنا۔

"پچھلے کچھ دنوں سے تم مجھے بہت یاد آ رہی ہو۔ اور اب میں سوچتا ہوں کہ جب ہم گھر پر اکٹھے رہتے تو کاش ہم نے بہت باتیں کی ہوتیں۔ میں تم سے اعتراف کرنا چاہتا ہوں کہ میرا ایک دل چاہتا تھا کہ اس بوڑھے کے ساتھ میں بھی فیض آجاؤں۔ تم سے اور ابن داؤد سے ملوں۔ تمہیں پھلتے پھولتے اور صاحب اولاد ہوتے دیکھوں اور تمہارے بچوں کا ماموں بنوں۔ اس تباہی اور بربادی سے دور جو ہماری سرزمین پر نازل ہوئی ہے لیکن اب میرا دل کہتا ہے کہ میں اپنے ساتھیوں کو ان خطرات میں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔ وہ مجھ پر انحصار کرتے ہیں۔ امی اور تم یہی سمجھتی تھیں کہ میں مضبوط ارادے کا مالک نہیں ہوں۔ بہت جلدی ہر بات سے متاثر ہو جاتا ہوں اور میرے اندر عزم کی کمی ہے۔ شاید تمہارا اندازہ صحیح تھا لیکن میرا خیال ہے کہ میں اب بہت بدل گیا ہوں۔ چونکہ دوسرے مجھ پر انحصار کرتے ہیں اس لئے مجھے بھی ایک انداز اختیار کرنا پڑتا ہے اور اب یہی میری اصلی شخصیت ہے کبھی کبھی تو مجھے خود اپنی اصلیت پر شک ہونے لگتا ہے۔

میں البجاراز واپس چلا جاؤں گا جہاں درجنوں گاؤں ہمارے قبضہ میں ہیں اور جہاں ہم اسی طرح رہتے ہیں جیسے شکست سے پہلے رہتے تھے۔ ابوزید المعری' ایک معمر شخص جسے تم یقیناً پسند کرو گی' یقین کے ساتھ کہتا ہے کہ وہ ہمیں زیادہ دیر یہاں نہیں رہنے دیں گے۔ اس کا خیال ہے کہ ان کا مقصد یہ نہیں کہ ہم مذہب بدل لیں۔ انہیں ہماری دولت چاہئے اور وہ انہیں تب ہی مل سکتی ہے جب وہ ہمارا مکمل خاتمہ کر دیں۔ اگر اس کا اندازہ صحیح ہے تو ہم کچھ بھی کریں ہماری تباہی یقینی ہے۔ لیکن اس وقت تک ہم جنگ جاری رکھیں گے۔ میں زندیق کے تمام کاغذات تمہیں بھیج رہا ہوں۔ ان کو حفاظت سے رکھنا اور مجھے بتانا کہ ابن داؤد کا ان کے متعلق کیا خیال ہے۔

اگر تم مجھ سے رابطہ کرنا چاہو' اور میں تمہیں تاکید کرتا ہوں کہ جب تمہارا پہلا بچہ پیدا ہو تو مجھے ضرور اطلاع دینا' بہترین ذریعہ یہ ہے کہ غرناطہ میں چچا کو اطلاع دے دینا۔ ایک اور بات۔ ہند! میں جانتا ہوں کہ اب سے لے کر اپنی موت تک میں اپنے مرحوم بھائی اور والدین کے لئے ہر وقت روتا رہوں گا۔ میری کوئی کوشش اس دکھ کو نہیں چھپا سکتی۔

تمہارا بھائی

زہیر

بونا ایک دو گھنٹے سے زیادہ نہیں سو سکا۔ جب صبح ہوئی تو وہ اٹھا اور وضو کے لئے باہر

چلا گیا۔ جب وہ لوٹا تو زہیر بستر میں بیٹھا ہوا تھا اور کھڑکی سے آتی ہوئی صبح کی روشنی کو دیکھ رہا تھا۔

"السلام علیکم۔ دیرینہ رفیق"

بونے نے دہشت سے اس کی طرف دیکھا۔ رات ہی رات میں زہیر کے بال سفید ہو گئے تھے۔ کوئی کچھ نہیں بولا۔ زہیر نے دیکھا کہ یزید کی شطرنج کے مہرے اس کے سامان میں رکھے ہوئے ہیں۔

"وہ بی بی زبیدہ کو ڈھونڈنے کے لئے اوپر جاتے ہوئے انہیں میرے پاس چھوڑ گیا تھا۔" بونا رونے لگا۔

"میرا خیال ہے کہ بی بی ہند انہیں اپنے بچوں کے لئے رکھ لیں گی۔"

زہیر آنسوؤں کو پیتے ہوئے مسکرایا۔

ایک گھنٹہ بعد بونا تجارتی جہاز پر سوار ہو گیا۔ زہیر ساحل سے ہاتھ ہلا کر اسے الوداع کہتا رہا

"خدا آپ کی حفاظت کرے زہیر الفحل" بونے نے اپنی بوڑھی آواز میں چلا کر کہا۔

"وہ حفاظت نہیں کرتا" زہیر نے خود سے کہا۔

حرف آخر

بیس سال بعد الحزبل کا فاتح جواب اپنے اقتدار کے عروج پر تھا اور سپین کی کیتھولک دنیا کا سب سے تجربہ کار عسکری قائد مانا جاتا تھا' اپنے وطن سے ہزاروں میل دور اپنے جنگی جہاز سے ایک جزیرہ پر اترا' اس نے اپنا پرانا خود' جسے وہ کبھی تبدیل نہیں کرتا تھا سر پر باندھا۔ حالانکہ اسے چاندی کے دو خود تحفہ کے طور پر پیش کئے گئے تھے۔ اب اس کے چہرہ پر داڑھی بھی تھی جس کے سرخ رنگ کا بہت مذاق اڑتا تھا' اس کے دو معاون' جواب ترقی کر کے خود کپتان بن گئے تھے' اس کے ساتھ اس مہم میں شریک تھے۔

یہ جماعت کئی ہفتے دلدل اور گھنے جنگلوں میں سفر کرتی رہی۔ جب وہ اپنی منزل پر پہنچے تو مقامی حاکم کے سفیروں نے ان کا استقبال کیا۔ انہوں نے عجیب و غریب رنگوں کے لباس پہنے ہوئے تھے۔ تحائف کا تبادلہ کیا گیا۔ پھر اسے شاہی محل تک لے جایا گیا۔

یہ شہر پانی پر تعمیر کیا گیا تھا' کپتان نے کبھی خواب میں بھی ایسا کوئی شہر نہیں دیکھا تھا۔ لوگ کشتیوں کے ذریعہ شہر میں ادھر ادھر جاتے تھے۔

"تم جانتے ہو کہ اس عظیم الشان جگہ کو کیا کہتے ہیں؟" اس نے اپنے معاون کا امتحان لینے کے لئے پوچھا۔ ساتھ ہی کشتی محل پر جا کر رک گئی۔

"ٹینوخ تتلان اس شہر کا نام ہے اور اس کا بادشاہ موک تے زوما ہے"

"اس کے بنانے میں بڑی دولت صرف ہوئی ہے۔" کپتان نے کہا۔

"یہ بہت امیر قوم ہے۔ کپتان کورتیز" جواب ملا۔

کپتان مسکرایا۔